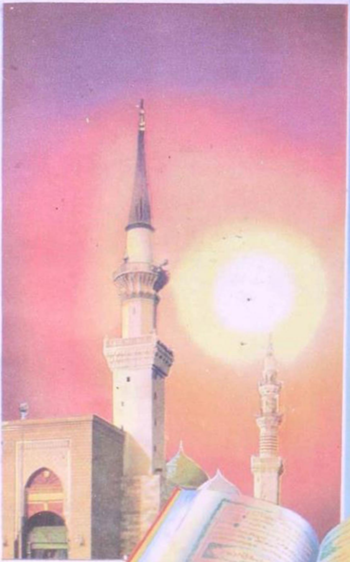
جلد اول

تاریخی حقائق





حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی

مفتی دارالعلوم دیوبند

باہتمام

مولانا صدرالحسن قاسمی

امام جامع مسجد جموں توی

ناشر

قاسمی کتب خانہ جامع مسجد جموں توی کشمیر ۱۸۰۰۰۱

تاریخی حقائق

جلد اول

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی
مفتی دارالعلوم دیوبند

مرتب

مولانا صدر الحسن قاسمی
امام جامع مسجد جموں توی

ناشر

قاسمی کتب خانہ جامع مسجد جموں توی کشمیر ۱۸۰۰۰۱

نام کتاب ــــــــــ تاریخی حقائق
مقالات ــــــــــ حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی
مرتب ــــــــــ مولانا صدر الحسن قاسمی
طبع اول ــــــــــ شوال ۱۴۱۶ھ مطابق مارچ ۱۹۹۶ء
ضخامت ــــــــــ ۴۲۴ صفحات
تعداد اشاعت ــــــــــ ایک ہزار
قیمت ــــــــــ 200/=
ناشر ــــــــــ قاسمی کتب خانہ جامع مسجد جموں توی کشمیر
مطبوعہ ــــــــــ

ملنے کا پتہ

قاسمی کتب خانہ جامع مسجد جموں توی کشمیر

فہرست عنوانات

حضرت شیخ الاسلام کی زندگی کے بعض گوشے ۳۲۲

عرض مرتب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ ایک حقیقت ہے کہ سلف صالحین اور اکابر امت کی صاف ستھری زندگی اور ان کے زندہ کارنامے ہمارے لئے اس دور میں مشعل راہ ہیں، اور ان کا اسوہ ہماری سیرت کی تعمیر میں بہت ہی کارآمد ہے، اس لئے کہ ان کا دور حیات عہد نبوی سے نسبتاً نزدیک رہا ہے۔ اور ان کا اخلاص ہم سے بڑھا ہوا تھا۔

آج سے پچاس سال پہلے حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مدظلہ مفتی دارالعلوم نے "تاریخی حقائق" کے عنوان سے خلفائے اسلام، اور اولیاء کرام، علماء و مشائخ اور سلاطین امت کی زندگی کے بعض گوشوں پر روشنی ڈالنے کا سلسلہ شروع کیا تھا، جس کا ایک حصہ رسالہ برہان دہلی اور رسالہ دارالعلوم دیوبند اور دوسرے علمی رسالوں میں شائع بھی ہوا تھا، جسے اس دور کے اہل علم نے پسند کیا تھا، اور پڑھنے والوں نے پڑھ کر اپنی سیرت سازی کی تھی۔

ہمارے اس زمانہ کی نئی نسل ان تاریخی حقائق سے قطعاً ناآشنا ہے، اور اس مادی دور نے ان کو دینی اعمال و اخلاق سے دور کر دیا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ان شائع شدہ اور غیر شائع شدہ تاریخی حقائق کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ تاکہ آج کی نئی نسل اور آئندہ آنے والی نسل کے لئے اسلاف و اکابر کے یہ اسوے روشنی کا کام دیں، اور وہ اس کو پڑھ کر اپنی زندگی کے نوک و پلک کو درست کریں، اور اپنے عقائد و اخلاق کو کتاب و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی کریں۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہ سے میں نے اس کی اجازت حاصل کی اور کام شروع کر دیا۔ الحمد للہ یہ کام بحسن و خوبی انجام پا گیا۔ اور وہ مرتب شکل میں ہمارے سامنے

آگیا ہے۔

میں نے ان تاریخی حقائق میں صرف عنوانات کا اضافہ کیا ہے تاکہ پڑھنے والے ذوق و شوق کے ساتھ مطالعہ کریں۔ حضرت مفتی صاحب نے ازراہ کرم ان تمام حصوں پر نظرثانی بھی فرمائی ہے اور ضروری رد و بدل اور اضافہ سے بھی گریز نہیں کیا ہے جس سے یہ حصہ اب بالکل نئی چیز بن گیا ہے، ساتھ ہی دلچسپ و دلپذیر بھی ہو گیا ہے، انشاء اللہ جب آپ مطالعہ شروع کریں گے تو پھر ہاتھ سے چھوڑنے کو جی نہیں چاہے گا، پڑھتے ہی چلے جائیں گے، اور آپ کے دل و دماغ میں روشنی پھیلتی چلی جائے گی۔ اور آپ کی سیرت سازی میں یہ کتاب معاون ثابت ہوگی۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہ کے تعارف کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک پرانے مصنف ہیں، اور آپ کی کتابیں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں، آپ کی بعض کتابوں کا انگریزی ترجمہ بھی آچکا ہے جو دوسرے ممالک میں کافی مقبول ہے۔

مختصر یہ کہ آپ چالیس سال سے دار العلوم دیوبند جیسے مرکزی ادارہ میں علمی، دینی اور تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں، اور اسی کے ساتھ تصنیف و تالیف کی خدمت میں بھی پورے انہماک سے مشغول رہے، دنیا کے دوسرے کاموں سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رہا، آپ کے قلم سے فتاوٰی دار العلوم دیوبند مدلل و مکمل کی بارہ ضخیم جلدیں، مشاہیر علمائے دیوبند، تعارف مخطوطات اور دوسری کتابیں بہت پہلے شائع ہو چکی ہیں۔

خود آپ کے لکھے ہوئے فتاوٰی کی ایک بڑی تعداد ہے، جو دار الافتاء کے رجسٹروں میں محفوظ ہے، اور کوئی شبہ نہیں یہ فتاوٰی بھی بہت قیمتی ہوں گے، دیر سویر ان کی ترتیب و اشاعت بھی ضروری ہے، اس کے علاوہ مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے، جو بکھرا ہوا ہے، ہر دور میں آپ کو اپنے اساتذہ و اکابر کا اعتماد حاصل رہا، جیسے محدث جلیل حضرت مولانا اعظمیؒ، سید الملت حضرت العلامہ سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا گیلانیؒ، حضرت مولانا اکبر آبادیؒ، امیر شریعت حضرت مولانا رحمانیؒ اور دوسرے علماء و مشائخ۔

زیر نظر "تاریخی حقائق" آپ کے مقالات کی پہلی جلد ہے، جو آپ حضرات کی خدمت

میں پیش کی جا رہی ہے، دعا ہے رب قدیر میری اس خدمت کو قبول فرمائے اور ملک و ملت کے لئے نفع بخش بنائے، انشاء اللہ مقالات کی دوسری جلدیں بھی وقفہ وقفہ سے آتی رہیں گی۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

محتاج دعاء
صدر الحسن قاسمی
امام جامع مسجد جموں توی

خلفاء اسلام کی زندگی کے اہم گوشے

تاریخی حقائق

خلفائے اسلام

آج کل "اسلامی نظام امن و امان" کے عنوان سے ایک مضمون کی فکر میں ہوں، اس سلسلہ میں مختلف کتابوں کا مطالعہ جاری ہے "مسلمانوں کا نظم مملکت"، پڑھتے وقت کچھ واقعات ایسے سامنے آئے جو مجھے بہت پسند آئے، دل نے کہا یہ حقائق ناظرین کے سامنے بھی پیش کردیئے جائیں وما توفیقی الا باللہ۔ (ظفیر صدیقی)

صدیق اکبر کی درد بھری دعاء

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت اپنی جگہ کے لئے حضرت فاروق اعظمؓ کا نام نامی پیش فرمایا اور پھر عوام کے سامنے اس کو رکھ کر منظوری حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کو بلاکر نصیحتیں کیں ان تمام کاموں سے جب فارغ ہوچکے تو آپ نے ہاتھ اٹھایا اور اللہ رب العزت کی درگاہ میں التجا کی :۔

"خدایا! اس سے میری نیت امت کی فلاح وبہبود کی ہے، میں نے فتنہ سے ڈرکر انھیں حاکم مقرر کردیا ہے تو واقف ہے، میں نے انتہائی غور وخوض کے بعد اپنے خیال میں سب سے بہتر، سب سے طاقتور اور سب سے زیادہ رشد و ہدایت کے دلدادہ فرد کو ان کا خلیفہ منتخب کیا ہے، میں اب موت کی گھڑیاں گن رہا ہوں، امت کو تیرے

سپرد کرتا ہوں، وہ تیرے بندے ہیں، ان کی جان و آبرو تیرے اختیار میں ہے، ان کے حاکم فلاح وبہبودی کے کام کریں اور صراط مستقیم پر قائم رہیں، عمر کے وسیلے سے امت کو سربلند کر اور اس کی اصلاح فرما۔"

(نظم مملکت ۳۹۰، ۳۹۱)

پوری دعا کتنی موثر اور درد انگیز ہے؟ لفظ لفظ سے وفات پانے والے خلیفہ کا اخلاص اور قومی محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ اپنے رب سے ہمارے اسلاف کو کتنا گہرا قلبی تعلق اور شغف ہے اے کاش ہمارے اس زمانہ کے مسلمان اس اخلاص و درد کو اپنے اندر جذب کر لیتے، اور دنیا کے دوسرے انسان سوچتے کہ خلیفہ اور قوم کے سردار کے اخلاق و اعمال کتنے پاکیزہ ہونے چاہئیں۔

عمر فاروق کا بوقت مرض الموت بیان

حضرت عمرؓ جب زخمی ہوئے تو چند ممتاز صحابہ کبار حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ مناسب معلوم ہو تو کسی کو اپنا جانشیں متعین فرما دیجئے، یہ سن کر متاسفانہ لہجہ میں فرمانے لگے کسے جانشیں بناؤں؟ ابو عبیدہؓ زندہ ہوتے تو ان کو مقرر کر دیتا کہ رحمت عالم نے ان کو "امین الامۃ" فرمایا تھا، ابو حذیفہؓ کے غلام سالمؓ زندہ ہوتے تو انھیں اپنا جانشیں مقرر کر دیتا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ سالم خدا سے بے حد محبت کرنے والے ہیں، اپنا یہ افسوس ظاہر ہی کر رہے تھے کہ درمیان میں ایک شخص نے یہ کہہ کر دخل دیا کہ عبداللہ بن عمرؓ کو مقرر فرما دیجئے۔ اس مشورہ سے آپ کو بے حد تکلیف ہوئی اور فرمایا:-

"اس کا تو مجھے کبھی وہم تک نہیں ہوا ہے" (مسلمانوں کا نظم مملکت ص۱۳)

اس سے اندازہ لگائیے، ہمارے اسلاف کا باطن کتنا پاکیزہ تھا، اور یہ

کتنے دور اندیش تھے۔

معاویہ ثانی کا اعلان

یزید کی موت کے بعد اس کا بیٹا ثانی معاویہ جانشیں مقرر کیا گیا، مگر معاویہ ثانی نے چالیس دن بعد خلافت سے علیحدگی اختیار کرلی اور اس نے خلافت کے مسئلہ کو جمہور پر چھوڑ دیا، انھوں نے لوگوں کو مخاطب کرکے کہا:-

"انتخاب خلیفہ کا حق صرف تم لوگوں کو حاصل ہے جس کو مناسب سمجھو اپنا خلیفہ بنالو" (مسلمانوں کا نظم مملکت ص۳۱)

حق پژوہی کی مثال قائم کرگئے، اپنے خاندانی روایات کے خلاف حق کا یہ اعلان جتنا اہم ہے، وہ ہم سب کے لئے درس عبرت ہے، اس واقعہ میں جو سبق ہے اسے اپنانے کی اس زمانہ میں بڑی ضرورت ہے۔

بارِ خلافت اٹھانے کے بعد عمر بن عبدالعزیز کا پہلا خطبہ

مورخین حضرت عمر بن عبدالعزیز کو عدل و انصاف اور زہد و تقوی میں خلفائے راشدین کا ہم سر سمجھتے ہیں، انھوں نے خلیفہ ہونے کے بعد جو خطبہ دیا تھا، وہ سب کے پڑھنے کے لائق ہے، آپ نے فرمایا:-

"لوگو! قرآن کے بعد کوئی اور کتاب آسمان سے نہیں نازل ہوگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی مبعوث نہ ہوگا، میں مقنن نہیں ہوں، صرف قوانین کا نافذ کرنے والا ہوں، میں کسی نئی بات کو رواج نہیں دوں گا مگر اپنے بزرگوں کی تقلید کروں گا، میں تم میں سے کسی فرد سے بہتر نہیں ہوں ہاں میرے کندھوں پر بوجھ (بار خلافت) ضرور تم سب سے زیادہ ہے، یاد رکھو خدا کی نافرمانی میں بندے کی کوئی بھلائی نہیں ہے" (ایضاً ص۱۱۱)

ایک خلیفہ نے اپنی پالیسی کا کتنا جچا تلا پروگرام بنایا ہے، نہ اس میں اپنی بڑائی ہے نہ اپنے علم و تقویٰ کا اظہار ہے، بلکہ عجز و انکساری ہے اور خدا کی کتاب اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے قوانین کے نفاذ کا اعلان ہے

ستم رسیدوں کیلئے سفارش

خلیفہ متوکل جب سلطان سلیم کے تسلط کے بعد کسی حد تک نظم و نسق میں دخیل باقی رکھا گیا، تو لوگ خلیفہ متوکل کو سلطان سلیم تک رسائی کا ذریعہ بناتے، لکھا ہے :-

"حاجتمند سلطان سلیم تک رسائی کے لئے خلیفہ کو واسطہ بناتے اور سلطان عموماً اس کی سفارشیں رد نہ کرتا، ستم رسیدہ افراد اپنی مقصد براری کے لئے اس کثرت سے خلیفہ کے پاس آتے کہ اس کے محل میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہتی" (مسلمانوں کا نظم مملکت ص۲۰۰)

دیکھنا یہ ہے کہ ستم رسیدہ اور حاجت مندوں کی خلیفہ بغیر کسی حرص و غرض کے کیسی دل دہی کرتا تھا کہ لوگ اس کے یہاں ٹوٹے پڑتے تھے، اور جائز سفارش کرنے میں خلیفہ کبھی کوتاہی نہ کرتا تھا، بلکہ اسے غریبوں سے بے حد ہمدردی تھی۔

عہد عباسی کے ایک وزیر اعظم کی قوم و ملک سے محبت

۳۰۱ھ میں علی بن عیسیٰ نامی وزیر اعظم مقرر کیا گیا، کہا جاتا ہے عہد عباسیہ میں یہ وزیر زہد و تقویٰ اور پاکیزہ صفات میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے متعلق بیان ہے :-

"علی بن عیسیٰ نے فقراء اور بے بس انسانوں کی حالت سدھارنے

کی طرف عملی قدم اٹھایا اور اس مقصد کے لئے اپنی ذاتی جائداد کی نصف آمدنی وقف کردی، اس وقف کی سالانہ آمدنی اسی ہزار دینار (چار لاکھ روپیہ) سے زیادہ تھی، اس کے ماسوا اور بہت سے وقف کئے تھے" (مسلمانوں کا نظم مملکت ص۱۵۹)

اسے کہتے ہیں قوم و ملک سے محبت، صرف زبانی لکچر نہیں دیا کرتا تھا، عمل کرکے دکھاتا تھا، اب تو دوسروں سے اپیل کی جاتی ہے اور اپنا گھر بھرا جاتا ہے، آج کل کوئی وزیر ذاتی جائداد غریبوں اور مزدوروں پر خرچ کرسکتا ہے؟ بلکہ مل جائے تو وہ سعی کرے گا کہ ذاتی آمدنی میں اضافہ ہوجائے، غریبوں کی ہمدردی میں لمبی تقریر، اور زور دار بیان سے زیادہ اور کچھ کرنا غیر ممکن سی بات ہے، الا ماشاء اللہ۔ ۵

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا

ایک وزیر کا عدل

اس کے اخلاق و اعمال کے متعلق بیان ہے:۔

"یہ وزیر نہایت عادل تھا، عدل و انصاف کے وقت امیر و غریب، شریف و رذیل اس کی نظر میں سب برابر تھے، اس معاملہ میں کسی کی رو رعایت کا قائل نہ تھا، اکثر اوقات عدالت کا اجلاس اور جھگڑے قضیوں کا فیصلہ خود کرتا" (ایضاً ص۱۵۹)

اس میں موجودہ دور کے وزراء کے لئے سبق ہے، کہ وزیر کے کیا صفات ہونے چاہئیں، اب یہ خوبیاں ہمارے دور کے وزیروں میں عنقا ہیں غریب اور رذیل کے ساتھ آج کون انصاف کرتا ہے؟ اگر یہی بات ہوتی تو کمیونسٹ کا یہ زور دیکھنے میں کیوں آتا، اور خونی انقلاب کی یہ تیاریاں کیوں ہوتیں؟

ایک وزیر کا ایثار

عباسی وزراء میں ابونصر احمد بھی بڑا مشہور وزیر گذرا ہے، یہ وزیر اعظم نظام الملک کا بیٹا تھا، اس نے اپنے زمانہ میں جبر و تشدد کا خاتمہ کر دیا تھا، اس کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ:-

"مسترشد باللہ نے ایک دفعہ بغداد کی شہر پناہ تعمیر کرنے کے لئے شہریوں پر اجتماعی طور پر پندرہ ہزار دینار، ۷۵ لاکھ روپیہ کی رقم واجب کی تھی -
ابونصر نے یہ رقم ان سے لینا گوارا نہ کیا اور اپنی ذاتی دولت سے ادا کر دی"

(نظم مملکت ص۱۶۸)

اللہ نے دولت دی تھی، تو انسانی ہمدردی سے بھی نوازا تھا، قوم سے ہمدردی ہو تو ایسی ہو صرف زبانی نہ ہو، ہمارے زمانہ کے وزراء کی ذاتی جائداد لاکھوں لاکھ کی ہے، مگر ایک حبہ بھی غریبوں پر نہیں خرچ کرتے، اگر یہ اتنا ہی کریں کہ حکومت کے خزانہ میں جو رقم غریبوں کے لئے منظور ہوتی ہے، وہ ان کو دے دیں تو غنیمت ہے مگر اس کی امید بھی خواب و خیال سے زیادہ نہیں ہے -

حاجت مندوں کی روزانہ امداد

عہد مستنصر میں ایک وزیر افضل بن بدر جمالی بڑا نامی گرامی وزیر اعظم گذرا ہے، اس کے متعلق لکھا ہے :-

"اس کے یہاں ایک کمرہ" مجلس عطا" کے نام سے موسوم تھا، جس میں افضل بذات خود بیٹھتا تھا، اور اپنے ہاتھ سے ہر مصیبت زدہ اور مفلس شخص کو ایک ایک دینار عطا کرتا تھا، مجلس عطاء میں اس مقصد کے لئے آٹھ تھیلیاں روزانہ رکھی جاتی تھیں جن میں بیس ہزار دینار

ہوتے تھے، دو تھیلیاں زنان خانہ میں رکھی رہتی تھیں ۔“

(نظم مملکت ص۱۷۵)

اب تو کسی وزیراعظم یا دوسرے وزرار کے پاس کسی مفلس کا پہنچنا ہی غیرممکن ہے، مفلس کو حکومت کے احاطہ میں قدم رکھنے کی اجازت کہاں؟ اب تو وزرار سے ان حضرات کو ملنے کی اجازت ملتی ہے، جو سرمایہ دار، سیاسی لیڈر اور کسی بڑی پارٹی کا صدر وغیرہ ہو، مفلوک الحال کو چپراسی کوٹھی کے گیٹ کے اندر جانے کی اجازت دیں؟ غیرممکن ہے، اور اگر کوئی غریب کسی ترکیب سے پہنچ بھی جائے، تو اس کی ضرورت وزیر پوری کردے گا؟ آج کل یہ بات کسی کے بھی سمجھنے کی نہیں، زیادہ سے زیادہ اپنے سکریٹری کے پاس بھیج دے گا، اور یہ بھول بھلیاں کے چکر میں ڈال دے گا۔

کاش ہمارے زمانہ کے وزرار اس واقعہ سے سبق حاصل کرتے اور مفلس اور مصیبت زدہ پر اپنے دست خاص سے رحم وکرم کی بارش کرتے اور ان کے زخم پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتے، مگر آہ - ع

ایں خیال است ومحال است وجنوں

مجرم کی رہائی

افضل کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ :-

”افضل جب اسکندریہ گیا تو اس نے اس یہودی کو گرفتار کیا، جو اسے ہمیشہ سب وشتم کرتا تھا، یہودی ڈر کر کہنے لگا، میرے پاس پانچ لاکھ درہم ہیں، انھیں لے لیجئے اور مجھے چھوڑ دیجئے، افضل نے جواب دیا لوگ کہیں گے میں نے دینار کے لالچ میں تجھے قتل کر دیا اس لئے چھوڑتا ہوں، ورنہ کبھی نہ چھوڑتا۔“ (ایضا ص۱۵۰)

اب یہ پاکیزہ نفسی کہاں ہے؟ اتہام سے اتنا ڈرتا اب کہاں باقی رہا
آج کل کوئی وزیر ہوتا تو شاید چپکے سے معاملہ کرلیتا اور اپنی جیبیں بھرلیتا۔

فاروق اعظم کی گورنروں کو نصیحتیں

حضرت فاروق اعظمؓ کا معمول تھا کہ جب کسی کو گورنر بنا کر روانہ کرتے تو کچھ دور خود ساتھ جاتے اور یہ نصیحت کر کے واپس ہوتے۔

"میں نے گورنر اس لئے مقرر کیا ہے کہ تم لوگوں میں نماز قائم کرو، ان کے حقوق ادا کرو، ان میں عدل و انصاف کرو، دیکھو عربوں کو درّے نہ مارنا ..... انھیں نظر بند نہ کرنا۔"

اب مسلمانوں میں احساس کہاں رہا، کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے، اور ہماری کیا ذمہ داری ہے، اب تو اگر کسی کو گورنر بنانا ہوا تو خود اس کے سامنے اس کی تعریف کے پل باندھ دیئے گئے۔

ایک خلیفہ کی رشوت ستانی پر نظر

خلیفہ عبدالملک بن مروان بنو امیہ کا بڑا مشہور خلیفہ گذرا ہے۔ اس کے متعلق مورخین کا بیان ہے:۔

"عبدالملک رشوت سے سخت جلتا تھا، اور اس کے انسداد میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، اگر کسی گورنر یا حاکم کے بارے میں اسے رشوت ستانی کا علم ہوجاتا تھا تو اسے کبھی نہیں بخشتا تھا۔" (نظم مملکت صلہ)

بتایا جائے اب یہ خوبیاں ہمارے افسروں میں باقی رہیں؟ اب تو اگر کوئی بُرائی حکام میں نظر آئے گی تو اوپر والے پردہ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ اس کی قرار واقعی سزا تو خواب و خیال سے زیادہ نہیں، اور یہ اس وجہ سے کہ اوپر سے نیچے تک کوئی بھی غرض سے پاک نہیں، جو ایک دو ایسے ہیں ان کی

چلتی نہیں۔

حکومت عباسی میں یہودی و نصرانی کو عہدے

مورخین کا یہ بیان بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"حکومت عثمانیہ کی طرح عباسیوں کے ہاں بھی حکومت کے تمام چھوٹے بڑے عہدے مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کو بلا کسی تفریق و امتیاز کے دیئے جاتے تھے۔" (نظم مملکت ص۲)

پھر بھی شکوہ کیا جائے گا کہ مسلمانوں نے رواداری سے کام نہ لیا، حق یہ ہے کہ مسلمانی حکومتوں نے عدل و انصاف میں مذہب و ملت کی کبھی تفریق نہیں کی حکومت کی نظر میں تمام رعایا کو برابر کا درجہ دیا گیا۔

امام ابو یوسف کا خط ہارون رشید کے نام

قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) امام ابو یوسفؒ نے ہارون رشید کو ایک خط میں لکھا:۔

"آپ کا فرض ہے کہ ذمیوں سے رواداری برتیں..... ان کی ضرورتوں سے بے خبر نہ رہیئے، ان پر جبر و جور اور زیادتی نہ ہونے پائے، جزیہ کے علاوہ ان کا مال نہ لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ان آخری الفاظ سے ناواقف نہ ہوں گے: ذمیوں سے بھلائی کرنا، ان سے رواداری برتنا، انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دینا۔"

(ا ۲۷۳)

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانی حکومتوں میں غیر مذاہب والوں کا کتنا لحاظ رکھا جاتا تھا، ان کی دل دہی، حوصلہ افزائی اور ان سے

ساتھ رواداری کا کیسا عمدہ برتاؤ رکھا جاتا تھا۔

اب تو ہمارے زمانہ میں لوگ سب سے زیادہ اپنی حکومت میں اسی کو ستاتے ہیں، جو لوگ اقلیت میں ہیں اور ہر طرح نہتے اور کمزور ہیں اور اسی کو بہادری سمجھتے ہیں۔

بددیانت افسروں کی سزا

عبدالملک بن مروان کے متعلق بیان ہے:-

"اس نے اپنے غیر معمولی سیاسی تدبر سے ٹیکس کا نظام نہایت بلند معیار پر پہنچا دیا تھا، اور ٹیکس کے افسران کو ایک پائی بھی غبن کرنے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی، وہ نہایت سختی سے اس کا محاسبہ کیا کرتا تھا، رشوت خور، اور بددیانت افسروں کو معزول کر کے انھیں لرزہ خیز سزائیں دیتا تھا، اور ان سے ایک ایک حبہ اگلوا لیتا تھا۔" (نظم مملکت صلے۲)

فرمائیے ہمارے اس دور میں یہ اہتمام، اور افسروں کا یہ محاسبہ باقی رہا، رشوت کا بازار جتنا گرم ہے وہ کسی سے بھی مخفی نہیں، کھلے عام رشوت کا کاروبار ہوتا رہتا ہے، مگر چونکہ کوئی بھی پاک نہیں اس لئے روک تھام کون کرے؟ مرکزی وزراء کو اپنے کاموں اور بیانوں سے چھٹی نہیں، یہ بیچارے تو گروپ بندی اور پارٹی بازی کی لعنت میں اس طرح مبتلا ہیں کہ الامان الحفیظ۔

قحط کے زمانہ میں ٹیکس میں تخفیف

دور عباسی میں خشک سالی اور قحط کے زمانہ میں ٹیکس میں تخفیف کر دی جاتی تھی لکھا ہے:-

"معتضد کے زمانہ میں جب ام انگیز قحط پڑا تو لگان کا ۱/۳ معاف کر دیا گیا،

اور ادائیگی کے لئے ۱۷ جنوری سے ۱۵ مارچ تک مہلت دے دی گئی تھی

.... پھر اس میعاد کو ۲۱ جولائی تک بڑھا دیا گیا تھا۔

اب رعایتیں عنقا ہیں۔ اب تو ہر سال نیا ٹیکس عاید کیا جاتا ہے جب سے آزاد بھارت کی حکومت بنی اللہ کے فضل سے کوئی سال نئے ٹیکس سے خالی نہیں، اب تو کوئی چیز ٹیکس سے محفوظ ہی نہیں، پھر بھی حکومت کا بجٹ خسارہ کا ہی بنتا ہے، خدا کرے، ہمارے دیش کے وزراء کا پیٹ جلد بھر جائے، اور ملک خوش حالی کی طرف قدم بڑھائے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی زندگی کے بعض گوشے

ظالم عمال کی معزولی

حضرت عمر بن عبدالعزیز سلتہ ھ میں پیدا ہوئے، خلافت سے پہلے امیرانہ ٹھاٹ کے آدمی تھے، مگر مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد بالکل بدل گئے، اور خود ہی نہیں بدلے بلکہ پورے ملک کو بدل ڈالا۔ مورخین نے لکھا ہے :-

"عمر بن عبدالعزیزؒ نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بلا تاخیر ان چند عمال حکومت کو معزول کر دیا جو سخت ظالم اور ناخدا ترس تھے، ان کے سامنے شاہی تزک و احتشام اور جانشینی کا جو سامان پیش کیا گیا، اس کو بیت المال میں داخل کیا گیا اور اسی گھڑی سے

ان کی سیرت یکسر بدل گئی، اور اپنی مجلس کو..... سنت اور خلافت راشدہ کے نمونہ پر سادہ اور مطابق سنت بنایا" (دعوت وعزیمت)

کاش آج کے مسلمان حکمراں اس صحیح واقعہ سے عبرت و بصیرت حاصل کرتے، اور کسی بھی ملک کا سربراہ عمر بن عبدالعزیز کے نقش قدم پر چل کر دنیا میں اسلامی حکومت کا نمونہ پیش کرتا، اس کی نظر اس پر نہ ہوتی کہ ہمارے پیشرو نے کیا کیا، بلکہ یہ سوچتے کہ ہم پر خدا و رسول کی طرف سے کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس سے فائدہ یہ ہوتا کہ اسلامی نظام حکومت جو صرف ہماری کتابوں میں محفوظ ہے عملی طور پر دنیا کے سامنے آجاتا، اور اس نظام کے برکات وثمرات کو دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھتی -

خلیفہ کا حال مسند خلافت پر آنے کے بعد

اس کے بعد خود ان کا یہ حال ہوا، کہ :-

"اپنی جاگیر مسلمانوں کو واپس کردی، بیوی کا زیور بیت المال میں داخل کیا،..... لباس میں ایسی کمی کی، کہ بعض اوقات کرتہ سوکھنے کے انتظار میں جمعہ میں تاخیر سے پہنچنا ہوتا" (دعوت وعزیمت)

آج کس کو ان تاریخی حقائق پر یقین آئے گا، مگر واقعہ یوں ہی ہے، اب تو حکمراں طبقہ ملک کے سرمایہ کو اپنی میراث سمجھتا ہے اور بے دریغ مختلف راستوں سے اپنی عیاشی پر خرچ کرتا ہے، اور اسے ایک لمحہ کے لئے شرم بھی محسوس نہیں ہوتی کہ کیا کیا کر رہا ہے، ابھی پاکستان کے فوجی انقلاب نے ایک ایسی مسلمانی حکومت کے حکمرانوں کا پول کھول کر رکھدیا ہے، جو خلافت راشدہ اور کتاب و سنت کے نام پر وجود میں آئی ہے - دنیا میں جو دیش بھگت مساوات کا نام لیتے ہیں، اور ایک مخصوص نظام حکومت کو سراہتے ہیں، وہ تو اس کی گرد دیک کو بھی نہیں پا سکتے، سچ

ہے کہنے اور کرنے میں زمین و آسماں کا فرق ہے۔

خلیفہ کے بچوں کا حال زار

اس خدا ترس خلیفہ کے متعلق لکھا ہے، کہ :۔

"ایک مرتبہ اپنی بچیوں سے ملنے گئے، تو دیکھا جو بچی ان سے بات کرتی ہے، وہ منھ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے، سبب دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ ان بچیوں نے آج صرف دال اور پیاز کھائی ہے، رو کر فرمایا کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم انواع و اقسام کے کھانے کھاؤ، اور تمہارا باپ جہنم میں جائے، یہ سن کر وہ بھی رو پڑیں" (تاریخ دعوت و عزیمت)

ہے پوری دنیا میں کوئی حکمراں؟ جو ایسی مثال پیش کر سکے، کہ اس کے بچے کو پیٹ بھر اچھے کھانے بھی میسر نہ ہوں، اور باپ اس طرح ان کی تشفی کرے اور کمالِ ادب بچیوں کا بھی قابل صد ستائش ہے کہ پیاز کی بو کی وجہ سے باپ کے سامنے منھ کھول کر باتیں بھی نہ کر سکیں، اس دور کی سگار و سگریٹ پینے والی بچیاں اس کا تصور بھی کہاں سے کر سکتی ہیں۔

خرچ میں کمی کی وجہ سے حج میں نہ جاسکے

یہی نہیں کہ ان کے بال بچوں کے کھانے کا معیار خلافت بعد پست ہو گیا بلکہ ایسی دینی عبادت کا شوق بھی پورا نہ ہو سکا جس میں روپے کا خرچ تھا لکھا ہے :۔

"ان کی ذاتی ملکیت کا یہ حال تھا کہ باوجود شوق کے حج کا خرچ ان کے پاس نہ تھا، نوکر جوان کا سچا رفیق تھا، پوچھا، تمہارے پاس کچھ ہے اس نے کہا، دس بارہ دینار ہیں، کہا اس میں حج کیسے ہو سکتا ہے؟"

(تاریخ دعوت و عزیمت)

خلیفہ کی ان ہی خصوصیات کا نتیجہ تھا کہ ملک میں پھر ایک مرتبہ دینی بہار آگئی اور خلافت راشدہ کا دور آنکھوں میں پھرنے لگا، خدا کرے ہمارے مسلمان حکمراں ان حقائق کو پڑھیں اور عمل کی سعی کریں، اور وہ غیر مسلم حکمراں بھی جو غریبوں اور مزدوروں کا نام لے کر اپنی ساکھ بنانے کی جدوجہد میں مشغول ہیں۔

کھانے اور روشنی میں احتیاط

حکومت کی دولت کا اہتمام اس قدر تھا کہ ایک حبہ ضرورت سے زیادہ خرچ نہیں کرتے تھے، لکھا ہے:-

"ان کے دو وقت کھانے کا حساب دو درہم یومیہ سے زیادہ نہ تھا، احتیاط کا یہ عالم تھا، کہ اگر سرکاری شمع جل رہی ہوتی اور کوئی ان کی خیریت دریافت کرنے لگتا یا ذاتی بات چیت شروع کر دیتا، تو فوراً اس کو گل کر دیتے، اور اپنی ذاتی شمع منگوا دیتے، بیت المال کے باورچی خانہ میں گرم کئے ہوئے پانی سے غسل کرنے سے بھی احتراز تھا، بیت المال کا مشک سونگھنا بھی گوارا نہ تھا" (تاریخ دعوت و عزیمت)

آج جبکہ ایک ایک وزیر اور ملک کے سربراہوں کی کوٹھی کا خرچ ایک ایک دو دو کروڑ تک ہے، مذکورہ بالا واقعہ ایک افسانہ معلوم ہوگا، مگر یہ افسانہ نہیں ایک حقیقت ہے، اب تو ہمارے اس دور میں مختلف بہانوں سے ذمہ داران حکومت ہزاروں کے بھتے اور سفر خرچ حکومت کے خزانے سے وصول کرتے ہیں، اور ایسی احتیاط کا کوئی شائبہ تک ان کے خیال میں نہیں گذرتا، اب تو قوم کی دولت کو وزراء اور حکمراں طبقہ اپنی موروثی جائداد سمجھتے ہیں اور بے دریغ اپنی ذات پر خرچ کرتے ہیں، بلکہ ہمارے اکثر دینی اداروں کے ذمہ داروں میں بھی یہ احتیاط خال خال ہی باقی رہ

گئی ہے، ورنہ ہر جگہ ایسی بے احتیاطی اور فضول خرچی ہے کہ خدا کی پناہ،

عمال حکومت کو احتیاط کرنے کی ہدایت

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جہاں یہ احتیاط خود اپنی ذات کے لئے اختیار کر رکھی تھی، عمال حکومت کو بھی اس کی تاکید فرماتے تھے، چنانچہ عمال مدینہ کی درخواست جب موم بتیوں اور قندیلوں کے لئے آئی، تو اس کے جواب میں لکھا:۔

"ابوبکر! (ابن حزم) مجھے یاد ہے کہ تم اس عہدے سے پہلے جاڑے کی اندھیری راتوں میں بے شمع وموم بتی نکلتے تھے، تمہاری وہ حالت اس حالت سے بہتر تھی، میرے خیال میں تمہارے گھر کی موم بتیاں اور قندیلیں کافی ہیں، انھیں سے تم کو کام لینا چاہئے"

کاغذ تک میں کفایت شعاری کی ترغیب

اسی طرح ایک درخواست پر جس میں سرکاری کام کے لئے کاغذ طلب کیا گیا تھا، تحریر فرمایا:۔

"قلم باریک کردو، اور گھٹا ہوا لکھو، اور ایک پرچہ میں بہت سی ضرورتیں لکھ دیا کرو، اس لئے کہ مسلمانوں کو ایسی لمبی چوڑی باتوں کی ضرورت نہیں جس سے خواہ مخواہ بیت المال پر بار پڑے" (دعوت وعزیمت)

ہمارے اس دور میں سرکاری سرمایہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اور کبھی بھی کسی ذمہ دار کو احساس نہیں ہوتا ہے کہ یہ قوم کا سرمایہ ہے، حکمراں طبقہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کو اس واقعہ سے سبق لینا چاہئے، اور قومی سرمایہ کی قدر وقیمت کا اندازہ لگانا چاہئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خوب اچھی طرح یہ ذہن نشیں کر دیا تھا کہ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے، پوری زندگی اسی نقطۂ نظر پر خود بھی عمل کیا، اور عمالِ حکومت کو بھی اسی پر کاربند رکھا، جزیہ کی رقم جب آپ کے زمانہ میں کم ہونے لگی تو کارکنانِ سلطنت نے اس طرف توجہ دلائی، اس کے جواب میں آپ نے لکھا:۔

"مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہو جائیں، اور جزیہ کی رقم بند ہو جانے کی وجہ سے ہم تم دونوں کھیتی کر کے اور ہل چلا کر اپنا پیٹ بھریں" (دعوت وعزیمت)

جزیہ کی رقم غیر مسلم سے وصول کی جاتی تھی، آپ نے اسی وجہ سے عمالِ حکومت کو یہ جواب لکھا تھا، اور بتایا تھا کہ مقصد جزیہ کی وصولی نہیں ہے۔ ان کو آرام و راحت پہنچانا ہے۔

یمن کے سلسلہ میں حاکم نے توجہ دلائی تو اس کے جواب میں لکھا:۔

"فصل کے مطابق رقم وصول ہونی چاہئے، خواہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ سارے یمن سے ایک مٹھی غلہ وصول ہو، میں اسی پر راضی ہوں" (ایضاً)

اب یہ باتیں کہاں باقی رہیں، اب تو حکومت کو روپے ملنے چاہئیں خواہ فصل ہو یا نہ ہو، پبلک جنت میں جائے یا جہنم میں، حکمراں طبقہ کا پیٹ بھرنا چاہئے، اور ان کی عیش بھری زندگی میں کمی نہ آنی چاہئے، ٹھیک جس وقت پبلک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوتی ہے، حکمراں طبقہ اپنے فرنیچر اور بھتّے کے نام پر روپے بے دریغ خرچ کرتے ہوئے مطلقاً نہیں شرماتے خواہ وہ کسی طرز کی حکومت ہو۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ساری مملکت میں چنگی بند کرادی، اور عمال کو لکھا کہ وہ نجس ہے، اس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

"اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم مت دو، اور زمین پر فساد پھیلاتے نہ پھرو لوگوں نے اس کے نام پر چل کر اس کو جائز کر لیا ہے" (ایضاً)

ہمارے اس دور میں جائز و ناجائز پر نظر رکھنے کو عیب شمار کیا جاتا ہے، اور مسائل پر عمل کرنے کو ملک کے لئے نقصان دہ سمجھا جاتا ہے۔

ع ببیں تفاوتِ رہ از کجا تا بکجا

ناجائز محاصل اور ٹیکسوں کی بندش

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے متعلق لکھا ہے:۔

"کہ اس کے ساتھ انھوں نے چند شرعی محاصل کے علاوہ، ہر طرح کے ناجائز محاصل اور بیسیوں ٹیکسوں کو بند کرا دیا جو سابق فرمانرواؤں اور عمال حکومت نے ایجاد کر رکھے تھے۔" (دعوت وعزیمت)

اب ہے کسی ارباب حکومت میں یہ جرأت اور ایسا یقین واذعان کہ حق پر برملا عمل کرے، اور باطل کو مٹانے میں ایک لمحہ کی تاخیر کو گناہ سمجھے، اب تو ایک ناجائز چیز کے بند کرنے میں ارباب حکومت آمدنی پر بحث شروع کر دیتے ہیں، اور یہ سمجھانے کی سعی کرتے ہیں کہ اس حرام سلسلہ کو بند کرنے میں حکومت کو لاکھوں کا نقصان ہوگا، لہذا ایسا کرنا ملک کو برباد کرنا ہے۔

کارکنان حکومت پر پابندی

عمال حکومت کے نام آڈر جاری کیا جس کا حاصل یہ تھا:۔

"حکام و عمال سلطنت کو تجارت کی ممانعت کر دی، بیگار لینے کو قانوناً ممنوع قرار دیدیا، عمال کو تحفہ تحائف قبول کرنے کی ممانعت کر دی، اور فرمایا کہ اگر وہ کبھی تحفہ تھا تو اب وہ رشوت کے سوا کچھ نہیں ہے۔" (دعوت وعزیمت)

کون نہیں جانتا کہ اب حکام مختلف ناموں پر تجارت اور ٹھیکہ کا کام

خود لیتے ہیں، اور اس طرح حکومت اور پبلک کا خزانہ لوٹنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے، اسی طرح تحفہ تحائف کے نام پر وزراء اور ان کی بیویاں لاکھوں روپے رشوت کے پبلک سے کھاتی ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، بیگاری کے طریقے ضرور بدل گئے ہیں، مگر سبھی جانتے ہیں کہ ملک کے حکام اس سے پاک نہیں ہیں۔

پبلک کی سہولت کیلئے حکام کو ہدایت

آپ نے عمال اور کارکنان حکومت کو ہدایت جاری فرمائی:۔

"لوگوں کو اپنے تک پہنچنے اور شکایات پہنچانے کے پورے مواقع اور سہولتیں مہیا کریں، حج کے موقعہ پر اعلان ہو تاکہ جو کسی ظلم کی اطلاع یا کوئی نیک مشورہ دے گا اس کو سو سے لے کر تین سو دینار تک انعام ملے گا" (تاریخ دعوت وعزیمت)

کیا ہمارے اس دور میں پبلک کی ان سہولتوں کی ضرورت نہیں ہے؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو غور کیجئے کیا ہمارے سربراہ اس طرح کی ہدایات اب بھی حکام کو دیتے ہیں، اور اگر کہیں دیتے بھی ہیں تو کیا حکام اس پر عمل بھی کرتے ہیں؟

ارباب حکومت سب کچھ جانتے ہیں، ساری بے ایمانیوں سے واقف ہوتے ہیں، مگر کچھ نہیں کرتے، اس لئے کہ وہ خود ان کاموں میں ملوث ہوتے ہیں اور پبلک کے ساتھ انصاف نہیں کرتے ہیں، آج کس کی مجال ہے کہ کسی حاکم یا وزیر کی شکایت جو ظلم وجور کے سلسلہ میں جائز راستے ہیں وہ اوپر لے جائیں گے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میری گردن ناپ دی جائے گی دوسرے یہ کہ اوپر والے چشم پوشی کریں گے، دعا ہے وہ دور پھر لوٹے کہ ہم اپنی آنکھوں سے ایسی حکومت کو دیکھیں۔

افسروں کو ھدایت

حرف عمر بن عبدالعزیزؒ نے عمال و امراء کو دینی و اخلاقی نصیحتیں کی ہیں اور ساتھ ہی :-

"خطوط میں فوجی افسروں کو وقت پر نمازیں پڑھنے اور ان کے اہتمام اور علم کی نشر و اشاعت کی تاکید کرتے ہیں، عمال کو تقویٰ اور اتباع شریعت کی وصیت فرماتے ہیں، اپنے علاقہ اور حلقہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کی ترغیب دیتے ہیں..... ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ اس فریضہ کے ترک ہو جانے سے کیا نقصانات ہیں، اور اس کا کیا و بال پڑتا ہے" (تاریخ دعوت و عزیمت)

موجودہ مسلمان حکمراں طبقہ ان ہدایات کو آنکھیں کھول کر پڑھے، اور سوچے کہ کیا اب یہ چیزیں ان میں کسی درجہ میں بھی باقی ہیں؟ اب تو حرام کاری شراب خوری اور ناجائز امور کے ارتکاب سے ایک منٹ کو چھٹی ہی نہیں ملتی، الاماشاءاللہ۔ کون سمجھائے کہ اسلامی احکام کی تعمیل ہی مسلمان حکمراں کو آگے لے جاسکتی ہے۔ جب تک یہ ان بنیادی چیزوں پر عمل نہیں کرتے، دنیا میں کسی نہ کسی راستہ سے رسوا ہوتے رہیں گے، ان کو یقین کرنا چاہیئے کہ یہ آخری نبی کی امت ہیں، اور ان پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، کاش مسلمانوں کی سوئی ہوئی بستی بیدار ہوتی، اور اپنے فرائض کو ادا کرنے کے لئے میدان میں اتر آتی۔

اسلامی قوانین پر عمل کا ثمرہ

اپنے ایک گشتی فرمان میں تحریر فرماتے ہیں :-

"اسلام کے کچھ حدود و قوانین ہیں، جو ان پر عمل کرے گا اس کے ایمان کی

تکمیل ہو گی، اور جو عمل نہیں کرے گا اس کا ایمان نامکمل رہ جائے گا۔ اگر زندگی نے وفا کی تو میں تمہیں اس کی تعلیم دوں گا، اگر اس سے پہلے میرا وقت آگیا تو میں تمہارے درمیان رہنے پر کچھ ایسا حریص بھی نہیں ہے"

(تاریخ دعوت وعزیمت)

اب یہ زندگی مسلمان حکمراں طبقہ میں کہاں باقی رہی، یہ بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی، دنیاوی ضابطے کے پیچھے پڑ گئے، ان کو روس و امریکہ کی نقالی سے چھٹی نہیں ہے، کہ اسلامی حدود و قوانین پر عمل کر کے تجربہ بھی حاصل کرتے۔ اور اس طرح یقین حاصل کرتے۔

ایک فوجی افسر کے نام خلیفہ کا خط

حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے ایک فوجی افسر کے نام ایک فرمان میں لکھتے ہیں:۔

"اللہ کے بندے امیرالمومنین کا یہ ھدایت نامہ ہے منصور بن غالب کے نام..... امیرالمومنین نے ان کو حکم دیا ہے کہ ہر حال میں تقوی اختیار کریں، کیونکہ تقوی بہترین سامان مؤثر ترین تدبیر اور حقیقی طاقت ہے امیرالمومنین اس کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے دشمنوں سے زیادہ معصیت سے ڈریں، کیونکہ گناہ دشمن کی تدبیروں سے بھی زیادہ انسان کے لئے خطرناک ہے، ہم اپنے دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں، اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ہم ان پر غالب آتے ہیں، کیونکہ اگر یہ بات نہیں ہے، تو ان سے دراصل ہم میں مقابلہ کی قوت نہیں ہے، کیونکہ نہ تو ہماری تعداد ان کی تعداد کے برابر ہے اور نہ ہمارا سامان ان کے سامان کے برابر، پس اگر ہم اور وہ دونوں معصیت میں برابر ہو جائیں، تو وہ قوت و تعداد میں ہم سے بڑھ کر ثابت ہوں گے"۔ (ایضاً)

اس فرمان کے ایک ایک جملہ کو غور سے پڑھئے، اور سوچئے کہ کیا جو کچھ لکھا گیا ہے صحیح نہیں ہے؟ اگر صحیح ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے، تو پھر بتایئے کہ کیا اب بھی حکمرانوں کے ذہن میں یہ بات باقی ہے؟ اور کیا اب بھی ہمارے موجودہ حکمراں اس پر یقین رکھتے ہیں۔

کیسے یقین دلایا جائے کہ پوری دنیا کے مسلمان صرف اس وجہ سے ذلیل وخوار ہیں کہ وہ اس راز کو فراموش کر گئے کہ اس کی طاقت کا مدار ایمان کی سلامتی اور معصیت سے اجتناب پر تھا، جب تک وہ پکے اور سچے مسلمان رہے، تھوڑے ہونے کے باوجود ساری دنیا پر بھاری رہے اور ہر اعتبار سے مگر جونہی ایمانی ضعف و اضمحلال آیا، گناہوں پر یہ جری ہو گئے جائز و ناجائز کی قید اٹھادی، اور خدائی احکام سے منھ موڑ لیا، ان کی ہوا اکھڑتی ہی چلی گئی یہ دن رات پست ہی ہوتے چلے گئے، کاش مسلمان اس راز کو پھر پالیتے، اور ایک دفعہ پھر عزم کر لیتے، کہ انھیں مسلمان بن کر جینا ہے اور مسلمان ہی بن کر مرنا ہے۔

خلیفہ کی ھدایت

اسی فرمان میں آگے لکھتے ہیں :۔

"یاد رکھو اگر ہم ان پر حق کی وجہ سے فتح نہ پا سکیں گے، تو اپنی قوت کی وجہ سے بھی ان پر غالب نہ آسکیں گے، اور اپنے گناہوں سے زیادہ کسی کی دشمنی سے چوکنا نہ ہوں، جہاں تک ممکن ہو اپنے گناہوں سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہ کریں" (تاریخ دعوت وعزیمت)

ضرورت ہے کہ آج بھی مسلمان اسی فرمان کو راہ عمل بناتے اور اپنے اعمال واخلاق کا جائزہ لے، یہ غلط رسم پھیل پڑی ہے، کہ دنیا بھر کے دشمنوں کو ہم اپنی خاص مجلس میں بیٹھ کر کوسیں گے، مگر اپنے اخلاق و کردار کے

سدھار کی فکر نہ کریں گے۔

جن سے صلح ہو چکی ہے ان کا احترام

جن لوگوں سے صلح ہو چکی ہے، اس کے متعلق ہدایت ہے:۔

"اور امیرالمومنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ قیام صلح کی بستیوں سے الگ رکھیں، امن وامان والی بستیوں میں ان کے ساتھیوں میں سے کوئی نہ جائے، نہ ان کے بازاروں میں، نہ ان کی مجلسوں میں، ہاں وہ شخص جاسکتا ہے جس کو اپنے دین اور امانت پر پورا بھروسہ ہو، اور نہ ان کی بستیوں پر ظلم کریں، اور نہ وہاں سے اپنے لئے گناہ جمع کریں، اور نہ ان کو اذیت پہنچائیں" (تاریخ دعوت وعزیمت)

ناخداشناس ان اصولوں کی اہمیت کو کیا جانیں، انسانوں کی اتنی بڑی آبادی میں صحیح طور پر کہیں بھی اسلامی نظام حکومت پورے طور پر قائم نہیں ہے، ورنہ تجربہ کی روشنی میں اس نظام کو اپنانے کے لئے مجبور ہوتے۔

خلیفہ کا خط عمال حکومت کے نام

ایک عمومی خط میں عمال سلطنت کو تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے حکومت کی ذمہ داری کسی لالچ کی وجہ سے قبول نہیں کی ہے، کہ پہلے سے دنیا کی ساری چیزیں خدا نے دے رکھی ہیں، پھر اپنی ذمہ داری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"لیکن میں نے اس ذمہ داری کو ڈرتے ڈرتے قبول کیا ہے، مجھے اس کا احساس ہے کہ یہ عظیم الشان ذمہ داری ہے، اس کی بازپرس بڑی سخت ہے، جس وقت فریق اور مدعی قیامت کے دن جمع ہوں گے، تو اس کے

معاملہ میں بڑی سخت جرح ہوگی، ہاں اگر اللہ تعالیٰ معاف کر دے اور نظر انداز فرما دے، اور رحم فرمائے تو الگ بات ہے"
(تاریخ دعوت و عزیمت)

آگے لکھتے ہیں :-

"میں نے تم کو حکومت کا جو کام سپرد کیا ہے اور جو اختیارات تفویض کئے ہیں، ان میں تم کو احتیاط اور خدا کے خوف کی ہدایت کرتا ہوں ..... تمہاری نظر اپنے اوپر اور اپنے عمل پر رہے اور ان چیزوں کی طرف ہو، جو تم کو اب تک پہنچائیں" (ایضاً)

خلیفۂ وقت کی ذمہ داری کے اسی احساس نے حکومت کے نظم و نسق کو درست کر رکھا تھا، اور ملک سے جور و ظلم کا قلع قمع کر دیا تھا، مخلوق خدا کو آرام و سکون کی زندگی میسر تھی اور ملک ہر طرح ترقی پذیر تھا۔

کاش آج کے حکمراں ان فرمانوں کا بغور مطالعہ کرتے اور اپنی حکومت کو اسی لائن پر چلانے کی سعی کرتے۔

اسلامی اصول پر عمل کا نتیجہ

ان اسلامی اصول پر عمل کا کیا نتیجہ ہوا؟ مورخین کا فیصلہ ہے :-

"ملک میں خوش حالی عام ہو گئی، اور دولت کی وہ فراوانی ہوئی، کہ زکوٰۃ قبول کرنے والا، ڈھونڈھنے سے نہیں ملتا تھا"

ایک عامل یحییٰ بن سعید کا بیان ہے :-

"مجھے عمر بن عبدالعزیز نے افریقہ میں زکوٰۃ وصول کرنے پر مقرر کیا میں نے زکوٰۃ وصول کی، جب میں نے اس کے مستحق تلاش کئے، جن کو وہ رقم دی جائے، تو مجھے ایک بھی محتاج نہیں ملا، جس کو زکوٰۃ دی جاسکے"

(دعوت و عزیمت)

خدائی قانون پر عمل کرنے کا یہ نتیجہ تھا، کہ ملک سے عزبت وافلاس کا نام مٹ گیا، مگر آج کے باغی انسانوں کو کون سمجھائے، کہ تم جس چیز کا رونا رو رہے ہو، اس کا حل خدا کے قانون میں ہے، انسان کے قانون میں نہیں

دینداری کا عالم

اسی نظام حکومت کی برکت تھی، کہ مسلمانوں میں دین کا عام چرچا ہو گیا تھا، اور خداترسی کا گھر گھر تذکرہ تھا، چنانچہ لکھا ہے :-

"عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں نوافل وطاعات کا ذکر و تذکرہ گفتگو اور مجلسوں کا موضوع بن گیا، جہاں چار آدمی جمع ہوتے تو ایک دوسرے سے پوچھتے کہ رات کو تمہارا کیا پڑھنے کا معمول ہے؟ تم نے کتنا قرآن یاد کیا ہے؟ تم قرآن کب ختم کرو گے؟ اور کب ختم کیا تھا؟، مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہو" (تاریخ دعوت و عزیمت ج ۱ ص ۴۳)

خدا کرے یہ دور پھر آئے، اور خدا کی مخلوق ہر طرح خوش حال نظر آئے اور دین کا تذکرہ گھر گھر ہوتا نظر آئے۔ آمین، آمین۔

بعض سلاطین اندلس کے شخصی حالات زندگی

"۱۳ر دسمبر ۵۸ء کو ندوۃ المصنفین کا ایک پارسل آیا جن میں "تاریخ ملت" کے دو حصے (چہارم و پنجم) بھی تھے۔ مجھے یہ کتابیں حلقۂ معاونین کے رکن کی حیثیت سے ملی تھیں، میں نے ان نئی کتابوں کے لئے اپنے اوقات سے کچھ وقت مخصوص کردیا، اول نظر میں تاریخ ملت کا حصہ چہارم "خلافت ہسپانیہ" کچھ زیادہ وقیع نہ معلوم ہوا، مگر بعض خصوصیتوں نے اعتراف پر مجبور کیا اور اسے میں نے بہت شوق اور پورے ذوق سے پڑھنا شروع کیا کوئی شبہ نہیں اندلس کی یہ تاریخ بہت مختصر ہے، مگر بڑی حد تک جامع ہے، ذاتی طور پر مجھے اس کا وہ حصہ بہت پسند آیا جس میں سلاطین کی شخصی زندگی اور ان کے اخلاق و عادات بیان کئے گئے ہیں۔ انہی واقعات کو خصوصیت سے ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کررہا ہوں۔" (محمد ظفیر الدین)

خلیفہ عبدالرحمٰن کے عادات

عبدالرحمٰن المتوفی ۳۵۰ھ بہت مشہور خلیفہ گذرا ہے، اپنے اخلاق و عادات اور دینی زندگی میں ممتاز اور کارناموں کے لحاظ سے بڑی عزت و شہرت کا مالک تھا "جامع قرطبہ" اب تک اس کی یادگار باقی ہے، اس کی سیرت کے متعلق

تاریخ ملت جلد چہارم صفحہ ۵ میں سطور ذیل ملتی ہیں ۔

"سلطان نہایت نیک سیرت اور منصف مزاج تھا، اقربا تو کجا اگر رعایا میں سے کوئی مرجاتا تھا تو وہ کیسا ہی غریب کیوں نہ ہو، سلطان اس کے جنازہ میں شریک اور بذات خود نماز جنازہ کی امامت کرتا تھا، اگر کوئی شخص بیمار ہوتا عیادت کو خود جاتا، غرض کہ اپنی رعایا کی شادی اور غم میں برابر کا شریک تھا، نماز جمعہ خود پڑھاتا اور خطبہ بڑی فصیح عربی میں پڑھتا، اس کا خطبہ شجاعانہ جذبات کا برانگیختہ کردینے والا ہوتا" (تاریخ ملت ص۴۴)

یہ تھا سلطان وقت کا اخلاق جس کی نگاہ میں غریبوں کی وقعت بھی ویسی ہی تھی جیسی آج کل کے لوگوں کی نگاہ میں کسی معزز مالدار اور اونچے مرتبہ والے کی، ایک دوسرا واقعہ لاحظہ کیجئے ۔

سلطان رعیت کی گرفت میں

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سلطان بعد شرکت میت واپس ہو رہا تھا کہ اثنائے راہ میں ایک معمولی آدمی نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی، اور کہا اے امیر! قاضی نے میرے حق میں نا انصافی کی ہے جس کی داد میں تجھ سے چاہتا ہوں، سلطان بولا اگر تو سچا ہے تو میں تیرے حق میں انصاف کروں گا، چنانچہ وہیں کھڑے کھڑے قاضی کو بلا کر سختی سے کہا، قاضی صاحب! اس شخص کا انصاف ہونا چاہئے" (ایضاً)

یہ ایک ایسے سلطان وقت کا تحمل اور انصاف ہے جو شخصی حکومت کا فرمانروا تھا، اس کو الیکشن لڑنا نہیں پڑتا تھا اور نہ معمولی غریب کے ووٹ کی اس کو ضرورت تھی، دولت و ثروت کی بھی کمی نہ تھی اور نہ سر پر باغیوں کا طوفان تھا۔

ایک غریب کی نصیحت سلطان وقت کو

اسی طرح ایک عرب غریب دربار میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا:۔

"اے بادشاہ! خدائے تعالیٰ نے تجھ کو بادشاہ اور بے انتہا خزانوں کا اس لئے مالک کیا ہے کہ تو غریب اور یتیم اور بیواؤں کے حق میں انصاف اور ان کی مدد کرے، سلطان نے کہا تمہاری مدد ہوگی اور ہر ایسے شخص سے کہدو جو تمہارے مثل ہوں ان کے لئے دربار کھلا ہے، وہ درخواست میرے سامنے پیش کریں تاکہ میں بذات خود ان کو ہر قسم کی مدد دوں، اور ان کو پریشانیوں سے نجات دوں" (خلافت ہسپانیہ ص۵۲)

دیکھا آپ نے درخواست پر صرف اسی سائل کی مدد نہ کی بلکہ اس کے ذریعہ یہ اعلان کرادیا کہ تم جیسے اور جو بھی اہل حاجت ہوں وہ آئیں ان کی مدد کی جائے گی، اس کا دستور تھا کہ جب کوئی کھانے کے وقت آجاتا، اس کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرلیتا اور پھر خوش اسلوبی سے اس کی غرض پوری کرتا۔

ایک خلیفہ کی نصیحت اپنے لخت جگر کو

اسی عبدالرحمٰن الداخل کا پوتا تھا الحکم، جو اپنے باپ کے بعد سریر آرائے حکومت ہوا تھا، اور ۲۰۰ھ کے اخیر مہینہ میں جس کا انتقال ہوا تھا ان کے باپ ہشام بن عبدالرحمٰن نے اپنی حالت نزع میں الحکم کو بلایا اور یہ نصیحت کی:۔

"بیٹا یہ خیال رکھ کہ سلطنت اور حکومت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور جب وہ چاہتا ہے چھین لیتا ہے، پس جس وقت اللہ تعالیٰ اپنے عطائے ربانی سے اختیار اور دبدبہ شاہی عطا فرمائے تو ہم کو اس کی نعمت کا

شارا دا کرنا اور اس کی پاک مرضی کا پورا کرنا واجب ہے اور وہ اصلی غرض یہ ہے کہ ہم تمام مخلوقات کے ساتھ نیکی کریں اور خصوصًا ان کے ساتھ جن کو ہماری حفاظت میں تفویض کیا ہے، امیر اور غریب کے ساتھ برابر عدل کر، ظلم روا مت رکھ اس لئے کہ ظلم تباہی کا دروازہ کھولتا ہے اپنی رعایا اور نوکروں پر مہربان رہ۔ اس لئے کہ ہم سب ایک خالق کی مخلوق ہیں، اور حکومت ممالک و امصار کی انھیں اشخاص کے سپرد کر جو صفات پسندیدہ رکھتے ہوں، اور ایسے وزرا کو بے رحمی سے سزا دینا چاہئے جو بے فائدہ اور بے قاعدہ محصولات سے رعایا کو تنگ کریں..... اور رعایا کی رضا جوئی سے غافل مت ہو، اس لئے کہ ان کی محبت سے ملک کی حفاظت ہے اور ان کی ناراضگی میں ضرر ہے ان کی حقارت باعث زوال سلطنت ہے اور کاشتکاروں کی خبر گیری رکھنا چاہئے، جو ہماری روزی کے واسطے زمین سے غلہ نکالتے ہیں، خلاصہ یہ کہ اپنا طریقہ ایسا رکھنا چاہئے کہ رعایا دعا گو رہے اور ہماری حفاظت کے سایہ میں بخوشی زندگی بسر کرے..... اگر تم اس پر عمل کروگے جو میں نے بیان کیا ہے تو تم خوش حال رہوگے اور جو زمین کے نامور بادشاہ ہیں ان کے مانند تم کو دبدبہ اور سطوت حاصل ہوگا"

(خلافت ہسپانیہ ص۱۱۶)

یہ نصیحت ایک باپ نے مرتے وقت اپنے عزیز ترین فرزند کو کی ہے یہ نصیحت جس قدر بیش قیمت ہے اس کی کوئی مثال نہیں، آج کل کے فرمانرواؤں کو چاہئے کہ اس نصیحت کو سونے کی تختی پر کندہ کروا کر اپنے سرہانے لٹکائیں اور سوتے جاگتے ایک مرتبہ پڑھ لیا کریں۔

سلطان کی رعایا پروری

یہ سلطان وقت جس کی نصیحت اوپر درج ہوئی خود بھی بڑے عمل صالح کا

مالک تھا، اس کا حال یہ تھا کہ معمولی لباس پہن کر قرطبہ کی گلیوں میں چکر لگاتا۔ غریبوں کے گھر پر جا کر ملاقات کرتا، کوئی بیمار ہوتا تو اس کی عیادت کو تشریف لے جاتا اور خود غریبوں کے یہاں پہنچ کر ان کی ضرورتوں کو پورا کرتا، برسات کی اندھیری رات میں چپکے سے نکل جاتا اور بے کس بیمار کی رات بھر تیمارداری کرتا اسے کھلاتا اور پھر صبح کو چپکے واپس چلا آتا۔

سلطان الحکم کی خدا ترسی

بہرحال ہشام کی اس نصیحت کا الحکم نے بڑا اثر لیا، چنانچہ یہ اپنے اداء، وشمائل میں محبوب تھا، انصاف پسندی اور عدل پروری اس کا خاص شیوہ تھا، ایک واقعہ ملاحظہ کیجئے۔

"دانقا قیرۂ لیفہ الحکم نے محل کی توسیع میں ایک غریب بیوہ کی جائداد آگئی، اس سے کہا بھی گیا کہ اس جائداد کو معقول داموں میں علیحدہ کر دے مگر موروثی جائداد کی وجہ سے اس نے انکار کر دیا مگر میر عمارت نے زبردستی وہ زمین لے لی اور بنگلہ تعمیر ہو گیا، اس عورت نے قاضی کے روبرو استغاثہ پیش کیا قاضی نے فرمایا تو تامل کریں انصاف سے کام لوں گا"

قاضی کی حکمت عملی

جس روز خلیفہ الحکم پہلے پہل مکان اور باغ ملاحظہ کرنے گیا قاضی بھی خبر پا کر پہنچ گئے ایک گدھا معہ خالی بورے کے ہمراہ لیا، الحکم کا سامنا ہوا تو قاضی صاحب نے کہا:۔

"امیر المومنین! اس زمین کی مٹی مجھے چاہیئے، اجازت ہو تو لے لوں خلیفہ نے مسکرا کر اجازت دے دی، قاضی نے بورا مٹی سے بھر لیا اور خلیفہ سے درخواست کی کہ مجھ کو اس گدھے پر بورے رکھنے میں حضور ذرا معاونت

فرمائیں۔ خلیفہ قاضی کی اس حرکت کو مزاح سمجھ رہا تھا، چنانچہ بورا ہر دو اٹھانے لگے مگر بھاری وزن تھا اٹھ نہ سکا، خلیفہ ہانپ گئے، قاضی نے کہا، سرکار! اس بوجھ کو تو آپ اٹھا نہ سکے تو انصاف (قیامت) کے دن کو یہ جو زمین بڑھیا کی ضبط کرلی گئی ہے وہ کس طرح اٹھائیے گا، کیونکہ خدا کے سامنے وہ بڑھیا دعویٰ ضرور کرے گی۔ ۔۔۔ شاہ الحکم آبدیدہ ہوگیا، اور میر عمارت کو حکم دیا کہ فوراً بڑھیا کی زمین واپس کردو اور محل کا وہ حصہ جو ہے مع ساز و سامان کے میں نے اس کو دے دیا"

(خلافت ہسپانیہ ص۲۶۷،۲۶۶)

یہ تھا خوف خدا، اس فرد کے دل میں جو اپنے وقت کا جلیل القدر بادشاہ تھا اور یہ انصاف و عدل تھا، اس انسان کا، جس کو ہر طرح کی دنیاوی طاقت و قدرت حاصل تھی اور قاضی صاحب کی حق گوئی اور معاملہ فہمی پر بھی بار بار غور کیجئے جو ہمارے علماء کرام کے لئے عبرت و بصیرت کا خزینہ ہے۔

سلطان عبدالرحمٰن ثانی کا فتویٰ پر عمل

الحکم کا بیٹا عبدالرحمٰن ثانی المتوفی ۲۳۸ھ اپنے باپ کی موت کے بعد تخت پر جلوہ افروز ہوا، اس کے کارنامے بھی تاریخ میں بہت مشہور ہیں ایک ذاتی واقعہ ان کا بھی سن لیجئے :۔

"ایک دن سلطان نے علماء کے سامنے امام یحیٰی سے مخاطب ہوکر کہا، مجھ سے یہ خطا سرزد ہوئی ہے کہ میں رمضان میں دن کو محل میں چلا گیا اس کا کفارہ کس طرح ممکن ہے، یحیٰی نے تمام علماء کے سامنے کہا دو ماہ متواتر روزے رکھو تو البتہ تمہاری بخشش کی صورت ہوسکتی ہے، حاضرین یہ سن کر خاموش ہوگئے، جب علماء دربار سے اٹھ آئے، تو یحیٰی سے پوچھا کیا امام مالکؒ نے اس کفارہ کا کچھ بدل بھی بتایا یا نہیں، جواب دیا معاوضہ

ضرور ہے لیکن اگر میں سلطان کو اس سخت سزا کا معاوضہ بتا دیتا تو اس کو مکرر اس گناہ کے کرنے کی جرأت ہوتی اس پابند شرع بادشاہ کی ہمت کو دیکھنا چاہئے کہ اس نے امام یحییٰ کے حکم کی پوری تعمیل کی ۔"

(خلافت ہسپانیہ ص)

اس کو کہتے ہیں خشیت الٰہی، اور اس کا نام دینداری ہے، با ایں ہمہ جاہ و حشمت جب عالم نے فتویٰ دیا تو سلطان نے بے چوں و چرا پورا پورا عمل کیا، سلطنت کا غرور بھی شریعت میں ایں واں پیدا نہ کر سکا، حق ہے اگر یہ سلطان وقت تھا اللہ تعالیٰ اس کی روح کو سکون میں رکھے،

قاضی کی تنبیہ کے بعد خلیفہ کی نماز جامع مسجد میں

عبد الرحمٰن الناصر المتوفی ۳۵۰ھ اندلس کا بڑا نامی گرامی خلیفہ گذرا ہے، اس کے زمانہ میں صنعت و حرفت کو بڑی ترقی ہوئی، مدینۃ الزہرا کی عالیشان عمارت اس کی ہی بنوائی ہوئی تھی جو بے مثل عمارت تھی، اس طرح کی عمارت کا آج کل تصور بھی مشکل ہے اس مدینۃ الزہرا کی رنگینی نے بادشاہ کو جمعہ میں جامع مسجد کی حاضری سے کچھ دنوں روک دیا قصر ہی کی مسجد میں جمعہ کی نماز بھی پڑھ لیا کرتا تھا، چند جمعوں کی غیر حاضری کے بعد جب ایک جمعہ میں وہ تشریف لائے تو قاضی المنذر کا سامنا ہو گیا، جو جامع مسجد کے امام تھے قاضی صاحب نے خطبہ میں ایسی سخت تہدید و تنبیہ فرمائی کہ بادشاہ کی گردن ندامت سے لوٹ گئی اور پھر اس کے بعد بادشاہ کبھی بھی غیر حاضر نہ رہا۔

قحط سالی کے زمانہ میں سلطان کی دعا کا اثر

اسی سلطان الناصر کے عہد میں ایک دفعہ بارش رک گئی جس کی

وجہ سے مخلوق پریشان ہوئی جب کچھ دنوں تک امساکِ باراں کا یہی حال رہا تو نماز استسقاء کے لئے لاکھوں آدمی نکل کھڑے ہوئے، قاضی صاحب موصوف بھی تشریف لے گئے اور بادشاہ سلامت بھی۔

"والئی المنذر ایک بلند مقام پر کھڑے مجمع کو دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے کہا، جلالت مآب تشریف لا رہے ہیں، قاضی نے بے رخی سے کہا یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ مدینۃ الزہرا میں آرام کریں، کسی ندیم نے یہ فقرہ الناصر سے جا لگایا، وہ سن کر بے اختیار رونے لگا، عمامہ اتار کر زمین پر ڈال دیا، برہنہ سر، برہنہ پیر، یہ حال کیا، بارگاہ غفور الرحیم میں گڑگڑا کر عرض کرنے لگا کہ الٰہی! میرے گناہوں کی پاداش میں میری رعایا کو کیوں ستاتا ہے مجھ کو سزا دے لیکن میری رعایا کی تکالیف دور کر دے۔"

الناصر کا حال روتے روتے بے حال ہو گیا ڈاڑھی جو آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی اب سرخ بجری سے لت پت ہو گئی، المنذر نے اس کی الحاح وزاری سن کر کہا، کہ :۔

"مسلمانو! ذرا اور خضوع وخشوع سے دعا مانگو بابِ رحمت کھلنے والا ہے کیونکہ جب جبار دنیا سے عجز وانکسار ظاہر ہوتا ہے تو جبار آسماں کو رحم آتا ہے۔" (خلافت ہسپانیہ صفحہ)

لوگ ابھی میدان ہی میں تھے رحمتِ باراں شروع ہو گئی۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے شاہ وقت کا خضوع وخشوع۔ ظاہری اعمال جو کچھ ہوں مگر ان کے دل کتنے صاف اور پاکیزہ تھے ذرا سی بات نے بجلی کا اثر پیدا کر دیا اور رقت جب طاری ہوئی تو لوگ دیکھ کر متحیر رہ گئے، دعا میں اس نے کتنا سچ اعتراف کیا اور جب اس نے اپنے جرم کا اقرار کر کے دعا کی تو دعا بھی کتنی جلد قبولِ بارگاہ ہوئی۔

⁂ ⁂ ⁂

مسلمانانِ عالم کی ذمہ داری

اس موقع سے ایک بات عرض کرنے کو جی چاہتا ہے ممکن ہے میرا یہ خیال درست نہ ہو مگر میرے دل میں جو بات آئی اسے بھی سن لیجئے اپنا خیال ہے کہ موجودہ دور میں دنیا میں جتنے شر و فتن پیدا ہو رہے ہیں مصائب کے طوفان جس طرح امنڈ رہے ہیں، آفات کے سمندر میں جو تلاطم برپا ہے اور کائناتِ انسانی میں جو ہنگامہ آئے دن ہوتا رہتا ہے یہ سب مسلمانانِ عالم کے گناہوں کا نتیجہ ہے، اور بلاشبہ یہ تمام فرزندانِ توحید کی بے راہ روی اور بداعمالیوں کا ثمرہ ہے، ان کو خدائے ذوالجلال والاکرام کے آگے گڑگڑا کر رونا چاہئے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہئے اگر ان کے گناہ معاف ہو گئے تو کائناتِ انسانی میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ جائے گی، اے کاش مسلمان قوم اپنی حیثیت اور پوزیشن کا یقین پیدا کرتی۔

الحکم ثانی کا کتب خانہ اور ذوقِ مطالعہ

انہی الناصر کے فرزند تھے، الحکم ثانی المستنصر باللہ المتوفی ۳۶۵ھ بادشاہ بڑا علم دوست گذرا ہے، کتابوں کے جمع کرنے کا اس کو بے حد شوق تھا اور اس سلسلہ میں ایک پورا محکمہ اس نے قائم کر رکھا تھا جو رات دن اس کام میں مصروف رہتا اور مختلف شہروں میں اس کے کارندے پھیلے ہوئے تھے اس کے کتب خانہ کا حال سنئے:۔

"المستنصر باللہ کے کتب خانہ کی فہرست چوالیس جلدوں میں تھی اور ہر جلد میں پچاس ورق تھے، ان جلدوں میں صرف کتابوں کے نام لکھے ہوئے تھے، بعض مصنفوں نے لکھا ہے کہ کتابوں کی تعداد چار لاکھ اور بقول بعض چھ لاکھ تھی، اور تمام کتابوں کو الحکم (ثانی) نے خود

پڑھا تھا ان میں اکثر پر حواشی الحکم نے نہایت محنت سے لکھے تھے"

(خلافت ہسپانیہ ص۱۰۱)

یہ ہے دسویں صدی عیسوی اور چوتھی صدی ہجری کے ایک سلطان وقت کا ذوق علمی، کیوں اس زمانہ میں کوئی حکمراں اس کی مثال پیش کرسکتا ہے، اقرار کرنا پڑتا ہے صحیح معنی میں یہ حضرات حق حکومت ادا کرتے تھے، حکمرانی کے ساتھ ساتھ یہ ذوق علمی قابل صد مبارکباد ہے۔

وزیر اعظم کا جذبہ جہاد

المنصور المتوفی ۳۹۲ھ اندلس کا حاجب یعنی وزیر اعظم تھا، اپنے وقت کا بڑا عالم اور حکومت کے کاموں سے بڑا واقف کار تھا بادشاہ وقت کو اپنے ہاتھ میں لئے رہتا، اس کا جذبۂ دین ملاحظہ کیجئے:۔

"اس (المنصور) نے اپنی ۳۶ سالہ عہد حجابت میں تقریباً پچاس جہاد کئے ادھر جنگ سے واپس آکر اپنے کپڑوں کی خاک جھڑوا کر جمع کرتا جاتا تھا کہ بوقت تجہیز وتکفین یہ مٹی اس کے چہرے پر چھڑک دی جائے، تاکہ شاید اس کی شرم میں خدا اس کی شفاعت کردے، اس نے اپنے خاص آبائی کھیت کی روئی سے اپنی لڑکیوں سے سوت کتوا کر کفن تیار کرایا تھا، جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا" (ایضاً ص۱۱۱)

اس کو کہتے ہیں راسخ العقیدہ مسلمان، اور انہی جذبہ دینی کا نام ایمان ہے، آخرت کی یہ فکر ہم سب کے لئے باعث عبرت وبصیرت ہے کتنی تمنا تھی کہ خاتمہ بالخیر ہو، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں بخش دیئے جائیں خدا کرے یہ جذبۂ غیرت وحمیت تمام مسلمانوں میں پیدا ہو اور سب کو اپنی آخری گھڑی کی فکر بے چین کئے ہو، اتنی زبردست حکومت کا وزیر اعظم اور اندلس میں یہ اثر ورسوخ اور پھر قلب کا یہ حال جو بے چین

رکھتا تھا۔ اللّٰھم اغفر لہ۔

منصور کا انصاف

انہی منصور کے متعلق مورخین کا فیصلہ ہے کہ صادق العمل، فیاض اور عادل تھا، ڈوزی لکھتا ہے :۔

"منصور کا انصاف ضرب المثل ہو گیا تھا، ایک مرتبہ عوام الناس میں سے ایک شخص منصور کے سامنے آیا اور کہا، اے مظلوموں کے دادرس اس آدمی نے جو حضور کے پیچھے کھڑا ہے مجھ پر ظلم کیا ہے، عدالت نے طلب کیا، تو گیا نہیں، منصور کے پیچھے صقلبی سپر بردار تھا، جس پر منصور بہت مہربان تھا مگر فریادی سے تفصیل سننے کے بعد منصور نے حکم دیا ..... کہ قاضی عبدالرحمٰن بن فوطس سے جا کر کہو کہ اس معاملہ میں فیصلہ کریں، اور حق و انصاف ملحوظ رہے، قاضی نے مدعی کے حق میں فیصلہ دیا، مدعی منصور کے پاس آکر شکریہ ادا کرنے لگا، منصور نے کہا شکریہ کی ضرورت نہیں تمہارا انصاف ہو گیا اور تم کو اطمینان ہو گیا، مگر مجھے ابھی اطمینان نہیں ہوا کیونکہ مجھے اس نالائق صقلبی کو سزا دینی ہے جس نے باوجود اس کے کہ میرا ملازم تھا ایک ذلیل کام کرنے میں شرم نہ کی"

(خلافت ہسپانیہ ص۱۲۷)

کہاں ہیں آج کل کے حکمراں جن کے ملازم رات دن عوام پر ظلم ڈھاتے پھرتے ہیں، مگر ان کو اس لئے معاف کر دیا جاتا ہے کہ سرکاری آدمی ہے، عبرت و بصیرت کا کوئی سبق اس میں ان کے لئے ہے تو وہ اس کے حصول کی سعی پیہم کریں اس واقعہ کو سامنے رکھ کر موجودہ حالات میں کہنا پڑتا ہے

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

خلیفہ منصور کے بعد اندلس کا حالِ زار

اس منصور کے مرتے ہی اندلس میں طوفانِ بدتمیزی کا زور ہوا، خانہ جنگی برابر بڑھتی رہی، سلاطین کے اعمال و اخلاق اچھے نہ رہے، قتل وخونریزی شروع ہوگئی، جب حکمرانوں کے دل پاک نہ رہے قلب کی صفائی جاتی رہی، خوفِ خدا باقی نہ رہا اور یہی بگڑ گئے تو عوام اور پبلک بھی زوال میں رہ گئی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا تھا کہ پہلے بادشاہ بگڑتے ہیں، اور اس کے اعمال واخلاق میں زوال آتا ہے تو پھر رعایا اور پبلک بھی تباہی و بربادی اور ہر طرح کی برائیوں میں مبتلا ہوجاتی ہے چنانچہ یہی معاملہ پیش آیا۔ اندلس کی اتنی عظیم الشان اور بااقتدار حکومت بتدریج ختم ہوگئی، اور نصاریٰ نے وہاں کے مسلمانوں کا صفایا کردیا، لاکھوں مسلمان تہِ تیغ کئے گئے، لاکھوں کو جلایا گیا، ہزاروں پر دباؤ ڈال کر مذہب بدلوایا گیا، ہزاروں پہاڑوں اور جنگلوں کی طرف چل بسے اور وہ ملک جو سیکڑوں سال مسلمانوں کے زیرِ نگیں رہا تھا اور ان کے تمدن و تہذیب کا مرکز رہ چکا تھا عیسائی خونخواروں کے ہاتھوں ملیا میٹ ہوگیا، ہزاروں مسجدیں گرجا بنائی گئیں کتنی برباد کردی گئیں، اندلس کا مدینۃ الزہرا، الحمراء، جامع قرطبہ اور دوسری ہزاروں عمارتیں جو روئے زمین پر اپنی مثال نہ رکھتی تھیں ہمارے قبضہ سے اغیار کے قبضہ میں چلی گئیں۔

دین کا دامن چھوڑنے کا انجام

قلم میں کہاں طاقت ہے کہ جو اندلس کا خونچکاں افسانہ لکھ سکے، اور اس وقت اور بھی جبکہ ہمارا مقصد یہ نہیں ہے بلکہ بتانا یہ ہے کہ جب تک ہم میں عدل وانصاف، خشیتِ الٰہی اور علم، پاکیزگیٔ قلب اور آپس کی باہمی

صحت رہی ہم میں صفات محمودہ اور خصائل پسندیدہ رہے، ہم نے شان و شوکت سے حکومت کی، اور جب ہم میں اسلام سے بُعد، دین محمدی سے بے راہ روی قول و عمل کا تضاد، قرآن و حدیث سے عدم شغف، باہمی یکجہتی کا فقدان، قلب کی پاکیزگی کا قحط اور ایمان کی پختگی کا زوال ہوا قدرت نے ہم کو ذلت کے ساتھ زندہ دفن کر دیا۔

بعض خلفائے عباسی کے حالات زندگی

اب تاریخ ملت جلد پنجم (خلافت بنی عباس) کے چند واقعات سنئے کوئی شبہ نہیں کہ خلفائے بنی عباس نے شروع میں بڑی خونریزیاں کیں۔ سفاح اور منصور کا زمانہ اس نقطۂ نظر سے جب ہم نے پڑھا تو بے ساختہ زبان پر آیا، دنیا کی بدترین چیز بادشاہت ہے اور یہ حکمراں طبقہ کے لئے منجانب اللہ عذاب ہے، مگر ذاتی حالات و کمالات کا جہاں تک تعلق ہے ان کی زندگی بہت پاکیزہ ہے، اور ان کے دل بڑی حد تک صاف ہیں اور ہم اس وقت اسی حصہ کو بیان کریں گے۔

خلیفہ ابوجعفر منصور کے مظالم

عباسی حکومت کا دوسرا خلیفہ ابوجعفر منصور المتوفی ۱۵۸ھ بائیس برس تک اس نے بڑی شان و شکوہ سے حکومت کی، منصور کی زندگی کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے امام اعظمؒ کو قاضی القضاۃ بنانا چاہا اور آپ نے جب اس عہدہ کی قبولیت سے انکار کر دیا تو منصور نے آپ کو جیل میں ڈال دیا جہاں آپ نے اپنی آخری سانس گذار دی اور اپنے مولائے حقیقی سے جاملے اور اسی منصور کی حکومت میں اہل مدینہ پر ظلم و ستم ہوا،

اور ساتھ ہی امام مالکؒ کو اس کے چچا زاد بھائی نے ذلت سے بلوایا اور ستر کوڑے لگوائے، گو منصور کو اس واقعہ سے رنج بھی ہوا اور دوسرا پہلو اس کی زندگی کا یہ ہے جس کو حکومت سے کوئی تعلق نہیں یا تعلق ہے تو ذاتی اوصاف کا حامل بھی ہے۔

ابو جعفر منصور کے ذاتی اوصاف

"ابو جعفر منصور کا معمول تھا کہ صبح کی نماز باجماعت پڑھتا، بعد ازاں دربار خلافت میں رونق افروز ہوتا اور امور سلطنت کو انجام دیتا۔ بالالتزام دفتر دیکھتا، حکام کی تبدیلی، راستوں کی حفاظت، رعایا کی آسائش، اور تعلیم کا انتظام کرتا، اس کے بعد قیلولہ کرتا، بعد ازاں ظہر کی نماز باجماعت ادا کرتا، جب عصر کا وقت آتا تو نماز کے بعد خاص اجلاس کرتا، جس میں تمام سادات بنی ہاشم کے معاملات طے کرتا۔ اس کے بعد نماز مغرب باجماعت پڑھ کر کھانا تناول فرماتا، جب عشاء کا وقت آتا تو نماز باجماعت پڑھ کر ڈاک دیکھتا اور اطراف و جوانب سے خطوط اور عرضیاں جو آتیں، ان کا جواب دیتا، بعد ازاں سمارہ سے گفتگو کرتا اور مشورہ لیتا، جب ایک تہائی رات گذر جاتی تو آرام کرتا، پھر تہجد کے لئے اٹھتا، نماز فجر تک عبادت میں مشغول رہتا، نماز فجر مسجد میں آکر خود پڑھاتا، پھر بدستور دربار میں رونق افروز ہوتا۔"

(خلافت بنی عباس ص۱۱۹ ج۱)

قابل صد رشک ہے یہ زندگی، اندازہ لگایئے یہ ایک بادشاہِ وقت کے معمولات ہیں، ذاتی زندگی کس قدر پاکیزہ اور ستھری ہے جماعت اور مسجد کی کتنی پابندی ہے تہجد اور وظائف کا یہ منظر کس قدر دلکش ہے کیا یہ چیزیں اس کی خدا ترسی کو نہیں بتاتیں، امور مملکت میں اتنا سخت

نظر آتا ہے اور خود احکم الحاکمین کے آگے اس قدر عاجز و ذلیل ۔

امور مملکت کے چار ارکان

ان معمولات کے ساتھ امورِ مملکت میں اس کا یہ قول دیکھئے :۔

"منصور کا قول تھا، حکومت کے عناصر ترکیبی میں چار عناصر نہایت اہم ہیں۔ ان کا انتخاب بہت غور سے کرنا چاہیئے (۱) قاضی جو نہایت بیباک ہو اور نڈر ہو، جو دنیا کی کسی طاقت سے مرعوب نہ ہو سکے، (۲) پولیس کا افسر جس میں کمزور کی حمایت اور طاقتور کے بل نکال دینے کی قوت ہو، (۳) خراج کا افسر جو نہایت دیانت دار ہو، ظلم و جور سے اس کو طبعی نفرت ہو، (۴) ڈاک کے افسر اس کو بڑی اہمیت سے کہا تھا، جو صحیح حالات سے بے کم و کاست اطلاع دے، اور اپنی طرف سے کوئی کتر بیونت نہ کرے۔"

(خلافت بنی عباس صہ۲ﷲ)

کسی بادشاہ وقت کا یہ قول کیا بتاتا ہے، ممکن ہے اس کا عمل اس پر نہ ہو، مگر اس کے دل کی کیا ترجمانی ہوتی ہے کیا یہ چیزیں آج بھی اتنی ہی ضروری نہیں ہیں، جتنی کل تھیں، سلطان وقت کا یہ دل و دماغ، ہر ایک حکمران کے لئے قابل تقلید ہے، کاش اس زمانہ میں ان موتیوں کی قدر و عزت کا ہمیں یقین ہو جائے۔

گورنر حضرموت کو تنبیہ اور اسکی معزولی

اسی منصور خلیفہ کا واقعہ ہے کہ اس کو کسی طرح یہ اطلاع ثبوت کے ساتھ مل گئی کہ حضرموت کا گورنر بکثرت شکار کھیلا کرتا ہے اور اسی کو اس نے اپنا مشغلہ بنا لیا ہے اس خبر نے منصور کو چراغ پا کر دیا اور فوراً گورنر حضرموت کو لکھا۔

"کم بخت یہ ساز و سامان وحشی جانوروں پر صرف کرنے کے لئے نہیں

ہے، تیرو لمان کے مصارف مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں صرف کرنے کے لئے ہے اور تو اسے جنگلی جانوروں پر صرف کر رہا ہے تو فلاں بن فلاں کو اپنی گورنری کا چارج دیدے خدا تجھے اور تیرے خاندان کو برباد کرے گا" (خلافت بنی عباس ص ۱۲)

یہ تھی عزت قومی سامان کی۔ آج کل کے گورنر اور وزراء کو یہ واقعہ غور و فکر سے پڑھنا چاہئے، اور قومی مفاد کی اہمیت کا اندازہ لگانا چاہئے

منصور کی اپنے بیٹے کو وصیت

منصور نے اپنی وفات کے وقت اپنے ولی عہد ابو عبداللہ مہدی کو وصیت کی تھی، اس وصیت کا کچھ حصہ غور و فکر کی نظر سے پڑھئے۔

"ابو عبداللہ! بادشاہ کی اصلاح نہیں ہوتی مگر تقویٰ سے۔ رعایا اچھی نہیں ہوتی مگر فرمانبرداری سے، شہر آباد نہیں ہوتا مگر انصاف سے..... سب آدمیوں میں عاجز ترین وہ شخص ہے جو اپنے سے کم درجے کے آدمیوں پر ظلم کرے"

ان بیش بہا موتیوں کو دیکھئے، ان کی کوئی قیمت ادا کر سکتا ہے۔ ان کے کہنے والا سیکڑوں سال گذرے چل بسا، مگر ان اقوال کو موت نہیں آسکتی دنیا تک نقش رہیں گے۔

منصور کا علم و فضل مسلم ہے۔ حضرت امام مالکؒ نے اس کے علم و فضل کی تعریف کی ہے اور اس کو بڑا ذی علم مانا ہے، یہ علم حدیث کے شوقین ہی تھے، چنانچہ بغداد سے ولی عہد مہدی، امام مالکؒ کی خدمت میں مدینہ منورہ بھیجا گیا۔

خلیفہ وقت کی تمنا

محمد بن سلام کا بیان ہے کہ ایک شخص نے خلیفہ منصور سے دریافت

کیا کہ واہب العطایا نے دین و دنیا کی ساری نعمتیں امیر المومنین کو عطا فرمائی ہیں، کیا آپ کی کوئی ایسی آرزو اور بھی ہے جو اب تک پوری نہ ہوئی ہو؟ منصور نے کہا ہاں صرف ایک تمنا باقی ہے جو آج تک پوری نہیں ہوئی اور وہ یہ ہے کہ میں ایک چبوترے پر بیٹھا ہوں اور اصحاب حدیث میرے ارد گرد بیٹھے ہوں۔" (خلافت ابن عباس ص۱۲۰ ج۱)

قربان جائیے اس ذوق حدیث کے اور خلیفہ وقت کی اس تمنا کے۔ کہاں ہیں آج کل کے اہل علم اور صاحب فضل و کمال عبرت و بصیرت کے اس خزینہ سے دامن بھرلیں۔

منصور کی زندگی ناز و نعمت کے شباب میں بھی زہد و قناعت سے آراستہ رہی، امام جعفر صادق کو جب یہ خبر ہوئی کہ منصور ہروقت جبہ" پہنتا ہے اور اس کی قمیص میں پیوند لگے رہتے ہیں تو انھوں نے برجستہ فرمایا" پاک ہے وہ ذات جس نے اسے بادشاہت عطا کرنے کے باوجود فقر و فاقہ کی معیشت نصیب کی۔"

خلیفہ منصور کا ایک عبرت انگیز واقعہ

ابن خلدون کے حوالہ سے لکھا ہے:۔

"کہ وہ اپنے اہل و عیال کے لئے بیت المال سے نئے کپڑے بنوانے سے بھی احتراز کرتا تھا، ایک مرتبہ اپنے اہل و عیال کے کپڑوں میں پیوند لگوانے کے متعلق درزی سے مشورہ کر رہا تھا، اتنے میں شاہزادہ مہدی وہاں آپہنچا، مہدی رفعہ دوزی میں کسرشان سمجھ کر کہنے لگا، امیر المومنین اس سال گھروالوں کے کپڑے میں اپنی تنخواہ سے بنوا دیتا ہوں، آپ پرانے کپڑے کو رہنے دیجئے، منصور نے اس تجویز کو تو منظور کرلیا، لیکن اموالِ مسلمین سے اپنے اہل و عیال

کے لئے نئے کپڑے بنوانے منظور نہ کئے ۔

امیرالمؤمنین پھٹی اور پیوند لگی قمیص میں

اسی منصور کا واقعہ ہے کہ ایک دن ان کی لونڈی کہنے لگی دیکھو تو امیرالمومنین ہو کر پھٹی اور پیوند لگی قمیص پہنتے ہیں، کسی اور نے طعن سے یہ کہا :-

"خدا کی قدرت ہے کہ اس نے خلیفہ منصور کو بادشاہت کے باوجود افلاس میں مبتلا کر رکھا ہے ۔"

مگر یہ بخل کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ حق المسلمین کی وجہ سے۔ ورنہ یہی خلیفہ منصور ہے جس نے قاضی مدینہ کو اس صلہ میں پچاس ہزار روپے عطا کئے تھے کہ اس نے خلیفہ کے مقابلہ میں شتر بانوں کے حق میں فیصلہ دیا تھا، جو عقل و انصاف کا تقاضہ تھا، اسی طرح امام مالک کی خدمت میں انھوں نے چھ ہزار دینار سے زیادہ نذرانے پیش کئے، اور اسی قدر آپ کے صاحبزادہ اور ابن سمعان کو بھی مرحمت فرمایا تھا، حاجتمندوں نے بھی منصور سے بہت کچھ پایا، اور شعرا بھی محروم نہ رہے ۔

قتل کے بجائے گورنری

منصور عباسی کا انصاف و عدل تاریخ میں مشہور رہے ، اگر دشمن کے متعلق معلوم ہوجاتا کہ وہ یہ کام نیک نیتی سے کرتا ہے تو اس کو معاف کر دیتا بلکہ اس کی قدر کرتا، ایک دفعہ عامل ہمدان کو لکھ بھیجا کہ ابونصر کو قتل کر دو، اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے سلطان کے دشمن کی امداد کی تھی مگر کسی طرح بچ کر دارالخلافہ میں پہنچ گیا، تو :-

"خلیفہ اس کو ملامت کرنے لگا کہ تم نے ابومسلم کو خراسان جانے کا کیوں مشورہ دیا، ابونصر عرض پیرا ہوا، امیرالمؤمنین ! واقعی ابومسلم نے

مجھ سے صلاح لی تھی اور میں نے اسے نیک مشورہ دیا تھا، اور ہر مسلمان کا فرض ہے، کہ جب کوئی اس سے صلاح پوچھے تو اس کو نیک نیتی کے ساتھ ایسی صحیح رائے دے جو اس کے حال و مآل کے لئے بہتر ہو، اگر امیر المومنین بھی کسی امر میں مجھ سے مشورہ کریں تو میں نیک اور خیر خواہانہ مشورہ سے دریغ نہ کروں گا، گو میرا مشورہ امیرالمومنین کے اغراض و مفاد کے خلاف تھا لیکن اس شخص کے لئے تو سود مند ہی تھا، جس نے میری رائے دریافت کی تھی۔

منصور نے یہ سن کر نہ صرف اس کی جرم بخشی کر دی بلکہ اس کو بدرجۂ کمال عواطفِ خسروی سے ممتاز فرمایا، اور اس کے خلوصِ نیت پر اتنا خوش ہوا کہ اس کو ولایت موصل کا گورنر بنا کے بھیج دیا۔" (خلافت بنی عباس ص ۱۲۸ تا ۱۲۹ / ۱۷۰)

حق یہ ہے کہ منصور نے انصاف کا حق ادا کر دیا، اس واقعہ میں موجودہ حکام، وزراء، اور افسران حکومت کے لیے بڑی بصیرت ہے، کاش وہ حاصل کریں، کسی بھی ملک کے حکمراں کی یہ صفت اس کی حکومت کی ترقی و عروج کی ضامن ہو سکتی ہے

خلیفۂ وقت پر شتربانوں کی نالش اور قاضی کا فیصلہ

"نمیر مدنی کا بیان ہے کہ جن دنوں منصور مدینہ منورہ آیا، محمد بن عمران طلحی وہاں کے قاضی اور میں ان کا محرر تھا، چند شتربانوں نے کسی معاملہ میں خلیفہ پر نالش کر دی، قاضی محمد نے مجھے حکم دیا کہ امیرالمومنین منصور کے نام حاضریِ عدالت کا حکم جاری کرو، تاکہ مدعیوں کی دادرسی کی جائے، میں نے خلیفہ کو سمن بھیجنے سے معذرت چاہی، مگر قاضی صاحب نے اس پر اپنی مہر لگائی اور مجھ سے فرمایا، کہ اس حکم کو امیرالمومنین کے پاس تم خود دے جاؤ، چنانچہ میں روانہ ہوا، جب منصور کے پاس حاضر ہو کر یہ حکم دکھایا، تو معًا دربار میں کھڑا ہو گیا، اور حاضرین سے کہنے لگا، کہ میں عدالت میں طلب ہوا ہوں،

تم میں سے کوئی شخص میرے ساتھ نہ آئے، پس خلیفہ اور میں دارالقضاۃ میں پہنچے، قاضی صاحب تعظیم کے لئے نہ اٹھے، بلکہ اپنے چغہ کو اچھی طرح پھیلا دیا اور بڑے استقلال کے ساتھ بیٹھے رہے، پھر مدعی کو بلایا اور ثبوت لے کر خلیفہ کے خلاف مقدمہ کا فیصلہ کر دیا۔"

(خلافت بنی عباس ص۱۳۱)

کہاں ہیں کمیونزم کے پرستار، غور کریں، اس طرح کا انصاف وہ کرا سکتے ہیں؟ اور کسی مدعیِ جمہوریت کو ایسے انصاف کا وہم بھی ہو سکتا ہے؟ حکومت کا نظام عدل صحیح معنی میں یہی تھا، جہاں کسی کی پرواہ نہ ہوتی تھی، حق برملا کہا جاتا تھا، کوئی یہ خیال نہ باندھے کہ منصور نے آگے چل کر قاضی صاحب سے بدلہ وصول کیا ہوگا یا شتربانوں کو پھنسا کر پریشان کیا ہوگا، ایسی بات ہرگز نہ ہوئی بلکہ فیصلہ سننے کے بعد منصور کی زبان پر یہ کلمات تھے:-

"خدا تمہیں اس انصاف پسندی کا اجر دے، اور خوش ہو کر قاضی کو دس ہزار دینار دیئے۔"

قاضی، جج بھی اس زمانے کے واقعی قاضی ہوتے تھے کبھی کسی کی پرواہ نہ کی، ایک دو دفعہ منصور نے آزمائش کے طور پر لکھ بھیجا کہ فلاں مقدمہ میں فوجی افسر کے حق میں فیصلہ دو، قاضی نے صاف انکار کر دیا کہ یہ مجھ سے کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

حکومت کے حساب کتاب میں سختی

حکومت کے حساب کتاب میں بھی منصور بڑا سخت تھا، بیت المال کا ایک پیسہ بھی کسی افسر کو معاف نہیں کرتا، اس سلسلہ کا ایک واقعہ ملاحظہ کے قابل ہے:-

"جب بغداد کی تعمیر ختم ہوئی تو تعمیرات کے افسروں سے حساب لیا گیا

..... ابن صلت کے پاس پندرہ درہم (تقریباً پونے چار روپے) تحویل میں باقی رہے تھے، چونکہ اس نے یہ رقم ادا نہ کی، اس کو قید کر دیا۔"
(خلافت بنی عباس ج۱ ص۱۳۶)

خلیفہ وقت کی سادگی اور اس کا اثاثہ

منصور کی زندگی کا یہ واقعہ بھی پڑھنے کے لائق ہے :-
"محمد بن سلیمان عباسی ایک روز بغرض عیادت امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے، خلیفہ خاص محل میں تھا دیکھا ایک چھوٹا سا کمرہ ہے ..... کمرہ میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ صاف زمین پر نہ کوئی فرش ہے اور نہ کوئی پہننے کے کپڑے ہیں، منصور رونق افروز ہے، میں نے عرض کیا بس یہ سامان ہے، فرمایا ہاں" (ایضاً ج۱ ص۱۴۲)

خلیفہ مہدی کی عدل پروری

خلیفہ مہدی المتوفی ۱۶۹ھ ابوجعفر منصور کا فرزند ارجمند تھا، دس سال تک اس نے حکومت کی اور بڑے کر و فر سے کی، اس نے عدل وانصاف باپ سے ترکہ میں پایا تھا، اس کی زندگی کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ آپ دربار میں احکام جاری کر رہے تھے، کہ ایک شخص دفعۃً آیا اور اس نے مہدی سے کہا :۔

"امیر المومنین اگر کسی کو کسی کے خلاف شکایت ہو، یا ایک نے دوسرے کا حق چھینا ہو، تو وہ آپ کی خدمت میں فریاد لا سکتا ہے، اور اپنے درد کی دوا پا سکتا ہے، لیکن جسے خود امیر المومنین پر دعویٰ کرنا ہو، فرمایئے، وہ کہاں جائے؟ مجھے آپ کے خلاف استغاثہ کرنا ہے، بتایئے آج میں پیش کروں، یا کل قیامت کے دن مالک یوم الدین کی

عدالت میں، جہاں کسی قسم کی طرفداری یا ناطرفداری کی سازش نہ ہوگی مہدی نے جواب دیا، اگرچہ تمام دنیا وی حاکموں کا سر ہمارے حکم کے سامنے خم ہے، مگر شریعت کے حضور میں ہم بھی سر جھکاتے ہیں، لہٰذا شریعت کے مطابق فیصلہ ہوگا، اور تم اس دنیا میں انصاف پا سکو گے۔"

خلیفہ قاضی کی عدالت میں

خلیفہ مہدی کا یہ جواب محض زبانی نہ تھا، کہ سائل کی دلدہی ہوجائے بلکہ :-

"یہ کہہ کر امیرالمومنین مسند خلافت سے اٹھ کھڑے ہوتے، اس شخص کو ہمراہ لئے ہوئے، قاضی کی عدالت میں پہنچے، اور اس کے پاس بیٹھ کر بولے، اپنا دعویٰ پیش کرو، اس شخص نے قاضی کے سامنے دعویٰ پیش کیا، امیرالمومنین نے جوابدہی کی، اس پر قاضی نے مدعی سے قانونی دستاویز طلب کی، اس شخص نے پیش کی، قاضی نے معائنہ کر کے اس پر حکم لکھا، جو مہدی کے خلاف اور مدعی کے حق میں تھا، خلیفہ نے قاضی کے فیصلہ کے سامنے سر جھکا دیا، اور مدعی کا مطالبہ پورا کر دیا۔" (خلافت بنی عباس ص ۱۴۹/۱۲)

خلیفہ ہارون رشید کی فوجیوں کو ہدایت

خلیفہ ہارون الرشید المتوفی ۱۹۳ھ دنیائے اہل علم میں بہت مشہور اور عوام میں تعارف سے بے نیاز ہے، اس کے کارنامے تاریخ کی دنیا میں بڑی وقعت سے دیکھے جاتے ہیں، فوج کس سلطان وقت کو محبوب نہیں ہوتی، کہ یہ حکومت کی جان ہوتی ہے مگر باایں ہمہ امیرالعسکر شاہی فرمان کے مطابق پبلک کے معاملہ میں سخت تھا۔

"وہ اس بات کا لحاظ رکھتا، کہ فوجی مفتوحہ ممالک کے کسی فرد سے بدسلوکی سے پیش نہ آئے، اگر کسی شخص سے کوئی حرکت سرزد ہوجاتی تو اس کو سخت سزا دیتا، فوجیوں کو شراب پینے کی سخت ممانعت تھی اور ان کی اخلاقی زندگی کو جنرل سنوارنے کی حتی الامکان کوشش کرتا تھا" (خلافت بنی عباس ص۱۸۱)

آج کے فاتح سلاطین کو یہ سطریں بہت غور و فکر سے پڑھنی چاہئیں کہ یہ بھی ایک سلطانِ وقت ہی کا دستور حکومت تھا، اور وہ اپنی سلطنت کی وسعت میں آجکل کے تمام حکمراں سے بڑھا ہوا تھا، اس کی حدیں ہندوتاتار سے بحراوقیانوس تک پھیلی ہوئی تھیں، روم و یونان اس کے باجگزار تھے، اور تمام اسلامی دنیا سوائے اندلس زیرفرماں تھیں۔

فوجیوں کے لئے خلیفہ کا حکم

آج کوئی فوج مفتوحہ ممالک میں داخل ہوتی ہے تو اس حصہ کے کسی گوشہ کو صحیح و سالم نہیں چھوڑتی ہے، قتل و خونریزی کے ساتھ اس حصہ کی عزت و آبرو بھی ان وحشیوں سے نہیں بچتی، وہاں کی عصمت مآب عورتیں بھی ان کا شکار ہوتی ہیں، مگر یہ منظر ہارون الرشید کی حکومت یا اس زمانہ کی کسی اسلامی حکومت میں نظر نہیں آتا، وہاں کا دستور حکومت سپاہیوں کے لئے یہ تھا:۔

"سپاہی کے لئے یہ طے تھا، کہ چار ماہ سے زیادہ اپنے اہل و عیال سے علیحدہ نہیں رہ سکتا، اس کو رخصت مل جاتی، تاکہ وہ اپنے بال بچوں میں جاکر رہے" (خلافت بنی عباس ص۱۸۱)

جس حکومت میں فوجی کے لئے یہ قانون ہو، اس حکومت کے سپاہی اور فوجی یقینی طور پر انسان ہوں گے، ضرورت ہے کہ موجودہ حکمراں

دنیا میں پھران قوانین کو نافذ کریں، اور انسانیت کی مٹی پلید ہونے سے بچالیں۔

ھارون رشید کے ذاتی اوصاف

ہارون رشید نے ۲۳ سال فرمانروائی کی مگر اس کا معمول ہمیشہ یہی رہا کہ فرائض نماز باپابندی ادا کرتا۔ بلا عذر شرعی کبھی اس کی نماز قضا نہ ہوتی علاوہ ازیں روزانہ سو رکعتیں نوافل پڑھتا، علم وہنر، فہم وفراست، فکر وتدبر، عفو وحلم، عزم وثبات، تمام اوصاف سے متصف تھا، فیاضی اور شجاعت بھی اس میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی مگر انھوں نے ایک دفعہ جب سفیان ثوریؒ کو خط لکھا، تو سفیان ثوریؒ نے خط کے جواب میں لکھا، اس خط کو غور سے پڑھئے اور اندازہ لگایئے، اس زمانہ کے علماء اپنے معاملات میں کس قدر سخت تھے۔

سفیان ثوریؒ کا خط بنام خلیفہ ہارون رشید

"از بندہ سفیان بنام ہارون فریفتہ دولت۔ تم نے اپنے خط میں خود تسلیم کرلیا ہے کہ تم نے مسلمانوں کے بیت المال کے روپیہ کو بے موقع اور بیجا گراں بہا صلے دے کر خرچ کیا، اس پر بھی تم کو تسلی نہ ہوئی، اور چاہتے ہو، کہ قیامت میں تمہارے اسراف کی شہادت دوں، ہارون تجھ کو کل خدا کے سامنے جواب دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے، تو تخت پر اجلاس کرتا ہے، حریر کا لباس پہنتا ہے، تیرے دروازہ پر چوکی پہرہ رہتا ہے، تیرے عمال خود تو شراب پیتے ہیں، اور دوسروں کو شراب پینے کی سزا دیتے ہیں، خود زنا کرتے ہیں اور چوروں کے ہاتھ کاٹتے

ہیں، ان جرائم پر پہلے تجھ کو اور تیرے عمال کو سزا ملنی چاہئے، پھر اوروں کو ہارون وہ دن بھی آئے گا کہ تیری مشکیں بندھی ہوں گی، تیرے ظالم عمال تیرے پیچھے ہوں گے، اور تو سب کا پیشوا بن کر سب کو دوزخ کی طرف لے جائیگا میں نے خیر خواہی کا حق ادا کر دیا، اور اب کبھی خط نہ لکھنا"

یہ خط ہارون رشید کی تخت نشینی کے زمانہ میں لکھا گیا تھا، جب اس نے ابھی ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تھی، اس خط کا اثر خلیفہ پر یہ ہوا :۔

"ہارون رشید اعظم نے خط پڑھا، بے اختیار چیخ اٹھا، اور دیر تک روتا رہا"

(خلافت بنی عباس ص ۱۹۳، ۱۹۲/۱۷)

جو اس قدر متاثر ہوا تھا، کوئی وجہ نہیں، کہ اس نے ایک ایک بات کی اصلاح کی طرف توجہ نہ کی ہو، اور بادشاہ کی سعی پیہم سے اصلاح نہ ہوئی ہو۔

خلیفہ ہارون رشید کو ایک باخدا کی نصیحت

ابن سماکؒ دورِ ہارونی کے بڑے باخدا بزرگ تھے، ہارون رشید ایک دن ان کی خدمت میں گئے، اتفاق وقت بادشاہ کو پیاس لگی، ابن سماکؒ نے فرمایا ذرا ٹھہریئے، پہلے یہ بتایئے کہ شدّتِ پیاس جب آپ کو بے تاب کئے ہو، اور تشنگی بڑھی ہوئی ہو تو ایک پیالہ پانی کتنی قیمت دے کر لیں گے۔ ہارون رشید نے کہا اپنی نصف حکومت دے کر بھی مل سکے گا تو بھی نہ چھوڑوں گا فرمایا اگر پیشاب رک جائے اور وہ پانی نہ نکلے تو اس کے لئے کیا خرچ کیجئے گا ہارون رشید نے کہا آدھی سلطنت اس سلسلہ میں خرچ کر دوں گا، یہ سن کر ابن سماکؒ نے فرمایا۔

"بس یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کا تمام ملک ایک گھونٹ پانی اور چند قطرے پیشاب کی قیمت رکھتا ہے، بس اس پر تکبر نہ کیجئے اور جہاں تک ہو سکے لوگوں سے یکساں سلوک کیجئے" (ایضاً ص ۱۹۳/۱۷)

آج بھی کسی سلطنت کی قیمت اس سے زیادہ نہیں، حکمراں طبقہ غور وفکر سے اس واقعہ کو پڑھے اور عبرت حاصل کرے اور اسی طرح ہر وہ انسان بھی پڑھے جو دنیا میں رہ کر ظلم و جور اور تیغ آزمائی کرتا ہے، اور دولت و ثروت کے لئے اپنی عاقبت خراب کرتا ہے۔

شاہزادوں کی نظر میں استاذ کی قدر و قیمت

ہارون الرشید خود بھی بڑا عالم تھا، اور اپنے بچوں کو اس نے اچھی تعلیم دلائی تھی مگر اس کے بچے بھی استاذ کی نظر میں وہی حیثیت رکھتے تھے جیسے عام دوسرے طلبا۔ اور ان کے بچے بھی اپنے اساتذہ کی خدمت گذاری ویسی ہی فخر سمجھتے تھے جیسی کہ غریب لڑکے، ایک دن استاذ اور شاہزادہ کا یہ تعلق دیکھ کر بادشاہ کو بھی رشک آگیا۔

"ایک دن امیر المومنین ہارون الرشید دور سے اپنے فرزندوں محمد امین اور مامون کی طرف دیکھ رہا تھا دونوں بھائی اپنے مکتب میں امام کسائی سے سبق پڑھ رہے تھے، تھوڑی دیر بعد امام کسائی کسی ضرورت سے اٹھے اور باہر جانے لگے، امین و مامون نے لپک کر استاذ کے جوتے اٹھائے اور ان کے قریب رکھ دیئے، یہ دیکھ کر ہارون کو تعجب ہوا، ایک خادم سے پوچھا. بتاؤ وہ کون شخص ہے، جس کے خدمتگار دنیا کے بڑے بڑے آدمی ہیں اُس نے کہا آپ۔ ہارون نے کہا نہیں. کسائی ہے، جس کے علم و فضل کی وجہ سے محمد امین و مامون اس کی خدمت کرتے ہیں"

(خلافت بنی عباس ج۱ ص۱۹۷)

کہاں ہیں وہ طلبا جن کو علم و فضل کی تلاش ہے، اس واقعہ کو پڑھیں، معمولی ثروت ان کا دماغ خراب کر ڈالتی ہے، اور اپنے اساتذہ کو نوکر سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے۔

پبلک کی خبر گیری

ہارون الرشید رعایا کی خبر گیری برابر رکھتا تھا، بلکہ اس سلسلہ میں اس کو امتیاز حاصل تھا، خلافت بنی عباس میں شاید اور کسی کو حاصل نہ ہو سکا۔

"شاہان عالم میں بعد فاروق اعظمؓ کے ہارون الرشید، رعایا کی خبر گیری کے سلسلہ میں سب سے سبقت لے گیا تھا، اس کا دستور تھا، تبدیل لباس کر کے بغداد کی گلی کوچوں میں رات کو پھرا کرتا تھا اور اپنی رعایا کے حالات دریافت کرتا، اس کے ساتھ وزیر جعفر اور مسعود غلام ہوا کرتے۔"

(خلافت بنی عباس ص۲۰۰ ج۱)

آج جبکہ پبلک بھوکوں دم توڑ رہی ہے اور گھر گھر پریشانیوں کا بے پناہ، سیلاب موجزن ہے، جمہوری ملک کے صدر اور وزیر اعظم اپنی کوٹھیوں میں چین کی نیند سوتے ہیں اور شخصی حکومت کا فرمانروا فرعون بنا بیٹھا رہتا ہے ان کو اس واقعہ سے سبق لینا چاہئے۔

ع جہانبانی سے ہے دشوار تر جہاں بینی

مامون الرشید کی خدمت میں ایک بڑھیا کی فریاد

مامون الرشید، ہارون رشید کا فرزند ارجمند تھا، اس نے بیس سال پانچ مہینے بڑے جاہ و جلال سے حکمرانی کی اور ۲۱۸ھ میں انتقال کیا، اس کی زندگی کے بھی چند واقعات سن لیجئے:۔

"ایک مرتبہ ایک غریب بڑھیا نے مامون کے حضور میں اس کے لڑکے عباس پر استغاثہ دائر کیا، کہ شاہزادہ عباس نے اس کی جائداد پر غاصبانہ قبضہ

کر لیا ہے، عباس عدالت میں موجود تھا، مامون نے اس کو اپنے پاس سے اٹھا کر بڑھیا کے پاس کھڑا کر دیا، دونوں کے بیان لئے۔ شاہزادہ فرطِ ادب میں آہستہ آہستہ بولتا تھا، اور بڑھیا بلند آواز سے بیان دے رہی تھی، وزیرِ دولت احمد بن ابی خالد نے بڑھیا کو روکا، کہ امیر المومنین کے سامنے بلند آواز سے گفتگو کرنا خلافِ ادب ہے، مامون نے منع کیا، کہ جس طرح کہتی ہے کہنے دو، حق نے اس کی آواز بلند کر دی ہے، اور عباس کو گونگا کر دیا ہے، دونوں کے بیانات سننے کے بعد بڑھیا کے حق میں مامون نے فیصلہ دیا، اور موکل کو لکھ کر بڑھیا کی جائداد واپس کرا دی اور بڑھیا کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی" (خلافت بنی عباس ص ۲۴۶ ج ۱)

آج تو معمولی زمیندار بھی ایسی بات کہہ اٹھے گا، کہ اس نے ہماری توہین و تذلیل کی، لہذا جوتے لگاؤ، مگر یہ ایک بڑے حکمران کا ضبط و تحمل اور عدل و انصاف ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ۔

بادشاہ قاضی کی عدالت میں

ایک دفعہ خود مامون پر ایک شخص نے بیس ہزار کا دعویٰ کر دیا، جس کی وجہ سے بادشاہ کو قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑا، بعض لوگوں نے اس وقت بادشاہ کے لئے قالین بچھانا چاہا تو قاضی صاحب نے روک دیا کہ یہاں مدعی اور مدعا علیہ دونوں برابر ہیں، یہ دیکھ کر بھی مامون کو رنج نہ ہوا، بلکہ اس نے جج کی تنخواہ بڑھا دی۔

آج دنیا کا عدل و انصاف، گناہوں اور خود غرضیوں کے بحرِ ظلمات میں ڈوب چکا ہے، اس لئے دنیا سے امن و امان اور اطمینان و سکون کا جنازہ نکل رہا ہے، اور وہ تباہی و بربادی کی طرف تیزی سے جا رہی ہے۔

سپاہی کی سزا بیگاری لینے پر

" ایک مرتبہ ایک سپاہی نے ایک شخص کو بیگار میں پکڑا، اس کی زبان پر بے ساختہ حضرت عمرؓ کا نام آگیا، مامون کو اس واقعہ کی خبر لگ گئی ... ..سپاہی کو نوکری سے برخاست کر دیا" (خلافت بنی عباس ص۲۴۲)

مامون ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ ملک میں بغاوت اور خرابی واقعہ ہمیشہ عمال کی ہی زیادتی سے پیدا ہوتی ہے، یہ درست رہیں، تو ملک مطمئن رہے، ایک دفعہ مامون نے اپنے ایک گورنر کو لکھا، جب تک تمہارا ایک شاکی بھی یہاں آتا رہا اس وقت تک تمہاری رسائی دربار میں نہیں ہو سکتی۔

ایک ملاح کا طعن خلیفہ کے حق میں

" ایک مرتبہ مامون دجلہ کے کنارے رونق افروز تھے، سامنے قنات کھینچی ہوئی تھی، کہ ایک ملاح ادھر سے گذرا، اور یہ اہتمام دیکھ کر بلند آواز سے کہنے لگا، کہ مامون اپنے بھائی امین کو قتل کرا کے ہم لوگوں کی نگاہ میں کبھی معزز نہیں ہو سکتا، دربان کا بیان ہے کہ ہمیں خیال ہوا، کہ مامون کو غصہ آئے گا، اور اس کی گرفتاری کا حکم دے گا، مگر یہ سن کر مامون مسکرایا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا، تم لوگ کوئی ترکیب بتا سکتے ہو، کہ میں اس جلیل القدر آدمی کی نگاہ میں معزز بن سکوں" (ایضاً ص۲۴۳)

اپنی غلطی کا یہ اعتراف حکمراں طبقہ میں اب کہاں؟ آج اگر کسی قاتل و ظالم کو قاتل اور ظالم کہا جائے تو اس کی سزا پھانسی کا تختہ یا بندوق کی گولی ہے لاکھوں انسانوں کو قتل کرنے والے اسی کے متمنی ہیں کہ عوام ان کی تعریف کریں، اور رات کو دن کہیں۔

٭ ٭ ٭

مامون ظلم و جور کے خلاف

مامون ظلم و جور کو کبھی برداشت نہیں کرتا تھا، عدل و انصاف کا سرشتہ ہمیشہ ہاتھوں سے تھامے رہتا، اور اس سلسلہ میں گوشہ گوشہ کی خبر رکھتا، جہاں کہیں سے اس طرح کی خبر ملتی، فوراً اس کے نام فرمان شاہی جاری کرتا جس میں تہدید و تنبیہ ہوتی، ایک دفعہ:-

"ابن فضل طوسی کو لکھا، تمہارا بے تمیز اور درشت خو ہونا، تو میں نے گوارا کر لیا، لیکن رعایا پر ظلم نہیں برداشت کر سکتا۔"

اسی طرح ایک دفعہ:-

"عمرو بن سعدہ کو لکھا، اپنی دولت (حکومت) کو عدل سے آباد کرو، ظلم اس کو ڈھا دینے والا ہے۔" (خلافت بنی عباس ص۲۴۲ ج۱)

اس سے بڑھ کر حال یہ تھا کہ جانوروں پر بھی ظلم پسند نہیں کرتا تھا محکمہ احتساب کو اس کی تاکید تھی، کہ کوئی جانور پر اس کی قوت برداشت سے زیادہ بوجھ نہ لادے، حتیٰ کہ معلمین طلباء کو ضرورت سے زیادہ زدوکوب نہ کریں۔

مامون کے ان اقوال کی روشنی میں ہمارے اس زمانہ میں غور و فکر کی بڑی ضرورت ہے، کیونکہ اس دور میں ظلم و ستم کی فراوانی ہے، مخلوق خدا اس طرز زندگی سے جاں بلب ہے، مگر حکمراں طبقہ اس طرف سے بالکل غافل ہے۔ اس کو احساس تک نہیں کہ سارے مصائب ان کی ہی غفلت کے نتیجہ میں ہیں۔

ایک سیاح قاضی کی صاف گوئی خلیفہ سے

خلیفہ منصور جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے، ان کی خدمت میں افریقہ سے ایک قاضی صاحب تشریف لائے، جو منصور کے زمانہ طالب علمی کے

ساتھی تھے۔

"ان سے منصور نے پوچھا، تم کو میری حکومت اور بنو امیہ کی حکومت میں کیا فرق نظر آیا، اور تم اس طویل سفر میں ہمارے جن علاقوں سے گذرتے آئے ہو، ان میں نظم و نسق کا کیا حال ہے، قاضی نے جواب دیا، اے امیرالمومنین میں نے اعمال بد اور ظلم و جور کی کثرت دیکھی ہے، پہلے تو میرا گمان یہ تھا، کہ اس ظلم و جور کا سبب آپ کا ان علاقوں سے دور ہونا ہے، لیکن میں جتنا قریب آتا گیا، معاملہ اسی قدر نازک ہوتا گیا، خلیفہ نے یہ سن کر اپنی گردن جھکالی، تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر کہا، مگر میں لوگوں کا کیا کروں؟ قاضی نے جواب دیا کیا آپ کو معلوم نہیں ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے تھے، لوگ بادشاہ وقت کے تابع ہوتے ہیں، بادشاہ اگر نیک ہوگا، تو رعایا بھی نیک اور صالح ہوگی، اور اگر وہ بد ہے، تو رعایا نیک نہیں ہو سکتی"۔

(خلافت بنی عباس ص۱۴۲)

کتنا سچ فرمایا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے، حقیقت بالکل یہی ہے، باقی اور سب لفاظی ہی لفاظی ہے، مامون الرشید با ایں عظمت شان بہت متواضع اور خاکسار تھا، اور اس سلسلہ میں بھی وہ مثال قائم کر گیا۔

مامون کا اکرام ضیف

قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثمؒ کا بیان ہے:۔

"میں نے مامون سے زیادہ شریف الطبع انسان نہیں دیکھا، ایک شب مجھ کو حریم خلافت میں سونے کا اتفاق ہوا، آدھی رات بیتے ہوئے کچھ عرصہ گذرا، میری آنکھ کھل گئی، تشنگی کا غلبہ تھا، پانی پینے اٹھا، کہ مامون الرشید کی نظر مجھ پر یکایک پڑ گئی، انھوں نے پوچھا قاضی صاحب کیا بات ہے، سوتے کیوں نہیں، میں نے عرض کیا، امیرالمومنین پیاس معلوم ہوتی ہے،

اس نے کہا۔ آپ اپنے بستر پر بیٹھئے۔ اور خود جاکر آبدار خانہ سے پانی لاکر مجھ کو دیا، میں نے عرض کیا امیرالمومنین خادم کو اٹھا لیا ہوتا، فرمایا سب سوئے ہوئے ہیں، میں نے عرض کیا، تو میں خود ہی جاکر پانی پی لیتا مامون نے فرمایا، انسان کے لئے یہ بڑے عیب کی بات ہے۔ کہ اپنے مہمان سے کام لے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، قوم کا سردار ان کا خادم ہے۔" (خلافت بنی عباس ص۱۰۳ ج۱)

اس واقعہ سے پہلے زمانہ کے سلاطین کا اخلاق جھلکتا ہے، ان کا شریعت پر کس قدر عمل تھا، مہمان سے کام لینا اخلاقاً اور شرعاً دونوں طرح عیب جانتے تھے۔ من آمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ (الحدیث)۔

خلیفہ مامون پر شیعی استاذ کا اثر

مامون کا علمی دربار مشہور رہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بڑا علم دوست تھا، ہر ہفتہ میں سہ شنبہ کو علمی مجلس کا خصوصی اجلاس منعقد ہوتا تھا جس مجلس میں ملک کے نامی گرامی علماء شریک ہوتے اور باہم علمی مباحثہ کرتے، بایں ہمہ مامون بہت سے مسائل میں پھسل گیا، جعفر برکی جو مامون کا اتالیق تھا، مذہبا شیعہ تھا، اس نے اور بھی اپنا اثر ڈالا جس سے بہت ساری باتیں شیعوں کی اس میں پیدا ہو گئی تھیں، انہی میں سے ایک متعہ کا مسئلہ تھا۔

جعفر برکی کی عیاشی دیکھتے دیکھتے مامون خود بھی اس کا قائل ہو گیا، اور اس نے متعہ کے جواز کی منادی کرا دی جس سے علماء اہل سنت کو بڑی روحانی اذیت ہوئی، اس مسئلہ پر گفتگو کے لئے یحییٰ بن اکثم منتخب کئے گئے۔

یحییٰ بن اکثم کی گفتگو مامون سے

چنانچہ یہ ایک دن دربار میں پہنچ گئے جس وقت یہ وہاں پہنچے ہیں،

وہ حضرت عمرؓ کا یہ قول پیش کر کے :۔

"رسول اللہ صلعم اور ابو بکرؓ کے زمانہ میں دو متعہ تھے، میں ان کو روکتا ہوں"

کہہ رہا تھا، جس چیز کی رسول اللہ صلعم اور ابو بکرؓ کے زمانہ میں اجازت تھی اس کے روکنے کا کسی کو کیا حق ہے۔

مامون سے یہ سن کر قاضی صاحب کا رنگ بدل گیا، غصہ میں سرخ ہو کر بیٹھ گئے، مامون نے خود پوچھا :۔

"یحییٰ صاحب آپ کا چہرہ کیوں متغیر ہے، انھوں نے کہا امیرالمومنین اسلام میں ایک رخنہ پڑ گیا، اس نے پوچھا وہ کیا، یحییٰ نے کہا، زنا کی حلت کا اعلان، مامون نے تعجب سے پوچھا، زنا؟ یحییٰ نے کہا، کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ صلعم سے، اور کلام الٰہی کی یہ آیت اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ (تمتع صرف دو طرح کی عورتوں سے جائز ہے، بیوی یا لونڈی) پڑھ کر پوچھا، کیا ممتوعہ عورت لونڈی ہے، مامون بولا نہیں، یحییٰ نے پوچھا تو پھر کیا بیوی ہے، اور اس کو شوہر کی وراثت اور شوہر کو اس کی وراثت ملتی ہے، اور اس کے اور بیوی کے تمام شرائط یکساں ہیں مامون نے کہا نہیں، یحییٰ نے کہا جب ممتوعہ ان دونوں میں سے کسی میں داخل نہیں ہے، تو پھر قرآن کے مقررہ حدود سے باہر ہے"

(خلافت بنی عباس ص ۲۷۱/۲۷۲ ج ۱)

اس قرآنی استدلال کے ساتھ حضرت علیؓ کی وہ روایت سنائی جس میں متعہ کی حرمت کے اعلان کا ذکر ہے، مامون لاچار ہو گیا اور اس نے اس فعل سے توبہ کی اور پھر حرمت کی منادی کرا دی۔

معتصم کا اعلان بسلسلہ زراعت

معتصم جو مامون کے بعد خلیفہ ہوا تھا، اس نے زراعت کو بڑی

ترقی دی، اس نے اس محکمہ کے وزیر ابن زیات کو حکم دے رکھا تھا:۔

"جو افتادہ زمین تم ایسی دیکھو، کہ اس سال اس پر دس روپیہ صرف کر دو تو سال آئندہ میں اس سے گیارہ روپے وصول ہوں، ایسے خرچ کے لئے مجھ سے منظوری حاصل کرنے کی ضرورت نہیں" (خلافت بنی عباس ص۲۴۳)

یہ چند تاریخی واقعات آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے، ان سے عبرت و بصیرت حاصل کیجئے، اور ان کی روشنی میں دنیا کی اصلاح کی طرف قدم بڑھایئے۔

خلیفہ متوکل کی رعایا کیساتھ نرم خوئی

خلیفہ متوکل المتوفیٰ ۲۴۷ھ اپنی سیرت میں بڑا امتاز گذرا ہے، گو شیعوں نے اس کو بُری طرح بدنام کرنے کی سعی کی ہے، مورخین کا بیان ہے:۔

"متوکل کو رعایا کا بڑا خیال تھا اور ان کے ساتھ منصفانہ سلوک کرتا تھا، وہ کہا کرتا تھا اگلے خلفاء رعایا پر اس لئے سختی کیا کرتے تھے کہ وہ اس سختی کے خوف سے ان کے مطیع رہیں اور میں نرمی کرتا ہوں، تاکہ وہ مجھ سے محبت کریں، میرے پاس آئیں اور میری اطاعت کریں" (تاریخ ملت ص۲۹۴)

آج سے سیکڑوں برس پہلے کے حکمراں کا یہ سلوک تھا، اپنی رعایا کے ساتھ، جس کے متعلق کہا جا سکتا، جمہوری دور نہیں تھا، مگر غور کیجئے یہ پریم اور محبت یہ اخلاق اور حسن سلوک اب روئے زمین پر باقی ہے؟ اب تو صرف زبانی لمبے دعوے کے سوا عمل کہیں نظر ہی نہیں آتا۔

متوکل کا دور سلطنت

مسعودی جیسے مورخ کا بیان ہے:۔

"متوکل کا زمانہ اپنی بھلائیوں، خوبیوں، سرسبزی و شادابی، فارغ البالی

اور رفاہیت، عیش و عشرت کے لحاظ سے عہد سردار تھا، سارے خواص و عوام خوش و خرم تھے۔" (تاریخ ملت ج۳ ص۱۶۲)

متوکل کا انصاف

متوکل کے عدل و انصاف کے متعلق مسعودی لکھتا ہے :-

"عدل و انصاف کے لحاظ سے بھی متوکل کا زمانہ ممتاز شمار کیا جاتا تھا۔"

(ایضاً ج۳ ص۱۶۲)

آہ اب تو یہ خوبیاں ہمارے زمانہ میں عنقا ہیں، نہ رعایا خوش و خرم ہے، اور نہ کوئی غریب، حد یہ ہے کہ ہمارے اور دوسرے اکثر ملک کی زیادہ آبادی مشقت اور فاقہ کی زندگی گذارتی ہے، عدل و انصاف کس کو کہتے ہیں، آج کوئی جانتا بھی نہیں، حکمراں طبقہ صرف اپنے بیانوں میں عدل و انصاف کا نمائشی طوم پر نام لے لیتے ہیں، ورنہ عمل سے کوئی تعلق نہیں، انصاف ہمارے ملک میں بکتا ہے، الّا ماشاء اللہ۔

رشوت بازاری کا خاتمہ

متوکل نے اپنے دورِ حکومت میں رشوت ستانی کی بھی اصلاح کی اور کامیاب رہا، اس سلسلہ میں بھی مورخ کا بیان ہے :-

"متوکل کے اولین عہد میں رشوت کا بازار گرم تھا، مگر متوکل نے بڑے بڑے عہدہ داروں کو سخت سزائیں دیں، اور گراں قدر جرمانے کئے جس سے رشوت ستانی کا دروازہ بند ہوگیا۔" (ایضاً ج۳ ص۱۶۲)

ہمارے ملک میں رشوت ستانی کے بند کرنے کے لئے جتنی بھی کوششیں ہوتی ہیں، کوئی بھی کامیاب نہیں ہوتی، بلکہ نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے، رات دن کھلم کھلا رشوت ستانی کا بازار گرم ہے، حکومت کے جس محکمہ میں چلے

جائے بغیر رشوت کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا، حد ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں رشوت بند کرنے کا اختیار ہے غالباً وہ خود بھی پاک نہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ رشوت کا بازار سرد نہیں پڑتا۔

برکتوں کا نزول

اس حسن انتظام اور عدل و انصاف کا نتیجہ تھا کہ عہد متوکل میں ہر طرح کی برکت ہوئی، متوکل نے اپنے ہاتھ سے داد و دہش میں کروڑہا روپیہ خرچ کیا مگر بایں ہمہ جب دنیا سے رخصت ہوا، تو خزانہ میں بقول مسعودی چالیس لاکھ دینار اور ستر لاکھ درہم چھوڑ گیا۔

احیاء سنت اور اشاعت حدیث

متوکل نے احیاء سنت اور اشاعت حدیث کے علاوہ ترجمہ و تصنیف پر بھی توجہ دی، "بیت الحکمت" کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا اور اس کا افسر حنین بن اسحاق کو بنایا اور اس کے تحت مترجمین کی ایک جماعت تھی، اس میں مورخین نے لکھا ہے:-

> "متوکل نے حنین کی بے انتہا قدر دانی کی، ایوانات شاہی میں سے تین محل اس کی رہائش کے لئے خالی کر دیئے، اور ان کو ہر قسم کے آرائشی سامان سے سجوا کر شاہی کتب خانہ بھی دہیں رکھوا دیا، پندرہ ہزار ماہوار تنخواہ مقرر تھی" (تاریخ ملت ج ۲)

علم و علماء کی یہ قدر دانی اب کہاں رہی، اب تو چار سو بیس قسم کے لوگ ہوتے ہیں، حکومت انہی کی قدر دانی کرتی ہے، بڑی ناشکری ہوگی اگر اس موقع سے نظام حیدر آباد کی یاد نہ دلائی جائے جنہوں نے پچھلے دنوں علم اور اہل علم دونوں کی خوب عزت اور قدر دانی کی، اور علوم و فنون پر

لاکھوں روپے خرچ کئے۔

بادشاہ منتصر کا حال

منتصر المتوفی ۲۴۸ھ بڑا بامروت، عفیف اور خلیق بادشاہ گذرا ہے اس کے متعلق علامہ سیوطی کا بیان ہے:-

"منتصر نے رعیت میں عدل و انصاف پھیلایا، اور لوگ باوجود اس کی ہیبت کے اس کی طرف مائل ہو گئے، کیونکہ وہ سخی اور حلیم الطبع تھا"

اب عدل و انصاف تو نہیں، ہاں ظلم و جور ضرور پھیلاتے ہیں، مورخ ہمارے اس دور کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو وہ انصاف کا باب قائم کرے گا، اور پوری کدوکاوش کے بعد لکھے گا افسوس عدل و انصاف کا کوئی سبق آموز واقعہ نہیں مل سکا۔

منتصر پر اپنے جرم اور گناہ کا اثر

لکھا ہے منتصر نے ایک دفعہ اپنے باپ کے خزانہ سے کچھ فرش نکلوائے، ان میں سے ایک فرش کے وسط میں ایک دائرہ بنا ہوا تھا جس میں ایک سوار کی تصویر تھی اور فرش کے کنارے کچھ لکھا ہوا تھا، ایک فارسی خواں کو بلوا کر پڑھوایا تو معلوم ہوا کہ لکھا ہے "میں شیرویہ بن کسریٰ بن ہرمز ہوں میں نے اپنے باپ کو قتل کیا لیکن مجھے چھ ماہ سے زیادہ سلطنت کرنا نصیب نہ ہوا"، منتصر یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا، اس نے بھی اپنے باپ کو قتل کرایا تھا مگر حال یہ تھا:-

"اس واقعہ کا غم بہت تھا، شب و روز باپ کے لئے رویا کرتا تھا، اس غم میں چھ ماہ میں گھل گھل کر سوکھ گیا" (تاریخ ملت ج ۹ ص ۴۴)

اپنے گناہ پر اس طرح کا پچھتاوا اب کہاں ہوتا، اب تو اپنے گناہ کو چھپانے کے لئے سیکڑوں الزام تراشے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے ہندوستان کی ریاست

کے ایک نائب وزیراعظم کو اس کے سابق وزیراعظم ہی نے فرش سے عرش پر پہنچایا، مگر آج یہ عبرت انگیز واقعہ دنیا کے سامنے ہے کہ اسی بد اندیش نے اپنے سابق وزیراعظم کو جیل میں بند کر ڈالا ہے، اور الٹے ان ہی پر الزام ڈالتا ہے، اور اسے اب تک اپنے اس گناہ کا احساس نہیں ہے۔

خلیفہ مہتدی کے رمضان کے کھانے کی نوعیت

خلیفہ مہتدی المتوفی ۲۵۶ھ متقی، دیندار اور امانت دار تھا، اپنی خصوصیات میں امتیاز کا مالک گذرا ہے، اس کا یہ واقعہ پڑھنے کے لائق ہے۔

"ہاشم بن قاسم کہتے ہیں کہ رمضان میں شام کے وقت مہتدی کے پاس میں بیٹھا تھا، جب میں چلنے لگا، تو مہتدی کہنے لگا، ہاشم بیٹھ جاؤ، میں بیٹھ گیا، پھر ہم نے افطار کیا اور نماز پڑھی، مہتدی نے کھانا مانگا، تو ایک بید کی ڈلیا میں کھانا آیا، اس میں پتلی پتلی روٹیاں تھیں، اور ایک برتن میں تھوڑا سا نمک، دوسرے میں سرکہ اور تیسرے میں زیتون کا تیل تھا، مجھ سے بھی کھانے کو کہا میں نے کھانا شروع کیا، اور دل میں سوچا کھانا اور بھی آتا ہوگا، مہتدی نے میری طرف دیکھ کر پوچھا کیا تمہارا روزہ نہ تھا، میں نے کہا تھا۔ پھر پوچھا، کیا کل روزہ نہ رکھو گے؟ میں نے عرض کیا رکھوں گا۔ اور عرض کیا امیرالمومنین! یہ تو ماہ رمضان ہے، خلیفہ بولا پھر تو اچھی طرح سے کھاؤ، اور امید یہ نہ رکھو کہ اور کھانا آئے گا، کیونکہ اس کے سوا اور میرے لئے کھانا نہیں ہے، یہ سن کر مجھے سخت تعجب ہوا، اور میں نے تعجب سے پوچھا کہ امیرالمومنین یہ کیا معاملہ ہے، خدا نے آپ کو تمام نعمتیں عطا کی ہوئی ہیں، مہتدی نے کہا بات یہ ہے کہ بنو امیہ میں عمر ابن عبدالعزیزؒ جیسا شخص پیدا ہوا، اور بنی ہاشم میں پیدا نہ ہوا"

(تاریخ ملت ص۲۳۶)

یہ جذبہ نیک اب ڈھونڈے کہاں ملتا ہے، اسلاف کرام کی یہ ساری خوبیاں ہمارے لئے ایک افسانہ بن کر رہ گئی ہیں، امیر المومنین اور اتنی سادہ غذا، اللہ تعالیٰ کی دین ہے، اب تو آدمی جہاں امیر یا وزیر بنا، سمجھنے لگا ہم چنیں دیگرے نیست، اور قوم کا روپیہ بے دریغ اپنی عافیت میں پھونک ڈالتا ہے، کبر و نخوت سے اس کی گردن تن جاتی ہے، اور نام و نمود میں ہزاروں روپے پانی کی طرح بہا ڈالتا ہے۔

خلیفہ مہتدی اپنی پبلک کے حق میں

یہ تو اس کی رہائش تھی، اب اندازہ لگایئے اپنی قوم اور رعایا کے حق میں کیسا تھا، مورخین اس کے عدل و انصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"مہتدی کی سیرت میں سب سے نمایاں اس کا عدل و انصاف اور امر و نواہی کا قیام ہے، اس نے عدل کے لئے ایک خاص عمارت "رقبۃ المظالم" کے نام سے بنوائی، جہاں روزانہ بیٹھ کر عوام و خواص کی دادرسی کیا کرتا تھا" (تاریخ ملت ص ۳۲ ج ۲)

آہ اب تو ہر چیز ممکن ہے مل جائے مگر بڑوں کے یہاں جس چیز کا سب سے زیادہ قحط ہے وہ عدل و انصاف ہے، ہمارے اس دور میں دنیا سے انصاف کا نام حرف غلط کی طرح مٹا چلا جا رہا ہے اور کسی کو احساس تک نہیں، جس کو بڑا منصف جانتے ہوں ان کے سامنے کسی امیر غریب کا مقدمہ لے جایئے، آپ دیکھیں گے کہ امیر وزیر اور لیڈر کے مقابلہ میں غریب، مزدور اور رعایا کو انصاف نہ مل سکے گا۔

مہتدی کا ایک عبرت انگیز واقعہ

مہتدی کی سیرت میں یہ واقعہ ملتا ہے :-

"ایک دفعہ کسی شخص نے اس کے لڑکے پر دعویٰ کیا، مہتدی نے شاہزادہ کو طلب کیا اور مدعی کے پہلو میں کھڑا کر کے دعوے کی سماعت کی شاہزادے نے اقرار کرلیا، مہتدی نے اسی وقت مدعی کا حق دلوا دیا"

(تاریخ ملت ص۶۲۲)

دل پر ہاتھ رکھ کر کہا جائے اب اس طرح کا انصاف ہو سکے گا، کوئی وزیر ایسا کرنے کو تیار ہے؟ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی،

دسترخواں کے اخراجات میں کمی

لکھا ہے کہ مہتدی نے دورِ عباسیہ کے سارے لوازماتِ عشرت کو فنا کے گھاٹ اتار دیا، حد یہ ہے کہ باپ دادا سے دسترخواں کا خرچ جو دس ہزار یومیہ تھا اسے سو درہم کر دیا، اور ہمارے اس دور کا حال یہ ہے کہ جو باپ دادا سے سو روپے ماہانہ خرچ کرتا چلا آرہا تھا وزیر بننے کے بعد ہزاروں روپے روزانہ اپنی ذات پر خرچ کرنے سے بھی نہیں گھبراتا، رعایا سے کہتا ہے کہ تم تیس ایکڑ سے زیادہ زمین نہ رکھو، مگر خود دو چار ہزار ماہانہ حکومت کے خزانہ سے وصول کرتا ہے، اسی ہندوستان میں جس کو دس گز سے زیادہ رہنے کا مکان نہ تھا، وہ صرف اپنے کتوں پر سات سات سو روپے ماہانہ خرچ کرتا ہے۔

ایک عالم کا ذریعہ معاش

معتمد کے دور کے ایک عالم ابوبکر احمد بن عمر خصاف المتوفی ۲۶۱ھ کی خودداری کا حال سننے کے لائق ہے، اپنے وقت کے جید عالم کتنی کتابوں

کے مصنف مگر با ایں ہمہ :-

"نعلین و موزہ دوزی کی کمائی سے زندگی بسر کرتے تھے، حکومت کے دست نگر نہ تھے" (تاریخ ملت ج۹)

اللہ اللہ یہ تھا اپنے علم کا پاس، اور اپنے علم کی قدر و منزلت، دوسروں کے آگے اسے رسوا نہ کیا، سوچئے کیسا حلال ذریعہ معاش پسند کیا، اور اپنے آپ کو غلامی کی ذلت سے بچا لیا، آج کوئی اہل علم ایسا شاید تصور بھی نہ کر سکے گا۔

ایک عالم کی کہانی اور جرأت مردانہ

اسی سلسلہ میں معتضد کے دور کے ایک عالم کی کہانی سن لیجئے لکھا ہے:۔

"ابو الحسن نوری دربار کی طرف سے گذرے، خدام کشتی میں نبیذ کے مٹکے لے جا رہے تھے، دریافت کیا یہ کس کے ہیں، معلوم ہوا معتضد نے منگوائے ہیں، آپ نے تمام مٹکے توڑ دیئے، جب معتضد نے مسکرا کر پوچھا کہ تم کو محتسب کس نے بنایا ہے، تو فوراً جواب دیا کہ جس نے تجھے خلیفہ مقرر کیا، معتضد نے سنا اور سر جھکا دیا"

یہ تھے علمائے حق کی جماعت کے ایک فرد، حق بات کہنے میں ذرا بھی رعایت نہیں کرتے تھے، خلیفہ وقت کو یہ برجستہ جواب دیا جا رہا ہے، اور اسی کے مٹکے توڑے جا رہے ہیں، حالانکہ نبیذ ان چیزوں میں سے ہے جس کی حرمت مختلف فیہ ہے، علمائے عراق اس کی حرمت کے نہیں بلکہ جواز کے قائل ہیں مگر با ایں ہمہ نہ خوف اور نہ مروت۔ سچ کہا اقبال مرحوم نے۔ ؎

آئین جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو، آتی نہیں روباہی

❊ ❊ ❊

باپ کی عمارت بیٹے نے گروادی

مکتفی المتوفی ۲۹۵ھ بڑی خوبیوں کا مالک تھا، لکھا ہے :۔

"مکتفی کی خوش خلقی مشہور تھی، عدل و انصاف میں کسی خلیفہ سے پیچھے نہ تھا"

مورخین نے اس کے عدل و انصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"اس (مکتفی) کے والد نے دوسروں کے مکانات بحق حکومت ضبط کر کے نعمت خانے بنوائے تھے، ان کو گروادیا اور ورثاء کو رقمیں دیں، اور مساجد بنوادیں، اور قصر میں جو مکانات آئے تھے ان کے مالکوں کو وہ مکانات دیدیئے" (تاریخ ملت ص ۱۳۶/۶۶)

فرمایا جائے اب اس طرح کا عدل و انصاف روئے زمین پر باقی رہا اب تو ایک کے بعد جو دوسرا آتا ہے وہ اور بھی ظالم اور لوٹ گھسوٹ کرنے والا ہوتا ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہے اور رعایا میں الحفیظ والاماں کا کہرام مچا ہوا ہے۔

مکتفی کا بوقت موت حال

مکتفی کا جب آخری وقت آیا، اور بیمار پڑا، تو خشیت الٰہی کا سبق آموز اثر دیکھنے والوں نے دیکھا، مورخین نے لکھا ہے :۔

"مکتفی نے اپنی بیماری میں کہا کہ مجھے ان سات سو دیناروں کا بڑا خطرہ لگا ہوا ہے، جو اپنے خرچ میں لے آیا ہوں، حالانکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ مسلمانوں کا مال ہے اور مجھے اذن کی چنداں احتیاج بھی نہ تھی اگر فردائے قیامت میں مجھ سے اذن کی پرسش ہوئی، تو میرے ساتھ بری گذرے گی، میں اپنی غلطی پر خدا سے مغفرت مانگتا ہوں"

(تاریخ ملت ص ۱۳۶)

اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائیں، فرماں روائی کا حق ادا کر گئے، پوری زندگی میں بحیثیت خلیفہ صرف سات سو دینار خرچ کیا، تو اس پر کانپ رہے ہیں، کہ رب العزت کے یہاں کیا پیش آئے گا، قوم کی امانت تھی، کوئی معمولی چیز نہ تھی، مگر آہ آج قوم کے روپے جس بے دردی سے ارباب حکومت اڑاتے ہیں وہ جاننے والوں سے پوچھیے تفصیل سننے کے بعد یقین کرنا ہوگا، کہ پہلے کے مقابلہ میں اب ارباب حکومت خادم نہیں ڈاکو ہوتے ہیں اب قوم کے ساتھ صرف زبانی ہمدردی باقی رہ گئی ہے۔

ایک خلیفۂ وقت کی فضول خرچی

مقتدر ایک خلیفہ گذرا ہے، جو اپنے طمطراق کے اعتبار سے بڑا نامی گرامی تھا، لیکن رات بھر عورتوں کی صحبت میں رہتا تھا اور عیش پرستی نے اس کو نکما بنا دیا تھا، لونڈیوں او محلات شاہی پر لاکھوں روپے خرچ کرتا قیمتی جواہرات ان پر نثار کرتا رہتا، ایک دفعہ رومی سفیر آیا تو اس موقع سے لاکھوں روپے اس کے خیر مقدم میں خرچ کر ڈالا، دار الشجرہ نامی محل کے متعلق لکھا ہے:۔

"محل دار الشجرہ میں سونے چاندی کا ایک درخت بنایا گیا تھا، اس کا تنہ اور شاخیں سونے، چاندی کی تھیں، پتیاں اور پھول پھل جواہرات کے، شاخوں کی بناوٹ اس طرح کی تھی کہ وہ ہوا سے اصلی شاخوں کی طرح جھومتی تھیں ان پر سونے اور چاندی کے طیور بٹھائے گئے، ان میں یہ صفت رکھی گئی تھی کہ جب ان کے جوف میں ہوا بھرتی تھی تو ان سے چہچہانے کی سی آواز نکلتی تھی اور سب کی بولیاں ایک دوسرے سے جدا تھیں۔"

خلیفہ کا انجام

اندازہ لگایا جائے قوم و ملک کا کتنا روپیہ اس بے کار چیز میں خرچ کیا گیا

ہوگا، مگر جانتے ہیں اس کا انجام کیا ہوا، اور کیسا بدلہ ملا، اس کی موت کا واقعہ لکھتے ہوئے لکھا ہے :-

"نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۲۰ھ میں بُری طرح قتل ہوا، سر جدا کر کے لکڑی پر آویزاں کیا گیا، بدن پر سے کپڑے اتار کر لاش عریاں چھوڑ دی گئی، ایک راہ گیر نے گڑھا کھود کر مقتدر کی لاش کو زمین میں دفن کر دیا"

قدرت کا انتقام بڑا زبردست ہوتا ہے، حکمراں طبقہ میں جو لوگ قوم وملک کو فائدہ پہنچانے کی جگہ خود فائدہ اٹھاتے ہیں ان کو آنکھیں کھول کر اس واقعہ کو پڑھنا چاہئے اور عبرت حاصل کرنا چاہئے، خدا کے یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں -

خلیفہ متقی کے اوصاف

متقی المتوفی ۳۵۷ھ میں دینی اور اخلاقی خوبیاں بہت تھیں، خطیب کا بیان ہے :-

"وہ اپنے پیشرو خلفاء کے بہت سے اعمال وافعال سے محترز رہا، نبیذ کبھی نہیں پی، ہر وقت قرآن شریف تلاوت کرتا رہتا، اور کہا کرتا تھا کہ میرا اس سے بڑھ کر کوئی رفیق وندیم نہیں، اپنی کنیزوں کو منھ نہیں لگایا"

اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، صاحبِ حکومت ہونے کے باوجود ان خوبیوں کا مالک ہونا کوئی آسان بات نہیں، اب تو ہمارے زمانہ میں اربابِ حکومت مذہبی اعمال واخلاق سے کوسوں دور ہوتے ہیں، جائز کنیزوں کی بات تو الگ رہی، ناجائز دوشیزاؤں سے بھی منھ کالا کرنے میں نہیں شرماتے -

مسلم سلاطین ہند کی ہمدردی اپنی رعایا کے ساتھ

تاریخی حقائق

بعض مسلم شاہانِ ہند کے حالات

اس عنوان سے میں نے جولائی، اگست ۵۱ء کے "برہان" میں اندلس اور بغداد کے بعض سلاطین کے حالات لکھے تھے، اس وقت یہ "تاریخی حقائق" بہت پسند کئے گئے تھے، کتاب "آئینہ حقیقت نما" مولفہ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی میں بھی بعض واقعات پڑھتے وقت بہت پسند آئے، دل نے کہا یہ واقعات قوم و ملک کے سامنے بھی پیش کر دیئے جائیں تا کہ مشعل راہ کا کام دیں ——— (ظفیر صدیقی)

محمد بن قاسم کی ہندوستان میں آمد

محمد[1] بن قاسم فاتح سندھ کسی تعارف کے محتاج نہیں، سب سے پہلے یہی بزرگ راجہ داہر کے زمانہ میں ۹۳ھ / ۷۱۱ء میں ہندوستان تشریف لائے، جن کا مقصد امن قائم کرنا اور مظلوم مسلمانوں کی اعانت اور گلو خلاصی تھا۔

---

[1] محمد بن قاسم ۹۳ھ / ۷۱۱ء ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں سندھ آئے، جب سلیمان برسر اقتدار آیا تو اس نے ان کو معزول کر دیا اور عراق بلا کر مع خاندان قید کر دیا، اس کو پرانی دشمنی تھی اور خلیفہ کے خلاف سازش کا جرم عائد کر کے ۹۶ھ / ۷۱۴ء میں قتل کرا دیا۔ (مختصر تاریخ ہند ص ۳۵)

باشندگانِ شہر کا فیصلہ

سیوستان میں راجہ داہر کا بھتیجا بجے رائے حکمراں تھا، محمد بن قاسم جب اس طرف بڑھے اور بجے رائے نے مقابلہ کا ارادہ کیا، تو باشندگانِ شہر اور شہر کے علمائے بدھ نے جلسہ کر کے طے کیا کہ جنگ مناسب نہیں ہے اور بجے رائے کی خدمت میں اہل شہر کی طرف سے یہ درخواست پیش کی :-

"مسلمانوں کا مقابلہ نہ کیجئے، اور صلح اور آشتی سے کام لیجئے، مسلمان درخواست صلح کو رد نہیں کرتے، اور کسی کے مذہب میں دخل نہیں دیتے لہذا کشت و خون کا ہنگامہ برپا کرنا فضول ہے" (آئینۂ حقیقت نما ج۱ ص۱۸)

یورپی مورخین نے مسلمانوں کو کس قدر بدنام کیا ہے، اور مسلمانوں کو ظالم ثابت کرنے کی کیسی ناپاک کوشش کی ہے مگر غور کیجئے کہ پہلی صدی ہجری ہے اور مسلمانوں سے متعلق عرب سے اتنی دور ہندوستان والے کتنا صحیح خیال رکھتے تھے، اگر واقعی اسلام ظلم ہی لے کر آتا، تو کیا ان سندھیوں کو معلوم نہ ہوتا

لشکرِ اسلام میں جاسوس اور اس کی رپوٹ

اسی موقع کا ایک واقعہ ہے کہ بجے رائے نے اپنا ایک خاص جاسوس مسلمانوں کے لشکر میں بھیجا، اتفاق سے اس نے مسلمانوں کو نماز باجماعت پڑھتے ہوئے دیکھا، اور جا کر کہا :-

"یہ لوگ اس قدر متحد اور متفق ہیں کہ ان کا مغلوب کرنا سخت دشوار ہے۔ بجے رائے مرعوب ہو کر رات ہی کو سیوستان سے فرار ہو گیا"

(آئینۂ حقیقت نما ج۱ ص۱۸)

اللہ اللہ یہ تھا مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا اثر، اب تو خود مسلمان ہی منہ آنے لگے ہیں کہ آخر نماز سے کیا فائدہ؟ دیکھ رہے ہیں اسلاف کی نماز ان کو

کتنا فائدہ پہنچاتی تھی، کیا اس کے باوجود نماز باجماعت کے فائدے کا انکار کیا جائے گا؟ -

محمد بن قاسم کی طرف سے آزادیٔ مذہب کا اعلان

جس دن راجہ داہر مسلمانوں کے ہاتھ مارا گیا اور مسلمانوں نے کامیابی حاصل کی، اس دن بہت سے لوگوں نے درخواست پیش کی کہ ہم بخوشی مسلمان ہونا چاہتے ہیں، چنانچہ ان کی خواہش کے مطابق ان کو اسلام میں داخل کرلیا گیا مگر دوسرے ہی دن محمد بن قاسم نے اعلان کرادیا :-

"جو شخص چاہے اسلام قبول کرے، اور جو چاہے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے، ہماری طرف سے کوئی تعرض نہ ہوگا" (آئینہ حقیقت نما ص۹۵ ج ۱)

یہ تھی مسلمانوں کی رواداری اور ان کا قرآنی آیت لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں) پر عمل، وہ لوگ آنکھیں کھول کر دیکھیں جو تعصب سے چیختے رہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، اور ان پاکستانی پرجوش مسلمانوں کو بھی غور سے پڑھنا چاہیے جن کو غریب اقلیت کے زبردستی تبدیل مذہب کا مالیخولیا ہوتا ہو۔

برہمن آباد کی فتح پر سپہ سالار کا اعلان

برہمن آباد جب فتح ہوا، تو یہاں کے بعض باشندے ڈر سے بھاگنے لگے اس موقع پر محمد بن قاسم نے اعلان کرادیا اور اس کا یہ سلوک رہا کہ :-

"جو شخص اپنی جان بچانے کے لئے بھاگتا ہے اسے بھاگ جانے دو۔ ..... باشندگانِ شہر سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، سوداگر، دکاندار اور اہل حرفہ بدستور اپنے مشاغل میں مصروف رہے، امن وامان کا اعلان

کردیا گیا..... جنگی قیدی جب محمد بن قاسم کے سامنے پیش ہوئے، تو اس نے ان کو رہا کردیا..... جو اپنے باپ دادا کے مذہب پر چلے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا، نہ ان کے مندروں اور عبادت خانوں میں کسی قسم کی مداخلت کی جائے گی، نہ زمینیں چھینی جائیں گی، نہ جان و اموال کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے گا۔" (آئینہ حقیقت نما ص۹۹)

اس سے بڑھ کر رواداری؛ در حسن سلوک کوئی اور ممکن ہے؟ کسی بات میں فتح کا غرور نظر آتا ہے؟ ظلم و جور کہیں سے معلوم ہوتا ہے؟ پھر ان فاتحوں کو برکت کیوں نصیب نہ ہو گی، ضرور نصیب ہو گی اور ہوئی بھی۔

مندر کا لحاظ و پاس اور ٹیکس کی معافی کا اعلان

اور فتح ہو چکا تو محمد بن قاسم نے تعجب سے دیکھا کہ بہت سے لوگ اس کے بڑے بت خانہ "نودھار" میں بت کے آگے سجدے میں پڑے ہیں، یہ ان کو پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ مندر ہے، اس کے اندر محمد بن قاسم داخل ہوا اور واپس آیا، ایک چیز بھی نہیں بگاڑی بلکہ نکلنے کے بعد عام اعلان کردیا۔

"اس شہر کے باشندے ہر قسم کے ٹیکس اور محصول سے معاف کئے جاتے ہیں۔" (آئینہ حقیقت نما ص۹)

ملتان کی فتح اور امن وسلامتی کا اعلان

ملتان کو محمد بن قاسم نے فتح کیا، اور کس طرح کیا مورخ کا بیان ہے:۔

"مسلمانوں نے بزور شمشیر ملتان پر قبضہ کیا، اور اہل شہر کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر امن وامان اور معافی کا اعلان کیا، محمد بن قاسم نے ہر جگہ شہروں کے لوٹنے اور رعایا کے اموال پر قبضہ کرنے سے اپنے سپاہیوں کو روکا۔ ... مندروں کی مورتیوں کو جو جواہرات سے مرصع اور سونے چاندی کی بنی

ہوئی تھیں کسی نے ہاتھ نہیں لگایا" (آئینہ حقیقت نما ص۹۱)
ان واقعات کو غور و فکر کی نگاہوں سے ملاحظہ کیا جائے، اور فیصلہ کیا جائے
اسلامی حکومت کے اصول کتنے عمدہ ہیں۔

حجاج بن یوسف کی سندھ کے سلسلہ میں ھدایات

محمد بن قاسم کو سندھ کے لئے سپہ سالار بنا کر حجاج بن یوسف نے بھیجا تھا
تاریخ اسلامی میں حجاج اپنے ظلم و جور میں بری طرح بدنام ہے مگر فتح سندھ کے
سلسلہ میں حجاج نے محمد بن قاسم کو جو ہدایتیں دی ہیں وہ پڑھنے کے لائق ہیں۔ فتح
دیبل کی خوش خبری سن کر حجاج نے لکھا تھا:۔

"جب ملک پر تم قابض ہو جاؤ۔ تو قلعوں کی استواری، اور لشکر کی رفع
احتیاج کے بعد تمام اموال و خزائن کو بہبود رعایا، اور رفاہ خلق میں
خرچ کرو اور یاد رکھو کہ کاشتکاروں، کاریگروں، سوداگروں، اور پیشہ
وروں کی خوش حالی و فارغ البالی سے ملک آباد و سرسبز ہوتا ہے۔
رعایا کے ساتھ ہمیشہ رعایت کرو، تاکہ وہ تمہاری طرف محبت کے ساتھ
راغب ہوں" (آئینہ حقیقت نما ص۹۵)

کہیں لوٹ کھسوٹ کی تعلیم ہے؟ ملک اور رعایا کے ساتھ رفق و ملاطفت
کی کیسی دل نشیں تاکید ہے۔

حجاج کا خط سپہ سالار کے نام

محمد بن قاسم جب نیروں میں مقیم تھا تو حجاج کا گرامی نامہ موصول ہوا:۔

"اہل نیروں کے ساتھ نہایت نرمی اور دلدہی کا سلوک کرو، ان کی بہبودی
کے لئے کوشش کرو، لڑنے والوں میں جو تم سے امان طلب کرے، اس کو
ضرور امان دو، کسی مقام کے اکابر و سردار تمہاری ملاقات کو آئیں، ان کو

قیمتی خلعت اور انعام واکرام سے سرفراز کرو، عقل و دانائی کو اپنا راہبر بناؤ، جو وعدہ کسی سے کرو، ضرور پورا کرو، تمہارے قول وفعل پر سندھ والوں کو پورا پورا اعتماد و اطمینان ہو۔" (آئینۂ حقیقت نما ۹۵/۱۴)

کیا ان ہدایات میں وہ ساری باتیں درج نہیں ہیں؟ جو ایک ذمہ دار کا فریضہ ہوتا ہے، ایک طرح اور غور کیا جائے کہ جو ہدایتیں ہیں وہ ملک و قوم کی فلاح و بہبودی سے متعلق ہیں، یا ان میں ملک اور قوم کا جانی، مالی اور سیاسی نقصان ہے، اخلاق و اعمال کی پاکیزگی کی طرف اشارہ ہے یا ظلم و جور اور بربریت کی طرف؟

سیوستان کی فتح پر اوپر سے ہدایت

سیوستان کی فتح کی خوش خبری معلوم کر کے محمد بن قاسم کے نام اوپر سے ہدایت بھیجی کہ:-

"جو کوئی تم سے جاگیر و ریاست طلب کرے، تم اس کو ناامید نہ کرو۔ التجاؤں کو قبول کرو، امان و عفو سے رعایا کو مطمئن کرو، سلطنت کے چار ارکان ہیں، اول مدارات و درگزر اور محبت، دوم سخاوت و انعام، سوم دشمنوں کی مزاج شناسی، اور ان کی مخالفت میں عقل کو ہاتھ سے نہ دینا، چہارم قوت و شہامت، تم راجاؤں سے جو عہد کرو، اس پر قائم رہو۔ جب وہ مال گذاری دینے کا اقرار کرلیں، تو ہر طرح ان کی امداد و اعانت کرو، جب کسی کو سفیر بنا کر بھیجو تو اس کی عقل و امانت کو جانچ لو۔"

(آئینۂ حقیقت نما ۹۶/۱۴)

کہیں وفاداری کے مطالبہ کی خواہ مخواہ شرط ہے، کہ رعایا سے اپنی مدح اور ستائش کے گیت گانے کا مطالبہ کرو، ان کو اتنا تنگ کرو، کہ گھر چھوڑ کر در بدر کی خاک چھانے، ارکان اربعہ اس قابل ہیں کہ حکمراں ان پر عمل کرنا سیکھیں۔

راجہ داہر کی فوج سے مقابلہ
اور اسلامی فوج کا کردار

محمد بن قاسم دریا پار ہو کر جب داہر کی فوج سے نبرد آزما ہوا، تو حجاج بن یوسف کا ہدایت نامہ ملا۔

"پنج وقتہ نماز پڑھنے میں سستی نہ ہو، تکبیر و قرأت، قیام و قعود، اور رکوع و سجود میں خدائے تعالیٰ کے روبرو تضرع و زاری کرو، زبان پر ہر وقت ذکر الٰہی جاری رکھو، کسی شخص کو شوکت و قوت خدا تعالیٰ کی مہربانی کے بغیر نہیں ہو سکتی، اگر تم خدا تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ رکھو گے، تو یقیناً مظفر و منصور ہو گے۔" (آئینہ حقیقت نما ص۹۶ ج۱)

ممالک اسلامیہ کے بادشاہ، گورنر جنرل، اور وزیر اعظم عبرت و بصیرت کی آنکھوں سے اس خط کو پڑھیں اور دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں اب ان میں یہ عقیدہ اور ایمان کی یہ پختگی باقی رہی ؟ ظالم حجاج کے دل میں دین کی جو وقعت تھی کیا اس کا عشر عشیر بھی ممالک اسلامیہ کے حکمرانوں میں باقی ہے؟ کاش مسلمان اس راز کو سمجھ لیتے اور ان میں اس کا صحیح یقین پیدا ہو جاتا۔ پھر دنیا ان کی تھی۔ اور عزت اور شوکت و عظمت ان کے قدموں سے لپٹی نظر آتی

راجہ داہر کی شکست پر ملک میں
امن و امان کی ہدایت

[illegible] جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کی [illegible] تو اس نے محمد بن قاسم کے نام یہ خط روانہ کیا۔

"[illegible] اور ہر ایک کام شرع کے مطابق ہو، ......

جو لوگ بزرگ اور ذی وقعت ہوں۔ ان کو ضرور امان دو، مسکین شریر اور بدمعاشوں کو دیکھ بھال کر آزاد کیا کرو، اپنے عہد و پیمان کا ہمیشہ لحاظ

رکھ، اور امن پسند رعایا کی استمالت کرو۔" (آئینہ حقیقت نما ص۹۶ ج۱)

رعیت نوازی اور رفاہ عام پر سپہ سالار کی تعریف

ایک دوسرے خط میں محمد بن قاسم کی خدمت کو سراہتے ہوئے لکھا:۔

"اے ابن عم محمد بن قاسم! تم نے رعیت نوازی اور رفاہ عام میں جو کوشش کی ہے، وہ نہایت تعریف کے قابل ہے۔" (آئینہ حقیقت نما ص۹۶)

رعیت نوازی پر اب ایسی حوصلہ افزائی ہوتی ہے؟ اب تو بڑا دیش بھگت وہ ہے، جو تعصب سے کام لے اور جو کام کرے وہ فرقہ وارانہ عینک سے پہلے دیکھ لے۔

خوف وہراس دور کیا جائے
اور مندروں کی مرمت کی جائے

برہمن آباد کی فتح کے بعد پوجاریوں کا ایک معزز وفد محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور یہ شکوہ پیش کیا کہ مسلمان سپاہیوں کے خوف سے ہندو مندروں میں پوجا کے لئے بہت کم آنے لگے ہیں ہماری آمدنی کم پڑگئی ہے ایام محاصرہ میں بعض مندروں کو نقصان پہنچا ہے اس کی مرمت اب تک نہ ہوسکی ہے، لہذا آپ ان مندروں کی اپنے اہتمام میں مرمت کرائیں اور ہندوؤں کو مجبور کریں کہ وہ بے خوف وخطر مندروں میں آکر پوجا کریں، محمد بن قاسم نے جواب دیا کہ تمہارے مندر کا تعلق شہر الور سے ہے اور وہ میرے قبضہ میں نہیں، میں کیسے دخل دوں، پوجاریوں نے کہا، اب ان مندروں کا معاملہ ہم لوگوں کے ہاتھوں میں ہے لہذا اب سب کچھ آپ ہی کو کرنا چاہیئے، محمد بن قاسم نے فوراً یہ تفصیل لکھ کر حجاج کو خبر دی، حجاج نے محمد بن قاسم کو لکھا کہ:۔

"تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ برہمن آباد کے ہندو اپنے مندروں کی

عمارت درست کرنا چاہتے ہیں، چونکہ انھوں نے اطاعت قبول کر لی ہے لہذا ان کو اپنے معبودوں کی عبادت میں آزادی حاصل ہونی چاہئے، اور کسی قسم کا جبر کسی پر مناسب نہیں ہے۔" (آئینہ حقیقت نما ص۹۷)

پجاریوں کے حقوق کی رعایت کا اعلان

جس وقت یہ خط پہنچا، محمد بن قاسم برہمن آباد سے کام کے لئے نکل چکا تھا اور ایک منزل کی دوری پر تھا مگر جونہی یہ گرامی نامہ ملا، فوراً برہمن آباد آیا، اور کام یہ کیا کہ :-

"وہاں کے تمام اکابر و امراء کو بلایا، اور برہمنوں یعنی پجاریوں کے حقوق و مراسم کی تحقیق کی، اور راجہ داہر کے زمانہ میں سلطنت کی طرف سے کیا کیا رعایتیں برہمنوں کو حاصل تھیں، سب کو معلوم کیا، اس کے بعد اس نے شہر میں اعلان کرا دیا، کہ جو لوگ اپنے باپ دادا کے مراسم کے پابند ہیں ان کو ہر قسم کی آزادی ان مراسم کے بجالانے میں حاصل ہے، کوئی شخص معترض نہ ہو سکے گا، برہمنوں کو دان پن، دکشنا، بھینٹ، جس طرح پہلے دیتے تھے، اب بھی دیں، اپنے مندروں میں آزادانہ پوجا پاٹ کریں، محاصل ملکی یعنی سرکاری مالگذاری میں سے تین روپیہ فی صدی برہمنوں کے لئے الگ خزانہ میں جمع کیا جائے گا، اس روپیہ کو برہمن جس وقت چاہیں اپنے مندروں کی مرمت اور ضروری سامان کے لئے خزانہ سے برآمد کرا سکتے ہیں" (آئینہ حقیقت نما ص۹۷)

فاتح مسلمانوں کی مثالی رواداری

کیا اس کے بعد بھی یہی کہا جائے گا کہ مسلمانوں میں رواداری نہیں ہے؟ یہ لیٹرے ہیں، ان لوگوں نے دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ حسن سلوک نہیں

کیا، ملک کی تین فی صدی آمدنی مندر کو کوئی ہندو حکومت بھی دے سکتی ہے؟ حکومت پاکستان کے حکمرانوں کو بھی اس واقعہ کو پڑھنا چاہیئے، اور بھارت کے ان لوگوں کو بھی جو خواہ مخواہ کے تعصب میں مبتلا ہیں۔

پھر آپ کو حیرت ہوگی محمد بن قاسم کے ان تمام کارناموں کو حجاج نے سراہا اور لکھا:۔

"میں تمہارے ملکی انتظام سے بہت خوش ہوا ہوں، تم ایسے کام کرو کہ تمہارا نام روشن ہو، ..... تم بطور خود رعیت نوازی اور عدل گستری کے طریقوں پر آزادانہ عمل درآمد کرو" (آئینۂ حقیقت نما ص ۹۸/۱)

امن وامان اور تاجروں کو آزادی

ایک خط میں حجاج نے لکھ بھیجا:۔

"جو مطیع ہوں، ان کو امان دو، صناع وتاجر پر کوئی محصول یا ٹیکس عائد نہ کرو، جو شخص زراعت میں زیادہ توجہ اور جانفشانی سے کام لیتا ہے اس کی مدد کرو، اور اس کو تقاوی دو، جو لوگ اسلام سے مشرف ہوں، ان سے زمین کی پیداوار کا عشر یعنی دسواں حصہ وصول کرو، اور جو لوگ اپنے مذہب پر قائم رہیں، ان سے وہی مالگذاری وصول کرو، جو وہ اپنے راجاؤں کو دیا کرتے تھے" (آئینۂ حقیقت نما ص ۹۸)

کسی جملہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان حکمرانوں کو اپنی رعایا سے محبت نہ تھی، یا وہ اپنی مطیع رعیت پر ظلم اور ستم ڈھانے کا ارادہ رکھتے تھے عدل ومساوات میں کہیں خامی اور کمی ہے؟ کہنے والے کچھ کہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے کبھی بھی تعصب سے کام نہ لیا، جو حکمراں برا ہوا، وہ ہر ایک کے لئے ہوا، ہندو کے لئے بھی اور مسلمان کے لئے بھی۔

❊ ❊ ❊

ایک عجیب واقعہ
اور پروانۂ آزادی

تاریخ کا ایک عجیب و غریب واقعہ سبھوں کے سننے کے لائق ہے، اور فتح ہو چکا۔ تو کچھ لوگ محمد بن قاسم کے سامنے پیش ہوئے، جو اپنے اعمال و اخلاق کی وجہ سے حکومت کے قانون میں واجب القتل تھے، محمد بن قاسم نے ان کو جلادوں کے سپرد کر دیا، ان میں ایک نے عجیب تدبیر سوچی، اس نے کہا میرے پاس ایک چیز ایسی ہے جسے کسی نے کبھی بھی نہیں دیکھا ہے، جلادوں نے کہا دکھاؤ۔ اس مجرم نے کہا تم کو نہیں، تمہارے سردار محمد بن قاسم کو البتہ دکھا سکتا ہوں، محمد بن قاسم کو اس کی اطلاع ہوئی۔ بلا بھیجا، فرمایش کی کونسی چیز ہے، دکھاؤ۔

"اس نے کہا اس وقت دکھاؤں گا، جب کہ مجھ کو اور میرے سارے کنبہ کو امان دی جائے، محمد بن قاسم نے کہا میں نے امان دی، اس نے کہا اپنا تحریری اور دستخطی امان نامہ دو۔ تو دکھاؤں، محمد بن قاسم نے سمجھا کوئی بڑی ہی بیش قیمت چیز ہوگی، لہذا امان نامہ پر دستخط کر کے اس کے حوالہ کیا، امان لے کر اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا، سر کے بال کو بکھیر دیا، ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا، اور پاؤں کی انگلیوں کو اپنے سر سے لگایا، پھر ناچنے لگا اور کہنے لگا کہ کسی شخص نے میرا یہ عجیب و غریب تماشا نہیں دیکھا ہوگا۔ محمد بن قاسم اپنی غلطی پر حیران تھا، لوگوں نے جو موجود تھے کہا، یہ کیا عجیب تماشا ہے جس کے لئے امان دی جائے، اس نے ہم کو دھوکہ دیا ہے، اسے قتل کرنا چاہیئے۔ محمد بن قاسم نے کہا کہ "قول مرداں جان دارد"، میں چونکہ اس کو امان دے چکا ہوں، اس لئے اپنے عہد سے نہیں پھر سکتا، ہاں یہ مناسب ہے کہ اس کو قید رکھا جائے، اور اس معاملہ میں حجاج سے فتویٰ طلب

کیا جائے، جب حجاج کے پاس یہ تمام کیفیت لکھی ہوئی پہنچی تو اس نے خلیفہ ولید بن عبدالملک اور کوفہ و بصرہ کے علماء کو لکھا اور اس معاملہ میں فتویٰ طلب کیا، خلیفہ نے بھی اور علمائے کوفہ و بصرہ نے بھی حجاج کو لکھا کہ اس مجرم کے ساتھ جو وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور پورا ہونا چاہئے، چنانچہ حجاج کے پاس سے جواب آنے پر وہ شخص اور اس کے کنبہ کے بائیس آدمی جو واجب القتل تھے رہا کر دیئے گئے " (آئینہ حقیقت نما ص۹۸)

موجودہ لیڈروں کی نظروں سے یہ تاریخی واقعہ گذرے گا تو قہقہہ مار کر ہنسیں گے اور کہیں گے " ذراسی بات تھی جسے افسانہ کر دیا " دھوکہ دینے والوں کے ساتھ رحم کا سوال کیسا؟ اور پھر اس نے ایک چال چلی، حکومت بیسیوں چال چل سکتی تھی، بلکہ بہت سے روشن خیال پکار اٹھیں گے " تب تو انگریزی داں کہتے ہیں کہ علماء سیاست نہیں جانتے "، اور بالکل درست ہے مذہبی قسم کے لوگ موجودہ دور میں سیاست کے مرد میدان نہیں بن سکتے، یہ تو ہر بات میں مسئلہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔

مگر سوچنا چاہئے کہ مسلمانوں میں ایفائے وعدہ کتنا ضروری سمجھا جاتا تھا دھوکہ کا جواب دھوکہ نہیں، سچائی اور اخلاق ہے۔ آگ آگ سے نہیں پانی سے بجھتی ہے۔

مندروں کے لئے جاگیریں

"محمد بن قاسم اور اس عہد کے مسلمان گورنروں نے ملک سندھ میں ہندوؤں کے مندروں کے لئے بڑی بڑی جاگیریں وقف کیں " (آئینہ حقیقت ص۹۹)

مگر پھر بھی مہا سبھائیوں ہندوؤں کی نظر میں مسلمان حکمراں "ہندو کش اور ظالم" ہی رہے۔

صناعوں کی مدد اور برہمنوں کیلئے حکومت میں عہدے

سندھ میں محمد بن قاسم نے ان پیشہ دروں کی حکومت کی طرف سے مدد کی جن کا

کاروبار کسی وجہ سے بند ہوگیا تھا، برہمنوں کو جب معلوم ہوا کہ حکومت کی طرف سے پبلک پر رحم وکرم کی بارش ہو رہی ہے، برہمنوں نے آکر درخواست کی، کہ :-

”راجہ داہر ہمارا ہم قوم تھا، اور ہم ہی سلطنت کے تمام معزز عہدوں پر مامور تھے سب ہماری حکومت کو مانتے اور ہم کو سب سے زیادہ معزز جانتے تھے ہمارے لئے آپ نے کیا انتظام کیا ہے، محمد بن قاسم نے تحقیق کرنے کے بعد کہ برہمن واقعی ایک معزز اور امورِ سلطنت سے واقف قوم ہے، حکم دیا کہ برہمنوں کو سلطنت اسلامیہ کے معزز عہدوں پر مامور کیا جائے، چنانچہ محکمہ مال کا تمام انتظام برہمنوں کے سپرد کردیا..... زرمالگذاری کا وصول کرنا، اس کا حساب رکھنا، خزانہ کی حفاظت کرنا، سب برہمنوں کے سپرد کردیا گیا، چنانچہ محمد بن قاسم کے زمانہ سے لے کر آئندہ ہر زمانہ میں ملک سندھ کا مالی محکمہ برہمنوں ہی کے ہاتھ میں رہا..... برہمن، محمد بن قاسم سے جس شخص کی سفارش کرتے، وہ اس کے مرتبہ کو بلند کردیتا تھا محمد بن قاسم نے برہمنوں کو تاکید کردی تھی، کہ کاشتکاروں سے محصول یا بٹائی وصول کرنے میں ہرگز کوئی سختی نہ کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو کاشتکاروں کو سہولتیں دی جائیں، جس کاشتکار کے یہاں پیداوار کم ہو، اس کو سرکاری لگان معاف کردیا جاتا ہے“ (آئینہ حقیقت نما ص۱۱۱)

مسلمانی حکومت میں برہمنوں کی عزت افزائی

اسے رواداری کہیں گے یا ظلم اور ستم ؟ اہلِ ملک کو دوست سمجھا یا دشمن؟ ہندوؤں کی مسلمان حکمرانوں نے عزت کی یا ذلیل کیا ؟ پھر غور کیجئے کاشتکاروں اور ملک کے دوسرے پیشہ وروں کے ساتھ کتنا حسن سلوک برتا جارہا ہے، آزاد بھارت کی طرح ٹیکس پر ٹیکس تو عائد نہیں کئے، ریل کرایہ، لفافہ، کارڈ اور رجسٹری فیس میں تو اضافہ کی ان کو نہ سوجھی ؟ زمینداری بھارت میں اٹھتی جارہی ہے اور کسان سمجھے جا رہے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو، کہ ریل کے کرایہ کی طرح دونی مالگذاری

بھی کردی جائے اور پھر دو سال کے بعد ڈھائی گنی ہو جائے، اور دیر سویر غالباً یہ ہو کر رہے گا، یہاں تو وزیروں اور ارکین پارلیمنٹ اور اسمبلی و کونسل اور دوسرے عہدیداروں کی جیبیں بھرنی چاہئے، پبلک بھکاری ہو گئی تو کیا، بلکہ کچھ فائدہ ہی ہوگا کہ لالچ دلا کر ووٹ حاصل کرنے میں آسانی ہوگی۔

محمد بن قاسم سے باشندگان ملک کی عقیدت

محمد بن قاسم نے قوم اور ملک کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ :-

"وہ ملک سندھ سے رخصت ہوا ہے، تو عام طور پر تمام ملک میں رنج و ملال کا اظہار کیا گیا، شہر کیرج کے ہندوؤں اور بدھوں نے اپنے شہر میں محمد بن قاسم کا ایک بت بنا کر رکھا، اور اس کی پرستش شروع کردی"

(آئینہ حقیقت نما ص۱۰۱)

بت تو اب بھی قائم کئے جاتے ہیں، جس میں ہاتھ خود بت والے ہی کا ہوتا ہے مگر اسے دیکھ کر لوگ گالیاں دیتے ہیں اور بد دعائیں کرتے ہیں، مسرت نہیں ہوتی، نفرت سے دل بھر جاتا ہے۔

مسلمان حکمراں کی طرف سے راجہ جے پال کی معافی

راجہ جے پال نے سبکتگین کو بار بار تنگ کیا اور بہت چاہا کہ غزنی حکومت کو تباہ و برباد کر دے، پہلی مرتبہ غزنی حکومت پر حملہ آور ہوا، اور گرفتار ہوا، اس نے سبکتگین کے پاس درخواست بھیجی :-

"مجھ سے بڑی خطا ہوئی ہے آپ اس مرتبہ میرا قصور معاف کر دیں، میں آئندہ ہمیشہ آپ کا فرماں بردار رہوں گا، اور پنجاب پہنچ کر بہت سا چاندی سونا بطور جرمانہ آپ کے پاس بھیجوں گا، آپ اپنے آدمی میرے ہمراہ بھیج دیجئے

میں ان کے ہمراہ خزانہ اور قیمتی تحفے مع پچاس ہاتھیوں کے بھیج دوں گا۔"

(آئینۂ حقیقت نما صفحہ ۱)

سبکتگین کے سرداروں نے کہا کہ قابو میں آئے ہوئے دشمن کو چھوڑنا دانائی اور عقل کے خلاف ہے، مگر سبکتگین نے اسلامی تعلیم پر عمل کیا اور اس کی درخواست صلح کو منظور کر لیا اور اسے معاف کر دیا، مگر یہ سن کر حیرت ہوگی کہ راجہ جے پال نے وعدہ خلافی کی، سبکتگین کے آدمیوں کو گرفتار کر لیا اور پورے ملک کے راجاؤں کو دعوت دی کہ میری مدد کرو اور سب مل کر غزنی حکومت کو تہس نہس کر دو۔

معافی کا بدلہ اور جے پال کا حملہ سبکتگین پر

سلطان سبکتگین کو پہلے یقین نہ آیا مگر جب اس کے آدمی واپس نہیں آئے تو جاسوس بھیجا اور اس وقت پتہ لگا کہ عنقریب وہی جے پال جو کل معافی کی درخواست کے ذریعہ جان بچا کر گیا ہے حملہ آور ہونے والا ہے، اور یہی ہوا:۔

"اس مرتبہ لمغان کے میدان میں جے پال کے ساتھ تین لاکھ جرار فوج اور بہت سے جنگی ہاتھی تھے۔"

اور سبکتگین کے پاس ساٹھ ہزار سے زیادہ فوج نہ تھی، پہلے گھبرایا، مگر پھر سبکتگین نے ہمت و جرأت کی، اور مقابلہ کیا، قدرت نے مدد کی نتیجہ یہ ہوا کہ جے پال شکست کھا کر بھاگا، گویا پورا ہندوستان حسرت کدہ بن گیا۔

دس ہزار فوج ڈیڑھ لاکھ فوج پر غالب آئی

امیر سبکتگین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمود غزنوی مسند حکومت پر بیٹھا تو جے پال نے اس امید میں کہ تجربہ کار بادشاہ مر چکا ہے ناتجربہ کار محمود کو

ایک ہی حملہ میں شکست دیدیں گے بڑی قوت سے غزنی پر تیسرا حملہ کیا، اور اس مرتبہ بھی جے پال کی ڈیڑھ لاکھ فوج نے محمودؒ کی دس ہزار فوج کے ہاتھوں شکست کھائی جے پال گرفتار ہوا، غزنی میں جے پال سے پوچھا گیا تو نے بار بار کیوں پریشان کیا، جے پال نے کہا :-

"اس مرتبہ میری خطا اور معاف کی جائے، اور مجھ کو چھوڑ دیا جائے، میں اب تازیست انحراف نہ کروں گا، اور پنجاب کو غزنی کا ایک صوبہ سمجھ کر حکومت کروں گا، اور سالانہ خراج بلا عذر و حیلہ بھیجتا رہوں گا، محمود نے انتہائی شرافت کو کام میں لاکر راجہ کی استدعا قبول کرلی، اور غزنی سے لاہور کی جانب روانہ کردیا" (آئینہ حقیقت نما)

مگر الٹے تاریخوں میں اسی کو محمود غزنوی کا حملہ قرار دیا جاتا ہے ؎ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است ہمسلمان حکمرانوں کا رحم و کرم ملاحظہ فرمائیں، جنگ و فساد سے کتنا اجتناب کیا جارہا ہے مگر دشمن ہے جو شکست کھانے کے بعد بھی حملہ آور ہو رہا ہے، ایسے موقعہ پر کیا کرنا چاہیئے ؟

دشمن کے ساتھ مروّت کا برتاؤ

اس کے بعد بھی جے پال اور جے پال کے بیٹے انند پال نے حکومت غزنی کو تباہ و برباد کرنے کی سعی کی، مگر ہر بار گرفتار ہوا، اور معافی کی درخواست کر کے جان بخشی چاہی، اور ہر مرتبہ جان بخشی کی گئی، ــــــ اخیر میں بدنام محمود غزنوی کے باب میں انفسٹن صاحب کا یہ قول ملاحظہ فرمایئے :-

"یہ ثابت نہیں ہوتا، کہ اس نے (سلطان محمود نے) ایک ہندو کو بھی مسلمان بنایا ہو، سوائے لڑائی کے کسی ہندو کو اس نے قتل نہیں کیا"

(آئینہ حقیقت نما ص۱۵۱)

ؒ محمود غزنوی کو ۳۹۳ھ / ۱۰۰۲ء میں ہندوستان آنا پڑا، اور ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء میں غزنہ میں اس نے وفات پائی،

سلطان بلبن کی عدل پروری

سلطان بلبن کے متعلق لکھا ہے کہ :۔

"عدل وانصاف قائم رکھنے کا اس کو سب سے زیادہ خیال تھا، اس معاملہ میں وہ اپنے بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں کی بھی مطلق پرواہ نہیں کرتا تھا"

(آئینۂ حقیقت نما ص۲۵۵)

تاریخ کے اس سلطان سے حکمراں طبقہ کو سبق حاصل کرنا چاہئے، ایک حکمراں کا یہی فریضہ ہے کہ وہ انصاف کی عدالت میں کسی کی بھی تمیز نہ کرے، دوست دشمن، اپنے اور غیر سب اس کی نظر میں برابر ہوں۔

ایک نوکر کے مقدمہ میں سلطان کا انصاف

سلطان کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ:۔

"ایک مرتبہ ایک نہایت عالی جاہ امیر نے جو بدایوں کا صوبہ دار، اور چار ہزار اپنے ذاتی سوار رکھتا تھا، ایک پیش خدمت کو کسی بات پر ناراض ہوکر تازیانے سے پٹوایا، تازیانہ کی ضربات سے وہ جاں بر نہ ہو سکا، اس خدمت گار کے اس طرح مرنے کا حال سلطان بلبن کو معلوم ہوا، تو اس نے امیر مذکور کو اسی طرح کوڑوں سے پٹوایا، یہاں تک کہ اس کا دم نکل گیا، پھر اس کی لاش کو شہر کے دروازے پر لٹکا دیا، تاکہ دوسروں کو عبرت ہو، اور وہ اپنے ضعیف ماتحتوں پر ظلم روا رکھنے اور بیدردانہ سزائیں دینے کی جرأت نہ کرسکیں" (آئینۂ حقیقت ص۲۵۵)

اسے کہتے ہیں عدل و مساوات، اور عوام اور غریب و بے کس کا درد، اس دور میں جو تہذیب و تمدن اور جمہوریت کا دور کہا جاتا ہے، اگر کسی گورنر سے ظلم کا ارتکاب ہو جائے، تو اوپر سے نیچے تک سارے لوگ چاہیں گے، اس پر پردہ پڑ جائے

لہ ۶۶۴ھ میں سلطان ناصر الدین کا انتقال ہوگیا تو غیاث الدین بلبن بادشاہ بنا، بیس سال حکومت ۱۲۶۶ء کرکے ۶۸۵ھ م ۱۲۸۶ء میں انتقال کرگیا۔

اور گورنر صاحب کا قصور ثابت نہ ہو، بلکہ غریب ملازم اور نوکر ہی کو مجرم ثابت کیا جائے، چنانچہ آئے دن مظالم ہوتے رہتے ہیں اور حکام بالا کے سروں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

سلطان بلبن کا انصاف ایک بیوہ کے حق میں

اسی سلطان بلبن کا ایک اور واقعہ سننے کے لائق ہے:۔

"ملک ہیبت خاں حاکم اودھ نے ایک شخص کو ناجائز طور پر قتل کیا، مقتول کی بیوی نے بادشاہ سے فریاد کی، بادشاہ نے ہیبت خاں کو پانسو کوڑے لگوائے، اور مقتول کی بیوہ سے کہا، کہ یہ آج تک ہمارا غلام تھا، اب تیرا غلام ہے، چاہے اس کو جان سے مار ڈال، اور چاہے زندہ رہنے دے، ہیبت خاں نے بہت سے لوگوں کو منت سماجت کرکے اپنا سفارشی بنایا، اور بیس ہزار روپیہ دے کر، اس عورت سے دستاویز لکھا کر اس کی غلامی سے آزادی حاصل کی" (آئینہ حقیقت نما ص۵۵)

اگر موجودہ دور میں اسی طرح کا انصاف ہونے لگے، اور جس طرح چھوٹوں کو جرم پر سزا دی جاتی ہے، بڑے لوگوں کو بھی سزائیں دی جائیں، تو پوری دنیا میں سکون و اطمینان ہو جائے اور کمیونزم کا زور آن کی آن میں ختم ہو جائے، مگر حیرت یہ ہے کہ بڑے لوگ اپنی بے ہودگیوں کو بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ کمیونسٹ جماعت کی ترقی بند ہو جائے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔

سلطان علاء الدین نے ملک کی اصلاح کسطرح کی

سلطان[1] علاء الدین کے متعلق مورخوں کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جب

[1] علاء الدین خلجی ۶۹۶ھ/۱۲۹۶ء میں دہلی کے تخت پر بیٹھا اور ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء میں وفات پائی۔

وہ دہلی پہنچا، تو :-

"سب سے پہلا کام یہ کیا، کہ شراب خوری سے توبہ کر کے منادی کرادی کہ آئندہ کوئی شخص شراب استعمال نہ کرے، چنانچہ اس نے اپنی حدود حکومت سے نہایت کامیابی کے ساتھ شراب خوری کا نام و نشان مٹادیا، خفیہ پولیس محکمہ قائم کیا... کسی کی مجال نہ تھی جو کاشتکار سے ایک حبہ یا ایک دانہ زیادہ وصول کر سکے، رشوت قطعاً موقوف ہوگئی، جھوٹ بولنے کی سخت سزا مقرر کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی حدود حکومت سے کذب و دروغ گوئی کا نام و نشان مٹ گیا، ..... ملک میں ضروریات زندگی کی اس قدر ارزانی ہوگئی کہ گندم ساڑھے سات جیتل کے ایک من آتے تھے، جیتل تانبے کا سکہ تھا، ایک روپیہ میں چالیس جیتل ہوتے تھے، یعنی فی روپیہ پونے چھ من گندم آتے تھے"

(آئینہ حقیقت نما ص۲۷)

واقعہ یوں ہی ہے کہ سلطان اور حکام بالا درست ہو جائیں تو پورا ملک سدھر جائے، اب تو بڑے لوگ سارا عیب غریبوں کا ہی بتاتے ہیں اپنے عیوب پر قطعاً نظر نہیں کرتے، اپنے کو منزّہ اور پاکیزہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی پرائیوٹ زندگی گندگیوں میں لتھڑی ہوئی ہوتی ہے، دنیا کی ساری برائیاں ان میں موجود ہوتی ہیں اور زبان کے سوا ان کا سب کچھ گندہ ہوتا ہے۔

شاہی محل میں امام رازیؒ کی تقریر

سلطان شہاب الدین غوری کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ اس کو علماء سے بڑی عقیدت تھی اور دین سے گہرا تعلق تھا، امام فخر الدین رازی کے متعلق بیان ہے کہ یہ محل شاہی میں تشریف لاتے اور وعظ فرماتے چنانچہ ایک دفعہ

آپ نے سلطان کو دورانِ وعظ میں خطاب کرکے فرمایا:-

"اے بادشاہ! نہ تیری یہ حکومت باقی رہے گی، اور نہ رازی کی یہ تلبیس رہے گی اور ہم سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹنا ہے، سلطان پران فقروں کا یہ اثر ہوا کہ بے ساختہ رونے لگا، اور اتنا رویا کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا تھا"

(مسلمانوں کا عروج وزوال ۲۲۵)

جس سلطان کا دل خشیت الٰہی سے اس قدر معمور ہو، بھلا بتلایا جائے کہ وہ اپنی پبلک اور ملک کے حق میں کتنا اچھا بادشاہ ہوگا، اور اس کا اثر پورے ملک پر کیسا خوشگوار پڑتا ہوگا، ہمارے اس زمانہ کے معمولی مالدار کبر ونخوت سے سر پڑھا کر کے چلتے ہیں، اور ان کے سامنے خدا کا نام لیا جائے، تو غصہ سے ان کی رگیں پھولنے لگتی ہیں۔

سلطان غوری کا ذوق تعلیم وتربیت

سلطان غوری[1] کے جسمانی اولاد میں صرف ایک لڑکی تھی، کوئی لڑکا نہ تھا مگر اس کے شوق کا عالم یہ تھا:-

"غلام خریدتا، اور خاص طور پر ان کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتا تھا، اس سلسلہ میں اس کے چالیس غلام ایسے تھے، جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہترین تربیت سے بہرہ مند تھے، سلطان انہی کو اپنی جسمانی یادگار سمجھتا تھا"

(مسلمانوں کا عروج وزوال ۲۲۲)

سلطان کو مکارم اخلاق کا پیکر کہا جا سکتا ہے، جس نے ایسا کام کیا جو کام تاریخ میں اس سے پہلے شاید ہی کسی نے کیا ہو۔

---

[1] غوری ۵۴۳ھ / ۱۱۴۸ء میں غور میں پیدا ہوا، ۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء میں ہندوستان آیا، رائے پتھورا مارا گیا دہلی پر اس کا قبضہ ہوا، ۶۰۲ھ / ۱۲۰۶ء میں ایک شیعہ کے ہاتھ سے مارا گیا۔

سلطان التمش کے شاہی محل میں مشائخ کا اجتماع

سلطان شمس[1] الدین التمش میں بہت خوبیوں کے ساتھ ایک بڑی خوبی یہ تھی، کہ وہ وعظ سننے کا بڑا مشتاق تھا اور ہفتہ میں ایک دن ایسی مجلس منعقد کرتا، جس میں لوگوں کو اس کی ذات پر تنقید کی پوری آزادی ہوتی۔

"سیرالعارفین کی روایت ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد سلطان اپنے محل میں ایک اجتماع منعقد کرتا تھا جس میں اکابر و اشراف و مشائخ شریک ہوتے تھے، اس اجتماع میں شرکاء بزم پوری آزادی سے بادشاہ اسلام کے فرائض و واجبات کے اظہار خیال کرتے، اور بادشاہ ان سب کو بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنتا تھا" (مسلمانوں کا عروج و زوال ص۲۳۱)

فرمایا جائے اب کوئی بادشاہ امیر اور مالدار اس زحمت کے لئے تیار ہوگا، اپنے اوپر آج کل کوئی بڑا آدمی تنقید پسند کرتا ہے؟ التمش کا یہ طریقہ بہت مناسب اور مفید تھا خود اس کے لئے بھی اور پبلک کے لئے بھی ہمارے اس زمانہ کے ارباب حکومت کو بھی یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

سلطان التمش کے ذاتی اوصاف

اس سلطان کے بارے میں لکھا ہے کہ ذکر الٰہی میں پوری پوری رات بیدار رہتا، برائے نام سوتا تھا، بابا فرید کا بیان ہے۔

"اعتقاد کا بڑا مضبوط تھا، رات رات بھر جاگا رہتا، کوئی اسے نیند میں غافل نہیں دیکھ سکتا تھا، جب دیکھئے عالم تحیر میں کھڑا ہے، اگر تھوڑی دیر سوتا تو پھر خود بیدار ہوتا، بستر سے اٹھتا، پانی لیتا اور وضو کرکے مصلی پر

---

[1] سلطان شمس الدین التمش نے قطب الدین سے اپنی لڑکی کی شادی کردی، ۶۰۷ھ ۱۲۱۰ء میں تخت پر بیٹھا، ۶۳۳ھ ۱۲۳۶ء میں اس کا انتقال ہوا۔

کھڑا ہو جاتا، رات میں کسی خدمت گار کو نہیں جگاتا تھا، اور کہتا کہ آرام کرنے والوں کو کیوں زحمت دوں" (مسلمانوں کا عروج وزوال ص۲۳۰)

اب تو اس زمانہ کے علمار کرام میں بھی یہ اہتمام بہت کم رہ گیا ہے، نوجوان علمار کرام کی حالت اس سلسلہ میں اور بھی ناگفتہ بہ ہے اور خاندانی جاہل پیر اور پیرزادوں کی حالت، الاماں الحفیظ، ان کا ظاہر جتنا اچھا، ان کی پوشاک جتنی زرق برق، عموماً ان کا باطن اسی قدر تاریک، گندہ اور آلائشوں سے معمور ہوتا ہے، ہاں کچھ لوگ ضرور ایسے ہیں جن میں سوز وگداز، اور بے چینی اور تڑپ ہے، ممالک اسلامیہ کے ارباب حکومت کے لئے اس واقعہ میں بڑا مؤثر سبق ہے، کاش وہ اسے غور سے پڑھیں، ہمارے پڑوسی ملک پاکستان کے اربابِ حکومت کو خصوصیت کے ساتھ اس واقعہ سے سبق لینا چاہئے جو فرائض تک کو ادا نہیں کرتے۔

بادشاہ خواجہ قطب الدین کی خدمت میں

سلطان التمش کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ؒ سے بڑی عقیدت تھی اور یہ سب عشق الٰہی کا نتیجہ تھا، اس سلسلہ کے ایک واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کو مرنے کے بعد اپنی نجات کی بڑی فکر تھی، قطب صاحب رحمہ اللہ کا بیان ہے:۔

"ایک رات سلطان مجھ دعا گو کے پاس آیا، اور آتے ہی میرے پاؤں پکڑ لئے، میں نے کہا، کیا کوئی تکلیف ہے؟ اگر کوئی حاجت ہو تو بیان کیجئے سلطان نے جواب دیا، حاجت تو اس خدا کے فضل وکرم سے جس نے مجھ کو یہ مملکت اور سلطنت دی ہے، کوئی نہیں ہے، مجھ کو صرف یہ بتا دیجئے کہ قیامت کے روز میرا حشر کس گروہ کے ساتھ ہوگا؟" (مسلمانوں کا عروج وزوال ص۲۳۰)

نجات کی فکر بڑی فکر ہے، جس کو آخرت کا اس قدر کھٹکا ہو، اس کے قلب کا

حال کیا پوچھنا، اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے التمش واقعی سلطانِ وقت تھا ایسے ہی سلطان کی دنیا کو ضرورت ہے، جس ملک کے بادشاہ کا یہ حال ہو، کھلی بات ہے، اس ملک پر اپنے بادشاہ کا کچھ نہ کچھ ضرور اثر ہوگا، کیونکہ مشہور ہے "الناس علی دین ملوکھم"۔

خواجہ قطب الدین کی نماز جنازہ کی امامت

خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا، اور جنازہ لایا گیا، تو خواجہ ابوسعیدؒ نے کہا کہ حضرت خواجہ کی وصیت ہے:۔

"میرے جنازہ کی نماز صرف وہ شخص پڑھائے، جس نے کبھی زنا نہ کیا ہو، اور عصر کی سنتیں اور تکبیر اولی ترک نہ کی ہوں"

اس مجمع میں سلطان التمش بھی موجود تھا، اب لوگ انتظار میں رہے کہ ایسا شخص مجمع سے نکلے اور نماز جنازہ پڑھائے، سلطان خود بھی اسی انتظار میں رہا، مگر اس میں ناکامیابی ہوئی پھر کیا ہوا؟

"لیکن آخر جب کسی شخص نے نماز جنازہ میں امامت کرنے کی جرأت نہ کی کہ وہ اپنے اندر وہ اوصاف نہیں پاتے تھے جن کی وصیت تھی، تو سلطان خود آگے بڑھا اور بولا، میں اپنی نمازوں کی تشہیر اور نمائش پسند نہیں کرتا، لیکن حضرت خواجہ صاحبؒ کی وصیت کی تعمیل بہرحال ضروری ہے، یہ کہہ کر سلطان نے نماز پڑھائی اور جنازہ کو کاندھا دیتا ہوا قبرستان لے گیا"

(مسلمانوں کا عروج و زوال ص۲۳۲)

اس زمانہ میں ایسے سلطان قوم و ملک کو کہاں نصیب ہوں گے؟ اب متقی، پرہیزگار اور پابند سلطان اور وزیر عنقا ہے۔ ہاں ظالم و جابر، فاسق و فاجر اور گناہ گار کی کمی نہیں ہم تو دن رات سنتے ہیں کہ صوبہ اور مرکز کے فلاں وزیر بدکاری میں مبتلا ہیں۔ عیاشی میں اور اسی عیاشی کی خاطر بڑی بڑی

بے انصافیاں کرتے ہیں، تو بتایا جائے جب بڑوں اور حکمرانوں کا یہ حال ہوگا، تو قوم اور ملک کے دوسرے افراد کا کیا پوچھنا۔

ممالک اسلامیہ کے صدر اور وزراء کی دینی حالت جیسی کچھ ہے، وہ کسی باخبر سے مخفی نہیں، پتہ نہیں ان حکمرانوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے بھی یا نہیں۔

سلطان کا بیٹوں کے بجائے بیٹی کو ولی عہد بنانا

سلطان التمش ہی کا واقعہ ہے کہ اس نے لڑکوں کے موجود ہونے کے باوجود صرف اس لئے بیٹی کو ولی عہد بنایا کہ بیٹے حکومت کے اہل نہیں تھے بیٹی کو جس وقت وہ ولی عہد بنا رہا تھا اس وقت اس سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو اس نے کہا:-

"میں اپنے بیٹوں کے عادات واطوار سے خوب واقف ہوں، اس وقت بھی جب وہ میرے دست نگر ہیں دن رات شراب خوری اور عیاشی میں مصروف رہتے ہیں، میں ان کو اس قابل نہیں سمجھتا، کہ سلطنت کا بار اٹھا سکیں، بخلاف اس کے رضیہ اگرچہ عورت ہے لیکن فہم وفراست کے اعتبار سے حقیقتاً مرد ہے اور اسی وجہ سے میں اسے بیٹوں پر ہر طرح ترجیح دیتا ہوں"۔ (مسلمانوں کا عروج وزوال ص۲۳۵)

اب اس کا خیال کون کرتا ہے، اب کسی کو عہدہ دینے کے لئے صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ بڑا آدمی ہے یا نہیں، کسی بڑے باپ کا بیٹا ہے یا نہیں، صلاحیت کی جانچ کون کرتا ہے، ہم اپنے ملک میں آئے دن دیکھتے ہیں کہ ملک وقوم کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دی جاتی ہے جو اپنی پارٹی کا حامی ہے انجمن یا جماعت میں چندہ زیادہ دیتا ہے، اور صحیح وغلط دونوں کی حامی بھرتا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

سلطان ناصرالدین کی
خدا ترسی

سلطان التمش کا چھوٹا بیٹا ناصرالدین[1] جو رضیہ کے بعد دو بادشاہوں کے حکومت کرنے کے بعد بادشاہ بنا، اس کے متعلق نظام الدین احمد مولف طبقاتِ اکبری کا بیان ہے :-

"سلطان ناصرالدین ہر سال دو قرآن شریف اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا، اور انہی کا ہدیہ، سلطان کے ذاتی خورد و نوش میں صرف ہوتا تھا، ایک مرتبہ بادشاہ کے لکھے ہوئے قرآن مجید کو ایک امیر نے معمول سے زیادہ قیمت دے کر ہدیۃً لیا، تو بادشاہ نے حکم دیا، کہ آئندہ سے اس کے لکھے ہوئے نسخہائے قرآن مجید کو پوشیدہ طریقہ پر یعنی اس کا نام بتائے بغیر رائج الوقت قیمت پر ہدیہ کیا جائے، بادشاہ کے گھر میں اس کی بیوی کے سوا کوئی لونڈی یا خادمہ کام کرنے کو نہ تھی، ایک روز بیوی نے امور خانگی سے تنگ آکر ایک لونڈی خریدنے کی فرمائش کی، تو بادشاہ نے جواب دیا "بیت المال بندگانِ خدا کا حق ہے، میں اس کا مجاز نہیں ہوں کہ اس میں سے کچھ روپیہ لے کر اپنے ذاتی آرام کے لیے لونڈی خریدوں، دنیا کی تکلیفوں کو صبر کرو خدا آخرت میں اس کا بدلہ دے گا" (مسلمانوں کا عروج و زوال ص۲۳۶)

"اکل حلال" کا یہ اہتمام کیا بتاتا ہے؟ بادشاہِ وقت ہے اور اس طرح عسرت کی زندگی بسر کرتا ہے، پھر اس کا گوشت و پوست اور خون جو حلال روزی سے تیار ہوا ہے، اس سے کبھی کوئی کمینہ اور پست خصلت پیدا ہو سکتی ہے؟ اور بادشاہ کی اس طرزِ زندگی کا اثر کیا عوام اور پبلک پر کچھ نہ ہوگا؟ حق یہ ہے

---

[1] سلطان ناصرالدین محمود ۶۴۴ھ (۱۲۴۶ء) میں سریر آرائے سلطنت ہوا، اور ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء) میں وفات پائی۔ بیس سال حکومت کی۔ (مختصر تاریخ ہند ص۵۳)

کہ انہی جیسے لوگوں نے خدمتِ خلق انجام دی، اور صحیح خدمت انجام دی، اس میں بڑی برکت ہوئی، ملک اور قوم کے اخلاق و اعمال متاثر ہوئے۔

ہمارے ملک کا حکمراں طبقہ

ہمارے اس زمانہ کے صدر جمہوریہ دس ہزار کا ماہانہ وظیفہ لیتے ہیں، اور ہزاروں روپے ان کی ذات پر دوسرے راستہ سے خرچ ہوتے ہیں، جی چاہے تو ان کو حفاظتی انتظام کہہ لیجئے، کیا با ایں ہمہ آپ ان کو مخلص کہیں گے، اپنا خیال تو یہ ہے کہ ہمارے دور کے بادشاہ، صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، اور دوسرے وزراء اور حکام ملک اور قوم کی خدمت نہیں کرتے، بلکہ ملک اور قوم ان لوگوں کی، ان کے خاندانوں کی، اور ان کے جاہ و حشمت کی خدمت کرتے ہیں۔

ہمارا "آزاد بھارت" جہاں وہ لوگ حکمراں ہیں، جنہوں نے کل تک اپنے اخلاص اور خدمتِ ملک کا ڈھنڈورا پیٹا تھا، ان کا حال یہ ہے کہ اگر حساب لگایا جائے، تو ہر صوبہ اور مرکز میں چچا بھتیجا مل کر ملک کی نصف دولت اپنے پیٹ میں ڈال لیتے ہیں، اور نصف دولت پورے ملک پر صرف ہوتی ہے، بھتہ اور تنخواہ میں کمی کا سوال اٹھایئے تو بول اٹھیں گے، پھر ہمارا وقار باقی نہ رہے گا، گویا ڈبل ڈبل مشاہرہ پر یہ اپنے وقار کی بنیا دکھڑی کئے ہوئے ہیں۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

غیاث الدین کے ذاتی کمالات
اور رعایا سے ہمدردی

غیاث الدین بلبن کا واقعہ لکھا ہے کہ اس میں کمزور کے ساتھ ہمدردی کا

بڑا صحیح جذبہ تھا، فرشتہ کا بیان ہے :-

"طبیعت میں غم زدہ لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ اس قدر تھا کہ علاوہ نماز جنازہ میں شریک ہونے کے میت کے گھر پر جاتا تھا اور مرحوم کے پس ماندگان کو صبر اور راضی برضا رہنے کی تلقین کرتا تھا اور یتیم بچوں کی پرورش کے لئے گراں بہا وظیفے مقرر کرتا تھا، راستہ میں چلتے چلتے اگر کہیں مجلس وعظ نظر آتی تھی تو فوراً گھوڑے سے اتر کر مجلس میں شریک ہوتا، اور وعظ میں خدا اور رسول کے احکام بغور سن کر زار، زار، روتا تھا"

(مسلمانوں کا عروج وزوال صفحہ ۲۴۰)

اب یہ بات تو ہمارے علماء کرام میں بھی جو خاص دینی طبقہ کہا جاتا ہے، باقی نہیں رہی۔ مالدار، عہدہ دار اور صاحب جاہ وحشمت کے یہاں تو ہمدردی کے لئے جا سکتے ہیں، مگر بے کسوں، غریبوں اور یتیموں کی ہمدردی کون کرتا ہے؟ یہ غریب طبقہ ان بزرگانِ دین کی نگاہوں میں بھی "انسانیت" سے خارج ہے، الا ماشاء اللہ کچھ لوگ ایسے ضرور طبقہ علماء میں رہ گئے ہیں جو ہر ایک کو ایک نگاہ سے دیکھتے ہیں، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

ہمارے علماء کرام اور عوام

اور خضوع وخشوع کے مسئلہ میں تو اور پیچھے ہیں، مسلمانوں کے دل سخت ہو گئے۔ ان کے دل میں جھکاؤ اب تو بالکل باقی نہ رہا۔ کچھ جاہل تو ایسے مل جائیں گے۔ جن کے دل "احکام دین" کے سلسلہ میں نرم ہیں، ورنہ ہمارے علماء کرام کا طبقہ خدا جانتا ہے۔ یہ تو نہ معلوم اپنے کو کیا سمجھ بیٹھے ہیں، اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ کل کے کل ایسے ہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے کچھ علماء کو دیکھا ہے۔ دین کے معمولی معمولی واقعہ میں زار، زار روتے ہیں، اور ان کا قلب اتنا صاف ہے کہ ان کی چند روزہ صحبت انسان کو سنوار سکتی ہے۔

نوجوان علماء میں اس کی بڑی کمی ہے، اللہ تعالیٰ ہی کوئی سبیل پیدا کرے، تو ممکن ہے، ورنہ ظاہری طور پر دنیا اندھیری ہوتی جارہی ہے۔

سلطان بلبن کی نصیحت اپنے لڑکوں کو

سلطان بلبن نے بیٹوں کو ایک مرتبہ جمع کر کے کہا، کہ بادشاہوں کے اکثر افعال شرک کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور سنتِ نبوی کے خلاف ہوتے ہیں، مگر چار چیزوں کا خاص طور پر بادشاہوں کو لحاظ رکھنا چاہیئے۔

"اول یہ کہ بادشاہ کو چاہیئے اپنی حشمت اور دبدبہ کو مناسب محل اور موقع پر استعمال کرے، اور خلق کی بھلائی اور خدا ترسی کے علاوہ کوئی اور بات اس کے پیش نظر نہ ہو، دوسری بات یہ ہے کہ کسی طرح کی بدکاری کو ملک میں رائج نہ ہونے دے، اور ہمیشہ فاسقوں اور بےغیرتوں کو ذلیل اور رسوا رکھے، تیسرے یہ کہ سلطنت کے کام ہمیشہ عقل مندوں اور شائستہ لوگوں کے سپرد کرے، مخلوق کی باگ، دیانت دار، خدا ترس، لوگوں کے ہاتھ میں دے، بدعقیدہ لوگوں کو اپنے ملک میں قدم نہ جمانے دے، چوتھی بات ہے کہ انصاف میں پوری کوشش کرے اور ماتحتوں کے کاموں کو برابر عدل کی ترازو میں تولتا رہے۔ تاکہ ملک میں ظلم اور جبر کا نام بھی نہ سنائی دے" (مسلمانوں کا عروج و زوال ص۲۴۱-۲۴۲)

اصولِ جہاں بانی یہ اصولِ جہاں بانی اس لائق ہیں کہ آج بھی ان پر عمل کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ دنیا کے حکمراں طبقہ کو خاص طور پر ان اصول کو پڑھنا چاہیئے، اور دن رات اس پر گامزن رہنا چاہیئے، خواہ وہ کسی ملک کا حکمراں طبقہ ہو، اور کسی عقیدہ اور دھرم کا ماننے والا ہو۔

ضرورت ہے کہ ملک کی مرکزی حکومت ان نصیحتوں کو سونے کے پانی سے لکھوا کر ہر ایک وزیر، سفیر اور لیڈر کے پاس بھجوا دے، اور ان پر عمل کرنے کی سخت تاکید کرے، سلطان بلبن کا عمل چونکہ انہی اصول پر تھا اس لئے قدرتی

طور پران کی وفات کا یہ اثر ہوا، کہ پورا ملک ماتم کدہ بن گیا،

سلطان بلبن کی موت کے اثرات

ملک الامراء فخر الدین پر یہ اثر ہوا، کہ :۔

"بلبن کی وفات سے چھ ماہ تک وہ زمین پر ہی سوتے رہے دہلی میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس نے مرحوم کے لئے صدقہ اور خیرات کرکے ان کی روح کو ثواب نہ پہنچایا ہو" (مسلمانوں کا عروج وزوال ص۲۴۳)

سلطان جلال الدین کی رحم دلی اور عدل پروری

خاندان خلجی کا پہلا سلطان، جلال الدین بڑا رحم دل بادشاہ گذرا ہے، ساتھ ہی عادل، بردبار اور خدا ترس بھی تھا، ایک دفعہ ملک چھجو نے بغاوت کی سلطان نے مقابلہ کیا، ملک چھجو نے شکست کھائی، خود چھجو اور اس کے دوسرے لوگ گرفتار ہوئے، جلال الدین نے سب کو آزاد کردیا، بلکہ انعام واکرام سے بھی نوازا، امراء نے جب کہا کہ ملک چھجو اور اس کے سب ساتھی واجب القتل ہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ رورعایت اور کرم و نوازش کا معاملہ آئین جہانداری کے خلاف ہے، یہ سن کر سلطان نے جواب دیا :۔

"تم جو کچھ کہتے ہو درست اور تدبیر جہاں داری کے موافق ہے، مگر اس کو کیا کروں کہ ستر سال میں نے حالتِ اسلام میں گذارے، اور ایک مسلمان کا بھی خون نہیں کیا، اب جب کہ بڈھا ہو چکا ہوں اور عمر کا اخیر حصہ گذار رہا ہوں، کسی مسلمان کا خون کرنا نہیں چاہتا" (مسلمانوں کا عروج وزوال ص۲۴۶)

لہ جلال الدین خلجی خاندان کا پہلا بادشاہ ہے جو ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء میں ستر سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا، اور ۶۹۶ھ/۱۲۹۶ء میں اسے علاء الدین کے آدمیوں نے قتل کردیا۔ (مختصر تاریخ ہند ص۔۔)

ایک بادشاہ کا یہ جذبہ قابل صد ستائش ہے، رحمدلی اور شریف طبیعت ہونے کی ایک زبردست مثال قائم کرگیا، اور یہ رحمدلی کچھ مسلمانوں ہی کے ساتھ خاص نہ تھی، بلکہ ہر انسان سے اس کو محبت تھی، ہندو کو بھی اتنا ہی چاہتا تھا، جس قدر مسلمان کو۔

بادشاہ کی انسانی ہمدردی

۶۹۸ھ میں سلطان نے قلعہ رنتھمبور کو فتح کرنے کے لئے لشکر کشی کی، راجہ قلعہ بند ہوگیا، چند دنوں کے بعد سلطان مع لشکر کے واپس چلا آیا اور کہنے لگا۔

"یہ قلعہ اتنا اہم نہیں ہے، کہ اس کو فتح کرنے کے لئے ایک جان کی قربانی بھی پیش کی جاسکے، اور بالفرض اگر میں نے یہ قلعہ فتح کر بھی لیا اور خدا کے بندوں کو قتل کرادیا، تو کل جب عورتیں بیوہ ہوکر اور بچے یتیم ہوکر میرے سامنے آئیں گے، اور میری نظران پر پڑے گی تو میرا کیا حال ہوگا، قلعہ کی فتح کی ساری لذت مجھ پر زہر سے زیادہ تلخ ہوجائے گی۔"

(مسلمانوں کا عروج و زوال ص۲۴۷)

آج کل یہ روایت ان ممالک کے حکمرانوں کو خصوصیت سے پڑھنی چاہئے جو رات دن خوں ریزی اور قتل و قتال میں مبتلا رہتے ہیں، امریکہ کے ہادر اور نکسن آنکھیں کھول کر پڑھیں، جو لاکھوں عورتوں کو بیوہ اور لاکھوں بچوں کو یتیم کرنے کے بعد بھی اسی فکر میں ہیں، کہ ایک اور جنگ عظیم دنیا میں چھیڑے۔

سلطان جلال الدین کا خدا بھلا کرے، اس نے بڑی اچھی بات کہی، قلعہ کی فتح کے لئے انسان کے خون سے ہاتھ رنگنا بڑی زیادتی ہے، کاش ہمارے اس دور کے اربابِ سیاست و حکومت میں یہ جذبہ پیدا ہوجائے۔

سلطان میں خوفِ خدا کی کیفیت

سلطان کو ایک مرتبہ خیال آیا، کہ میرے کارنامے اتنے شاندار ہیں پھر مجھ کو

کیوں "المجاھد فی سبیل اللہ" کے لقب سے خطبہ میں نہ یاد کیا جائے، خود اس کی تدبیر سوچی، اور ایسا پروگرام بنایا کہ مجھ سے دربار میں کچھ لوگ اس کی اجازت طلب کریں، جب یہ پروگرام طے ہو چکا تو دفعتاً اس کے دل میں آیا شیطان نے مجھے دھوکہ دیا۔ دربار میں آیا تو حسب پروگرام دربار میں قاضی فخرالدین کے ذریعہ قوم کی طرف سے بادشاہ سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہمیں اجازت دی جائے کہ حضور کو "المجاھد فی سبیل اللہ" کے لقب سے یاد کرسکیں۔ سلطان نے یہ سن کر کہا:-

"مجھے معلوم ہے، آپ لوگ میرے کہنے کے مطابق ملکہ جہاں کے ایماء سے یہ کہہ رہے ہیں، لیکن اسی وقت مجھ کو خیال آیا تھا کہ میں نے دشمنانِ خدا سے جتنی لڑائیاں لڑی ہیں، ان میں سے کوئی جنگ بھی ایسی نہیں ہے، جو میں نے غرضِ دنیاوی شائبہ کے بغیر محض خدا کے لئے لڑی ہو، اس خیال کے آتے ہی میں اپنی خواہش پر پشیمان ہوا، اور اب میں نے اپنے ارادہ سے رجوع کرلیا ہے" (مسلمانوں کا عروج وزوال ص۲۴۴)

اس واقعہ سے سلطان کے قلب کی صفائی کا اندازہ ہوتا ہے، کہ کس قدر صاف تھا، اپنے ایک قلبی چور کا راز برسر دربار فاش کردیا، اور اپنی غلطی کے اظہار پر ذرہ برابر پس وپیش نہ کیا، سچائی اسی کا نام ہے، انسان شیطانی وسوسہ سے دوچار ہوتا ہے، مگر مسلمان وہ ہے کہ جوں ہی اس کا راز اس پر کھلا توبہ کی، اور شیطانی وسوسہ کا پردہ چاک کردیا، اس واقعہ میں ہمارے دور کے امراء اور دوسرے لوگوں کے لئے عبرت وبصیرت کا سبق ہے۔

علاءالدین خلجی کی انصاف پسندی

سلطان علاءالدین[1] خلجی نے ایک مرتبہ قاضی مغیث سے متعدد سوالات کئے،

---

[1] علاءالدین خلجی ۶۹۵ھ (۱۲۹۶ء) میں دہلی کے تخت پر بیٹھا اور ۷۱۶ھ (۱۳۱۶ء) میں وفات پائی، بڑی اچھی حکومت کی، غلہ خوب سستا رہا اور امن وامان قائم کیا۔ (مختصر تاریخ ہند ص۱۰۵)

قاضی صاحب نے ہر ایک سوال کا جواب شریعت کے مطابق اور بادشاہ کے خلاف دیا، قاضی صاحب کو یقین تھا کہ اب میرا قتل ہونا قریب ہے مگر خلاف توقع علاء الدین نے انعام واکرام سے نوازا، قاضی صاحب کو مخاطب کر کے بولا:-

"اگرچہ میں علم سے بالکل بے بہرہ ہوں، اور فرائض و نوافل کے مسائل سے نابلد ہوں لیکن مسلمان ہوں، اور مسلمان زادہ ہوں، میں جانتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے" (مسلمانوں کا عروج و زوال ص۲۵۸)

یہ احساس بھی غنیمت ہے، اب ہمارے اس زمانہ میں کسے اس کا احساس ہے، اب کوئی بااثر امیر اپنی مخالفت برداشت کرنے کو تیار نہیں، گو یہ مخالفت بربنائے حق ہو، مسلمانوں کو غیظ و غضب آنے سے پہلے سوچنا چاہئے کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان کی زندگی دنیا میں بھی آزاد نہیں، وہ ہر قدم پر اسلامی قانون کا پابند ہے۔

سلطان علاء الدین کی دلی خواہش

بسلسلہ عدل و مساوات

دولت کی ناہمواری اور مالداروں کے نخوت و غرور ختم کرنے کے لئے علاء الدین خلجی نے کافی کوشش کی، اس نے چاہا کہ امیر اور مالدار بھی محنت کریں، تاکہ غریبوں کو ان کی قدر معلوم ہو، فرشتہ کا بیان ہے:-

"علاء الدین نے چاہا کہ سلطنت میں چند ضابطے ایسے جاری کئے جائیں جس سے کمزور اور طاقت ور لوگوں میں بالکل مساوات ہو جائے، اور گاؤں کے مکھیوں اور چودھریوں کو جو فوقیت رعایا پر حاصل ہے وہ باقی نہ رہے" (مسلمانوں کا عروج و زوال ص۲۶۳)

❊ ❊ ❊

سلطان تغلق کے ذاتی اوصاف وکمالات

غیاث الدین تغلق کے متعلق فرشتہ کا بیان ہے :-

"یہ بادشاہ بڑا حلیم اور بردبار تھا، سخاوت اور عقل بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، علاوہ بریں پاک باز اور نیک طینت بھی تھا، پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتا تھا، اور صبح سے شام تک دیوانِ عام میں بیٹھ کر رعایا کی پرسش اور ملکی ومالی مشکلات کو حل کرنے میں اپنا سارا وقت صرف کرتا تھا..... اپنی رعایا میں جس شخص کو پریشان حال دیکھتا اس کا حال پوچھتا اور اس کی تکلیف رفع کرنے کی کوشش کرتا تھا، جو امر خلق کی تکلیف کا باعث ہو سکتا تھا، اس سے احتراز کرتا، اور جو شخص مخلص نظر آتا، اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا" (مسلمانوں کا عروج وزوال ص۲۷)

اب یہ خوبیاں حکمراں طبقہ میں عنقا ہیں، آج کے حکمراں طبقہ کی زندگی کا تجزیہ کیجئے تو برائیوں کے سوا نیکی کا نام ونشان ملنا مشکل ہے، پرائیوٹ زندگی بڑی گندگی، بیہودگیوں میں آلودہ اور نیکیوں سے کوسوں دور نظر آئے گی، اب مالدار کی حوصلہ افزائی تو ممکن ہے مگر پریشان حال پر رحم وکرم خواب وخیال سے زیادہ نہیں، چالباز اور جھوٹوں کے ساتھ تو حکمراں احسان اور حسن سلوک کر سکتے ہیں، مگر مخلص کی جگہ ان کی نظر میں جیل یا کوئی نہایت تکلیف دہ جگہ ہی ہو سکتی ہے، گو اس سے بھی انکار نہیں کہ اللہ کے بندے آج بھی کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں مگر یہ شاذ ونادر ہی۔

سلطان محمد بن تغلق کا معصیت سے اجتناب

سلطان محمد بن تغلق جو بڑی خوبیوں کا بادشاہ گذرا ہے، اور جو اپنی سخاوت

---

[1] سلطان غیاث الدین تغلق ۷۲۰ھ ۱۳۲۰ء میں بادشاہ بنا، اور ۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء میں اس کا انتقال ہوا۔

اور فیاضی میں بہت مشہور ہے، اس کی دینی شغف کا اندازہ اس اقتباس سے لگایئے :-

"نماز، روزہ کے علاوہ مستحبات ونوافل اور وظائف واوراد تک کا اہتمام اور ان کی پابندی کرتا، اور ممنوع اور نشہ آور چیزوں سے اور ہر اس فعل سے کہ جس پر معصیت کا اطلاق ہوسکتا ہے پرہیز کرتا تھا"

جماعت کی نماز کا حکم یہ تو اپنا ذاتی حال تھا، اور تبلیغ کا یہ حال تھا جیسا کہ ابن بطوطہ کا بیان ہے :-

"سلطان کا حکم تھا کہ جو شخص جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے اس کو سزا دی جائے، اس نے بہت سے لوگوں کو اس کام پر مقرر کیا، کہ جو شخص جماعت کے وقت بازار میں ملے اس کو پکڑ کر لائیں، سلطان کا حکم تھا کہ ہر شخص نماز اور اسلام کے احکام سیکھے، چنانچہ لوگ بازاروں میں نماز کے مسائل یاد کرتے پھرتے اور انھیں کاغذوں پر لکھواتے تھے" (مسلمانوں کا عروج وزوال ص۲۷۶)

اس بادشاہ پر خدا کی رحمتیں ہوں، کہ اس نے اپنی عبدیت کو خوب سمجھا اور اپنے فرائض کو جیسا چاہیئے ادا کیا، اس واقعہ میں مسلمان کلمہ گو حکمرانوں کے لئے عبرت و بصیرت کے تابناک اسباق ہیں، کاش موجودہ مسلمان اس بات کو سمجھیں اور ان پر عمل پیرا ہوں۔

ہمارے ہندو بھائی انگریزوں کی تعلیم سے متاثر ہوکر کہیں گے کہ تب تو یہ بادشاہ متعصب رہا ہوگا مگر حاشا وکلا ایسی بات نہیں، جو دیندار ہوتا ہے وہ عادل اور خدا ترس ہوتا ہے اور اس کی نظر میں سارے افراد رعایا برابر ہوتے ہیں، چنانچہ یہ بادشاہ بھی بڑا منصف اور عدل گستر تھا۔

سلطان کے عدل کے سلسلہ میں ابن بطوطہ کا بیان

ابن بطوطہ کا بیان ہے :-

"میں نے سلطان محمد بن تغلق سے زیادہ منصف اور عدل گستر کوئی نہیں دیکھا، ایک مرتبہ ایک "ہندو امیر" نے دعویٰ کیا، کہ بادشاہ نے اس کے بھائی کو بلا وجہ مار ڈالا ہے، قاضی کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا، تو بادشاہ بغیر کسی ہتھیار کے قاضی کے سامنے عام ملزموں کی طرح حاضر ہوا، اور قاضی کو سلام کیا، اور تعظیم بجا لایا، پہلے سے حکم تھا کہ بادشاہ عدالت میں حاضر ہو تو قاضی اس کی تعظیم کے لئے کھڑا نہ ہو، مقدمہ سنایا گیا، آخر قاضی نے فیصلہ کیا، کہ بادشاہ پر جرم ثابت ہے اسے چاہئے کہ مدعی یعنی ہندو امیر کو راضی کرے، ورنہ اس سے قصاص لیا جائے گا، چنانچہ سلطان نے امیر کو رضامند کر لیا، اور قاضی نے اسے بری کر دیا"

(مسلمانوں کا عروج و زوال ص۲۷۷)

سلطان کا ایک واقعہ عبرت خیز اور حیرت انگیز

اس سے بھی عجیب تر واقعہ سنئے:۔

"ایک امیر کے لڑکے نے دعویٰ کیا کہ بادشاہ نے اس کو بلا سبب مارا ہے، قاضی کے سامنے معاملہ گیا تو اس نے حکم دیا کہ بادشاہ یا تو لڑکے کو راضی کرے ورنہ قصاص دے۔ ابن بطوطہ خود اپنی آنکھوں دیکھی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ بادشاہ نے لڑکے کو دربار میں بلا کر اس کے ہاتھ میں چھڑی دی اور کہا اپنا بدلہ لے لے اور اس کو اپنے سر کی قسم دلائی، کہ جیسا میں نے تجھ کو مارا ہے تو بھی مجھے مار، چنانچہ لڑکے نے ہاتھ میں چھڑی لے کر اکیس چھڑی بادشاہ کے ماریں یہاں تک کہ ایک دفعہ اس کی کلاہ بھی سر سے گر پڑی"

(مسلمانوں کا عروج و زوال ص۲۷۷)

کیوں اب ہمارے زمانہ میں حکمرانوں میں یہ عدل گستری پائی جاتی ہے؟ اسے

کاش حکمراں طبقہ ان واقعات کو پڑھتا اور سبق حاصل کرتا، آزاد بھارت اور پاکستان میں لاکھوں ہزاروں مسلم ہندو قتل کر دیئے گئے مگر کسی نے کوئی خبر تک نہ لی، قاتل کی نکسیر تک نہ پھوٹی، کہا جاتا ہے وزراء نے مل کر بعض منصف اور رعدل گستر کو قتل کروا ڈالا، مگر مقدمہ تک چلنے کی نوبت نہ آئی، روس جو اشتراکیت کا حامی ہے اس نے اپنے ملک کے ایک مدبر کو بات کی بات میں مار ڈالا مگر سمجھا یہی گیا کہ انصاف کیا گیا، اس دور میں اپنے جرم کا اعتراف کون کرتا ہے؟

الحادسے پہلے اکبر کی عقیدت
اللہ کے نیک بندوں سے

اکبر[1] جو اپنے ملحد و بے دین ہونے میں ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے، کسی زمانہ میں اسے بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی، شروع میں اس کا کوئی لڑکا زندہ نہ رہتا تھا، اس سلسلہ میں فقیروں اور بزرگوں کے در کی خاک چھانتا پھرتا تھا اس زمانہ میں اکبر کی شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں حاضری ہوئی، یہ سیکری کے پاس ایک پہاڑی میں مقیم تھے، بادشاہ نے موقع پاکر شیخ سے پوچھا مجھے کتنے لڑکے ہوں گے، جواب ملا اللہ تعالیٰ تین لڑکے عطا کرے گا، بادشاہ اکبر نے کہا، پہلا لڑکا آپ کی خدمت میں پیش کروں گا، شیخ نے کہا مبارک ہو، میں نے بھی اسے اپنے نام سے موسوم کیا۔

اکبر کی بیوی کے جب لڑکا پیدا ہونے کا وقت قریب آیا، شیخ سلیم چشتیؒ کے یہاں آکر مقیم ہوئی، اور جہانگیر یہیں ۷ ارربیع الاول ۹۷۷ھ میں پیدا ہوا، شاید اسی کی برکت تھی کہ اکبر کی گود میں پرورش پانے کے باوجود بڑی خوبیوں کا

---

[1] ۹۶۳ھ / ۱۵۵۵ء میں ہمایوں کا انتقال ہوا، اسی سال اکبر کو جلال الدین کا لقب دے کر تخت نشین کیا گیا اس وقت اس کی عمر تیرہ سال کی تھی، اس کی حکومت بہت پھیلی اور بالآخر ۴۹ برس حکمرانی کر کے ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء میں اس کا انتقال ہوا۔

مالک ہوا۔

جہانگیر کا درد دل رعایا کے ساتھ

"اسی طرح وہ رعایا کے راحت و آرام اور آسودگی کا بھی خواہاں تھا، رعایا کا درد اس کے دل میں تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ بادشاہ پر فرض ہے کہ وہ جنگل کے درندوں اور چرندوں اور ہوا کے پرندوں تک کی حفاظت کرے اور اپنے تخت کے نیچے ان جانوروں کی بھی حق رسی کرے۔"

(علمائے ہند کا شاندار ماضی حصہ اول ص۱۰۹)

اسے غور سے پڑھیں، یہ اس شخصی حکومت کے تاج و تخت کے مالک کا بیان ہے جس کو نہ الکشن لڑانا پڑتا تھا نہ ووٹروں کی خوشامد کی ضرورت تھی اور نہ جمہوریت کا دعویٰ تھا۔ کیا اس بیسویں صدی کے حکمرانوں میں بھی یہ جذبہ پایا جاتا ہے؟ جو اپنے ووٹروں سے زمانہ الکشن میں جھوٹے وعدے کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔

حق رسی اور انصاف کا ہمارے اس دور میں کال پڑا ہوا ہے، اس لئے مظلوموں ہی پر مقدمے قائم کئے جاتے ہیں، ان کو ہی جیل میں بند کیا جاتا ہے اور ظالم سینہ تانے شاہراہوں پر چلتے نظر آتے ہیں، اس لئے کہ ان کے پاس روپے ہیں۔ وسائل و ذرائع ہیں، اور حکمرانوں سے ان کی رشتہ داری ہے۔

حکمراں طبقہ کو یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کی ناانصافیوں اور ظلم و جور کا بدلہ انھیں مل کر رہے گا، اللہ تعالیٰ کے یہاں دیر تو ہے اندھیر ھرگز نہیں ہے، اور ساتھ ہی ایک شخصی حکمراں کے طرز عمل سے سبق لینا چاہیئے۔

زنجیر عدل آویزاں کرنے کا حکم

جہانگیر جسے وراثت میں حکومت ملی تھی، آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ اس نے سب سے پہلا حکم تخت حکومت پر قدم رکھتے ہی دیا تو یہ دیا کہ :-

"زنجیر عدل آویزاں کی جائے تاکہ اگر مہمات دار العدالت کے کارپرداز ستم رسیدوں اور مظلوموں کی دادرسی میں سستی یا کوتاہی کریں تو یہ مظلوم اس زنجیر تک پہنچ کر بذات خود مجھ کو آگاہ کر سکیں۔" (علماء ہند کا شاندار ماضی ص ۱۰۹ ج ۱)

اس دور میں جب انصاف کچہریوں میں فروخت ہوتا ہے اور بغیر خرچ کیے کوئی غریب فریاد بھی نہیں کر سکتا "زنجیر عدل" کی بات ذہن میں نہیں آئے گی۔ سلطان وقت کے یہاں اذن عام ہے کہ جس کے ساتھ عدالت نے انصاف نہیں کیا ہے وہ براہ راست بادشاہ تک اپنی داستانِ غم پہنچائے اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا، مگر واقعہ یہی تھا کہ مظلوموں کی فریادرسی ہوتی تھی ظالموں کو ظلم کا بدلہ ملا کرتا تھا اور انصاف و عدل کی کوئی قیمت نہیں لی جاتی تھی، عدالتیں بڑی بے تکلفی سے مقدمات سنا کرتی تھیں اور انصاف کیا کرتی تھیں اس لئے کہ ان کو یقین تھا کہ اگر ہم نے حق والوں کا حق نہیں دلایا تو مقدمہ سیدھے سلطان وقت کی خدمت میں پیش ہوگا، جہاں کسی کی رعایت نہیں ہے، زنجیر عدل لٹک رہی ہے اور عام حکم ہے، نہ وکیل کی ضرورت اور نہ مختارکی، نہ پیشکار کی اور نہ کسی فیس کی، یہاں سے نکلے گا اور زنجیر عدل کو جاکر کھینچ دے گا۔

کاش وہ عدل و انصاف کا زمانہ پھر پلٹ کر آتا، حکمرانوں میں انسانیت ہوتی — اور امیر و غریب اور شاہ و گدا کی تمیز باقی نہ رہتی، اور اقلیت و اکثریت کا "فتنۂ اکبر" اپنی آپ موت مرجاتا۔

جہانگیر کی رعایا پر داد و دہش

اور اس سلطان جہانگیر[1] کو عوام سے کس قدر دلچسپی تھی، اس کا اندازہ اس

---

[1] اکبر کی موت کے بعد جہانگیر ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہوا، نور الدین لقب قرار پایا، ۱۰۳۵ھ میں مہابت خاں نے نظر بند کر دیا، پھر نظر بندی سے نکالا گیا، ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء میں وفات پائی۔

واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے، لکھا ہے:۔

"ایک سفر میں خدام شاہی کو حکم دیا کہ جس قدر دیہات اور مواضعات راستہ کے کناروں پر پڑیں ان کے غربار اور بیوہ عورتوں کو جمع کر کے میرے سامنے لاؤ، میں خود اپنے ہاتھ سے ان کو خیرات دوں گا، میرا دل بہلے گا اور ان کی مرادیں پوری ہوں گی" (علماء ہند کا شاندار ماضی ص۱۰۹)

ہمارا روشن دور اور آزاد بھارت

ہمارے اس دور کے حکمراں طبقہ کی سمجھ سے بھی یہ بات بہت بلند ہے کہ سلطان وقت اپنے ہاتھ سے غریبوں اور بیواؤں کو خیرات تقسیم کرے گا جو صرف لینا جانتا ہو، دینے کی نوبت اسے کبھی نہ آئی ہو وہ دے کر خوش ہونا کیا جانے۔

جس کی حکومت میں بیواؤں اور ناداروں کی یہ آؤ بھگت ہو وہ کیوں نہ پھولے پھلے۔ اب تو وزیروں اور وزیرزادوں ہی کا پیٹ نہیں بھرتا، بے چاری بیوہ اور غریبوں کی کون خبر لے۔ قحط کے زمانہ میں غریبوں کے لئے اگر کبھی کچھ روپے منظور بھی ہوئے تو پہنچتے پہنچتے بیسواں حصہ بھی باقی نہیں رہ جاتا، اوپر سے نیچے تک سارے پہلے اپنا حصہ نکال لیتے ہیں، پھر غریبوں تک سو میں سے پانچ پہنچ گیا تو بھی بس غنیمت۔

وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ بادشاہ اپنے ہاتھ سے روپے لٹاتا تھا ایک ہمارا یہ منحوس زمانہ ہے کہ غلط پروپیگنڈہ پر ہی روپے خرچ کرنے سے چھٹی نہیں ملتی اور غریبوں کا خون چوس کر مونچھ پر تاؤ دیا جا رہا ہے۔

صوبائی ٹیکسوں کا ممنوع قرار دینا

جہانگیر نے ملک کی باگ ڈور سنبھالتے ہی بارہ حکم نافذ کئے، ان میں ایک یہ تھا:۔

"تمغا اور میر بحری وغیرہ وہ تمام ٹیکس جو صوبوں اور کمشنریوں کے جاگیر داروں نے اپنے نفع کے لئے مقرر کر رکھے تھے ممنوع ہیں۔"

(علماء ہند کا شاندار ماضی ج۱ ص۱۰۹)

کبھی وہ زمانہ تھا کہ ٹیکس ختم کرنے کا حکم دیا جاتا تھا، ایک یہ زمانہ ہے کہ صوبہ میں پہلے چار وزیر ہوا کرتے تھے تو اب سولہ ہیں، اور وہ بڑھ کر پچاس تک پہنچ چکے ہیں، اور اس خرچ کو پورا کرنے کے لئے صوبائی اسمبلیاں نئے نئے ٹیکس تجویز کرتی رہتی ہیں اور مرکز خاموشی سے تائید کرتا ہے، پھر پبلک بیچاری میں خوشحالی کہاں سے آئے، پیدل چلنے والے جب وزیر ہو کر کار دن پر پھرتے ہیں، اسی کے ساتھ ملک ملک کی سیر کریں اور کوٹھیوں پر لاکھوں روپے خرچ کرتے نہ شرمائیں، ان سے اس کی توقع ہی غلط ہے کہ وہ ٹیکس میں کوئی کمی کریں گے یا سرے سے کوئی ناجائز ٹیکس معاف کر دیں گے۔

شاہراہوں پر پبلک کیلئے سہولتوں کا انتظام

جہانگیر کا اس سلسلہ میں دوسرا حکم یہ تھا:۔

"جن راستوں میں چوری اور ڈکیتی زیادہ ہو، اور راستے آبادیوں سے فاصلہ پر ہوں، ان راستوں کے اوپر مسجدیں، سرائے اور کنویں بنوائے جائیں تاکہ ان راستوں پر آبادی رہے۔ سوداگروں کے سامان راستہ میں ان کی اجازت کے بغیر کھولے نہ جائیں۔" (علماء ہند کا شاندار ماضی ج۱ ص۱۱۰)

کبھی وہ اہتمام تھا پبلک کے آرام و راحت کے لئے، ان کی جان و مال کی حفاظت کے لئے اور کہاں اب یہ دور ہے کہ آبادی میں سیکڑوں آدمی تہ تیغ ہوتے رہتے ہیں اور حکومت کو احساس تک نہیں ہوتا، گائے، بکری کی قیمت ہوتی ہے مگر ایک غریب و بیکس کی جان کی اتنی بھی قیمت نہیں ہوتی، خود پولیس

لوٹ مار میں آگے آگے ہوتی ہے اور لیڈروں کی امداد کرتی ہے اور اس طرح آئے دن غریبوں کا خون ہوتا رہتا ہے۔

کیا موجودہ حکمراں طبقہ اس واقعہ سے سبق لینے کو تیار ہے تاکہ کمزور و بے بس انسانوں کی جان اور عزت و آبرو ڈاکوؤں کے ہاتھوں سے محفوظ رہ سکے اور آدمی اطمینان و سکون کی زندگی گذار سکے۔ اگر پہلے پبلک اور راستے کی حفاظت کے لئے سرائے، مسجدیں اور دوسری اہم چیزوں کی حکومت انتظام کرتی تھی، تو کیا آج عدل و مساوات اور انسانی جان و مال کی حفاظت اور اپنی ذمہ داری کے احساس کے لئے کچھ نہیں کیا جائے گا؟

مرنے والوں کا مال ان کے ورثہ کو

جہانگیر نے تیسرا قانون فوری طور پر جو نافذ کیا یہ تھا:-

"کافر یا مسلمان جو بھی ممالک محروسہ میں رہتا ہو، اس کے مرنے پر اس کا مال اس کے ورثہ کو دیا جائے، کوئی شخص اس میں دست اندازی نہیں کرسکتا۔" (علماء ہند کا شاندار ماضی ج۱ ص۱۱)

اب تو سب سے پہلے حکومت کے آدمی پہنچ کر حساب کتاب شروع کر دیتے ہیں، اس لئے کہ مرنے والے کے مال میں سب سے بڑا حصہ ارباب حکومت کا ہوا کرتا ہے، اس کا نام ہندوستان میں "موت ٹیکس" ہے، پتہ نہیں دوسرے ملکوں میں یہ رقم کس نام پر وصول کی جاتی ہے۔

یہ تو حکومت کی بات رہی، آدمی کے مرنے کے بعد پڑوس کے بے ایمانوں کی ٹولی غلط دعوے کے لئے تیار ہو جاتی ہے، اور جب تک کچھ اپنا حصہ کسی بہانے سے نہ لے لے اسے چین نہیں آتا، وارثوں کو پریشان کرتی رہتی ہے۔

شراب بندی کا حکم

جہانگیر نے یہ بھی حکم جاری کیا تھا کہ :-

"شراب وغیرہ یعنی وہ تمام مسکرات جو شرعاً ممنوع ہیں نہ بنائی جائیں نہ بیچی جائیں" (علماء ہند کا شاندار ماضی ص۱۵۱)

تخت پر بیٹھتے ہی ایک شخصی حکومت کا سربراہ یک قلم شراب بندی کا حکم نافذ کر دیتا ہے، شریعت اسے اس قدر پیاری ہے کہ نہ وہ آمدنی کے گھٹنے کا حساب لگاتا ہے نہ اس کے دوسرے اثرات جو ملک میں پیدا ہوں گے اسے خاطر میں لاتا ہے، یہ حضرت سلیم چشتیؒ کے دعاؤں کا اثر تھا۔

موجودہ حکومت اور حکمرانوں کا حال

اب تو مسلمانی حکومتیں بھی سب کچھ کرنے کے باوجود شراب بندی کی جرأت نہیں کرتیں، وجہ کھلی ہوئی ہے کہ دراصل خود حکمراں طبقہ میں شرابیوں کی بڑی تعداد ہوتی ہے، جن کا رات دن کا مشغلہ ہی شراب وکباب ہوتا ہے مجلس کی ساری رونق کا اسی پر دارومدار ہوتا ہے۔

کچھ یہی حال جمہوری حکومتوں کا بھی ہے جو سیکولر اسٹیٹ کہی جاتی ہیں، وہ سب کچھ بخوشی کر سکتی ہیں، مگر ایسی چیزیں جو انسانوں کے اخلاق کے لئے گھن کی طرح ہوتی ہیں انھیں ختم نہیں کر سکتی ہیں، اس لئے اس سے لاکھوں آدمیوں اور دسیوں محکموں کا نقصان ہے، اور رنگ رلیاں منانے والوں کا جو خسارہ ہے وہ سب سے بڑھ کر، بھڑکنے، ناچنے اور لہو ولعب کی محفلیں سونی پڑ جائیں گی۔

کاش آج کا حکمراں طبقہ ایک شخصی حکمراں کی جرأت سے سبق حاصل کرتا اور حیلے بہانے تراشنے کے کاروبار سے توبہ کرتا اور ان کاموں کے انجام دینے

میں کوتاہی نہ کرتا جن سے عوام وخواص کو فائدہ پہنچتا اور ان کے اخلاق واعمال سنورتے۔

رعایا کی درخواست پر خراج کی معافی

جہانگیر کی فیاضی عام تھی، جس نے جو درخواست کی، جہاں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ یہ واقعی رحم وکرم کا مستحق ہے۔ پھر داد ودہش میں دیر نہ ہوتی۔ لکھا ہے :-

"ایک مرتبہ بہت سے آدمیوں نے معافی خراج کی درخواست دیدی امراء نے عرض کیا کہ حضور کی فیاضی اسی طرح جاری رہی تو سرکاری آمدنی صفر رہ جائے گی۔ جہانگیر نے جواب دیا کہ سائلین لشکرِ دعا ہیں، امرائے سلطنت پر لازم ہے کہ لشکر دعا کو بڑھائیں۔"

(علماء ہند کا شاندار ماضی ج۱ ص۱۱۲)

دیکھ رہے ہیں سلطان وقت کی فیاضی وجرأت، غور کریں کتنی پاک نیت ہے اور کس قدر اچھا عقیدہ ہے، ان لوگوں کو "لشکرِ دعا" سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو بادشاہ سے معافی خراج کی درخواست کرتے ہیں، پھر اس کے عہد کے عوام اپنے حکمرانوں سے کیوں نہ خوش رہتے اور ان کو خیر وبرکت کیوں نہ ہوتی، آدمی جیسا سوچتا ویسا ہوتا ہے۔ داد ودہش میں بخل سے کام نہیں لیتا۔ اللہ تعالیٰ اسے بھی بلاحساب وکتاب عطا کرتا ہے۔

ہمارے دور میں ٹیکسوں کا اضافہ

ایک ہمارا یہ زمانہ ہے، جہاں حکومت صرف لینا جانتی ہے، دینا اور معاف کرنا نہیں جانتی ہے، خواہ پبلک پر قیامت ٹوٹ پڑے، آئے دن قحط پڑتا رہتا ہے، پبلک بھوکوں مرتی ہے، مگر حکومت کبھی بھی ٹیکس معاف

نہیں کرتی، بلکہ ہر سال اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے، کہیں اور یہ ہو یا نہ ہو مگر ہم اپنے ملک میں تو یہی دیکھ رہے ہیں، سرکاری ملازمین بلا شبہ آرام میں ہیں، ان کے سوا، عوام جن کا حکومت سے ملازمت کا تعلق نہیں، وہ آئے دن ٹیکس کے نام سے برباد ہوتے چلے جارہے ہیں۔

خواجہ سرا بنانے پر پابندی

جہانگیر سے پہلے ایک بُرا بلکہ بدترین رواج خواجہ سرا بنانے کا تھا جو ارباب حکومت کے اندرون خانہ خدام کی حیثیت سے رہا کرتے تھے. جہانگیر نے حکم دیدیا:۔

"آئندہ خواجہ سرا نہ بنائے جائیں نہ بیچے جائیں" (علمارِ ہند کا شاندار ماضی ج ۱ ص ۱۱۳)

چنانچہ یہ لعنت ملک سے ختم ہوگئی، اس لئے کہ اس نے اس جرم کی سزا حبس دوام مقرر کی تھی اور اس طرح بہت سے انسان جو اپنی رجولیت سے محروم کردیئے جاتے تھے. بچ گئے۔

رسم ستی پر پابندی

اسی طرح ستی کی رسم تھی، جو ہندوؤں میں رائج تھی، جس کا منشا یہ تھا کہ عورت اپنے شوہر کی موت پر اس کے ساتھ جل جایا کرتی تھی اور اس طرح خودکشی کرکے خوش ہوتی تھی اور وہ خوش نہ ہو تو سماج اسے بہرحال اچھا سمجھتا تھا. جہانگیر نے اسے بھی برداشت نہیں کیا، اور:۔

"بچوں والی عورتوں کی ستی کو ممنوع قرار دیدیا"

جس سے بہت سے بچے اپنی آپ موت مرنے سے بچ گئے، اور بہت سی عورتیں بھی خودکشی کی لعنت سے محفوظ ہوگئیں، اور بادشاہ کو دعائیں دیں۔

⁂ ⁂ ⁂

فریادرسوں کی فریادرسی کا اہتمام

جہانگیر میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں، وہاں لاکھ روپے کی خوبی یہ بھی تھی عدل وانصاف، پبلک کے درد دکھ کا احساس اور اسے دور کرنے کا مخلصانہ جذبہ۔ احمد آباد جب یہ پہنچا ہے تو باوجود بیمار رہنے کے انصاف کے لئے بیٹھا کرتا اور اس طرح کہ ہر خاص و عام بآسانی پہنچ سکے، خود لکھتا ہے:-

"چونکہ یہاں کے آدمی بہت کمزور دل اور عاجز ہیں، اس خیال سے کہ ممکن ہے لشکر کا کوئی سپاہی کسی غریب پر کوئی ظلم کر دے۔ اور قاضی اور میرعدل کسی وجہ سے اس کی فریادرسی میں سستی کر جائیں، لہذا میں احتیاطاً روزانہ دوپہر کی عبادت سے فارغ ہونے کے بعد سخت گرمی اور لو کے باوجود دریا کی طرف جھروکہ میں بیٹھ جاتا ہوں تاکہ در و دیوار، سنتری اور چوبدار کی رکاوٹ باقی نہ رہے اور جو شخص مجھ تک پہنچنا چاہے آسانی سے پہنچ سکے، بیماری اور کمزوری کے زمانہ میں درد والم کے باوجود مقررہ طریقہ کے بموجب میں جھروکہ میں بیٹھتا رہا اور تن آسانی کو اپنے اوپر حرام قرار دیا"

(علماء ہند کا شاندار ماضی ص۱۱۶ ج۱)

یہ تھی اپنی رعایا سے انس و محبت اور یہ تھا لحاظ و خیال ان کے ساتھ عدل و انصاف کا۔ جب بادشاہ اتنا چست ہو کہ بیماری و ناتوانی کے باوجود رعایا کی ضروریات سے چشم پوشی حرام سمجھتا ہو، اور جگہ ایسی منتخب کرتا ہو کہ کسی کے پہنچنے میں دقت نہ ہو، سوچئے اس کی قلمرو میں کہیں ناانصافی کا نام و نشان بھی باقی رہ سکتا ہے، غیر ممکن ہے۔

نیچے کے حکام تو اس وقت حرام خوری، رشوت ستانی اور ظلم و جور پر آمادہ ہوتے ہیں، جب اپنے افسروں اور وزیروں میں کمزوری، بے ایمانی اور

طرفداری دیکھتے ہیں، آج کوئی وزیر اعظم اور صدر جمہوریہ تک پہنچ بھی نہیں سکتا، اگر عوام سے اس کا تعلق ہے، بات کرنا تو دور کی چیز ہے، اور پھر ان سے انصاف کی توقع؟ کہ کھڑے کھڑے کر دیں گے، خواب و خیال ہے۔

آج کی جمہوریت اس شخصی حکومت کے مقابلہ میں لعنت معلوم ہوتی ہے، جہاں اقلیت و اکثریت کا جھگڑا ہو، وزراء اور حکام امتیازی سلوک کرتے ہوں، اور عدل و مساوات اور ہمدردی و رواداری عنقا ہو، یہ سارا فتنہ ہماری شامت اعمال کا نتیجہ ہے۔

بادشاہ نے ملک کے مفاد کے لئے

اپنا آرام ختم کر دیا

شاید وہ زمانہ پھر کبھی نہ آئے گا کہ حکمراں عوام کی راحت و عافیت کے لئے بے قرار ہوا کرے گا، اور اپنا آرام اور اپنی نیند سب قوم پر نچھاور کر دیگا جہانگیر پبلک کی خدمت میں ایسا منہمک رہا کرتا تھا کہ بہ مشکل اسے سونے کا بھی موقع ملتا تھا۔ خود لکھتا ہے:-

> "خدا کے فضل و کرم سے عادت ایسی ہو گئی ہے کہ رات اور دن میں دو تین گھنٹے سے زیادہ سرمایۂ وقت کو سونے میں غارت نہیں کرتا، اس سلسلہ میں دو فائدے مدنظر ہیں، ایک ملک کی حالت سے آگاہی، دوم یاد حق میں دل کی بیداری" (علماء ہند کا شاندار ماضی ص ۱۱۶)

یہ سونے کا نظام الاوقات ہے، ایک شخصی حکمراں کا، جسے بد باطن موقع پا کر بدنام کرنے سے نہیں چوکتے، آج جو دن رات نیند کے مزے لوٹتے رہتے ہیں اور اپنی سرکاری کوٹھیوں میں داد عیش دیتے رہتے ہیں، انھیں شاید یقین بھی نہ آئے، مگر بات یونہی ہے، چوبیس گھنٹے میں صرف دو تین گھنٹے سونا ایک بادشاہ کا بڑا کمال ہے، اور الفاظ پر غور کر رہے، غارت کرنے سے

تعبیر کیا جا رہا ہے، اپنے آرام پر وقت کا خرچ ان کی نظر میں کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا اور دونوں وجہیں بھی کتنی بلند بیان کی جا رہی ہیں، ایک خدمت خلق اور رعایا کے جو حقوق عاید ہوتے ہیں اس کی ادائیگی۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کی یاد اور احسانات کی شکرگزاری جو ضروری ہے اس کی تکمیل، اللہ اکبر، کتنا پاکیزہ اور بلند نظریہ ہے حکمراں کا۔

آجکل کے حکمراں اپنے گریبان میں منھ ڈال کر سوچیں، کیا یہ احساس اب بھی ان میں ہے؟ کسے کہتے ہیں، پبلک نوازی اور خدمت خلق، پروپیگنڈے کی حد تک تو سب کچھ کر سکتے ہیں، باقی حقیقت، تو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور یادِ حق اور دل کی بیداری کا مسئلہ، یہ تو اس دور کے حکمرانوں کی عقل و فہم سے بھی اونچی بات ہے۔ ابھی حال میں پاکستان میں ایوب خاں کی حکومت نے حکمرانوں کے جو راز فاش کئے ہیں ان سے بڑی آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کدھر جا رہے ہیں اور کہاں کھڑے ہیں۔

یہ موجودہ حکمرانوں کا حال ہے کہ اس قدر تنگ نظر اور تنگ ظرف ثابت ہو رہے ہیں الامان الحفیظ، اور اکثر ممالک میں اسی کا تجربہ ہو رہا ہے بلکہ آگے بڑھ کر کہئے دیکھئے کہ جہانگیر کے یہاں وقت کی جو قدر و قیمت تھی، وہ آج کے تعلیم یافتوں اور علماء کے لئے بھی باعث رشک ہے۔

فکرِ آخرت

اور یہی نہیں آگے کم سونے کا تذکرہ کر کے جہانگیر لکھتا ہے:-

"افسوس یہ چند روزہ عمر غفلت سے گذر جائے، جب کہ ایک خواب گراں درپیش ہے، اس بیداری کو جو بعد میں خواب میں بھی نہیں آسکتی، غنیمت جان کر ایک لمحہ کے لئے بھی یادِ حق سے غافل نہیں رہنا چاہیئے" (علماء ہند کا شاندار ماضی ج ۱ ص ۱۱۷)

غور سے پڑھیے تو معلوم ہوگا، یہ کسی بادشاہ کی تحریر نہیں، اہل اللہ کی ہے، اور بڑے درجہ کے اہل اللہ کی، کیا ہم توقع کریں کہ موجودہ حکمراں اس سے عبرت و بصیرت کا کوئی سبق حاصل کریں گے۔

پہلے زمانہ کی خیر و برکت کا حال پڑھ کر اور اپنے زمانہ کی بے برکتی اور پریشان حالی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی، مگر اس طرح کے واقعات جب سامنے آجاتے ہیں تو پھر حیرت نہیں ہوتی، وہ ان کی خدا ترسی کا نتیجہ تھا اور یہ ہماری شامت اعمال کا انجام ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

جہانگیر کی سخاوت وفیاضی

جہانگیر کی داد و دہش کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں وہ شاہانہ شان رکھتا تھا، اور اس کی دی ہوئی جاگیریں بہت سی اب بھی موجود ہیں، نیز اس کی سخاوت کے سلسلہ میں لکھا ہے:-

"جمعہ کے روز ایک ہزار مومنین کی دعوت اس کا معمول تھا، بڑے بڑے شہروں میں اس کی جانب سے خیرات خانے قائم تھے، جن میں فقراء، ومساکین کو کھانا کھلایا جاتا تھا" (علماء ہند کا شاندار ماضی ج۱ ص۱۱)

اب سخاوت کے یہ قصے افسانہ بن کر رہ گئے، اب تو خود حکومت کو لوٹنے سے حکمراں طبقہ کو چھٹی نہیں ہوتی: مختلف بہانوں سے حکومت کے خزانوں پر ہاتھ صاف کرتے رہتے ہیں، حال جب یہ ہو تو اس کی توقع ہی فضول ہے کہ ان کی طرف سے خیرات خانے قائم ہوں گے اور عام لوگوں کی دعوتیں کی جائیں گی۔

حکومت سے جو لوگ وابستہ ہیں ان کے خاندان ہی کبھی آسودہ نہیں ہوتے تو پھر مساکین و فقراء کو کون پوچھتا ہے اور ان کی خبر گیری کی فکر کس کو ہوگی۔

دراصل بات یہ ہے کہ اب عوام وخواص سبھوں سے خدا ترسی جاتی رہی. کسی کو بھی یہ بات یاد نہیں رہتی کہ کل مرنا ہے. حساب کتاب دینا ہے. اور ہماری کوئی چیز رب العلمین سے پوشیدہ نہیں رہتی

مسلمانوں کے حقوق کا لحاظ و پاس غیر مسلم حکمرانوں میں

تاریخی حقائق

غیر مسلم حکمرانوں کا طرزِ عمل زندہ دل مسلمانوں کیساتھ

اس وقت میرے سامنے حضرت سید گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "ہزار سال پہلے" ہے۔ اس کتاب کے پڑھتے وقت بعض تاریخی حقائق پر نشان لگاتا گیا تھا، آج انہی واقعات میں سے چند حاضرِ خدمت ہیں۔

مسلمان کے اخلاق و اعمال کا صلہ

ابن حوقل کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہزار سال پہلے مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود کس خودداری کے ساتھ رہتے تھے، اور اپنے اعمال و اخلاق کی وجہ سے حکمران طبقے پر کیسے چھائے ہوئے تھے۔

بلہرا کے علاقہ میں تھوڑے سے مسلمان بھی آباد تھے، مگر ان کے کردار کا اثر یہ تھا کہ :-

"ان مسلمانوں پر بلہرا کی طرف سے اس زمانہ میں وہی آدمی حاکم ہو سکتا تھا جو مسلمان ہوتا" (ہزار سال پہلے صـ۱)

اور یہ کوئی بلہرا ہی کی خصوصیت نہ تھی، ابن حوقل نے لکھا ہے :-

"اور یہی حال ..... میں نے بہت سے ان ممالک میں پایا جن پر کفر کا غلبہ ہے مثلاً خزانہ، سریر، لان، غانہ کوغہ وغیرہ" (ہزار سال پہلے صـ۱)

مسلمان جب تک مسلمان تھے تو ان کا یہی حال تھا، جہاں رہے مسلمان بن کر رہے، قوانین اسلام ہر جگہ برقرار رکھا، مگر آہ اب تو مسلمان، نام کے مسلمان بنتے جا رہے ہیں، پھر اسی اعتبار سے کم روزی، بزدلی اور مرعوبیت کے شکار ہوتے جا رہے ہیں۔

غیر مسلم حکومتوں میں مسلمانوں کا دینی جذبہ

ایک دن وہ بھی تھا کہ غیر اسلامی حکومتوں کے علاقوں میں آباد تھے، مگر وقار اور دینی جاہ وجلال کا حال یہ تھا کہ:-

"مسلمان ان تمام علاقوں میں کسی حکم اور فیصلہ کو اس وقت تک تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جب تک ان پر خود مسلمان ہی حاکم نہ ہو، ان پر حدود اور سزاؤں کے نفاذ کا یا ان پر شہادت اور گواہی دلانے کا حق مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہے، خواہ اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو" (ہزار سال پہلے ص۲۱)

دیکھ رہے ہیں مسلمان انتہائی اقلیت میں ہیں، گنے چنے افراد ہیں، مگر حال کیا ہے؟ کہ اپنے مذہبی معاملات میں کسی غیر مسلم کی حکمرانی قبول نہیں کر رہے ہیں، اور ان کے خلوص اور ان کے اعمال واخلاق کا یہ عالم ہے کہ حکمراں طبقہ بھی ان کے اس مطالبہ کو ماننے پر مجبور ہے، دراصل یہ حکمراں طبقہ کی انصاف پسندی اور عدل پروری تھی۔

کیا ہندوستان کے بیس کروڑ مسلمانوں کے لئے اس میں کوئی سبق نہیں ہے؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر اپنی آزاد حکومت سے اپنے اس حق کا مطالبہ کرنا چاہئے، عزیق رحمت کرے اللہ تعالیٰ حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جن کو اپنی زندگی بھر اسی کی دھن رہی، کاش وہ زندہ ہوتے، تو اس آزاد بھارت میں مسلمانوں کے پرسنل لا کا یہ حشر نہ ہوتا، جو ہوتا جا رہا ہے

ان واقعات سے حکمراں طبقہ کو بھی سبق حاصل کرنا چاہئے ۔

مسلمانی شعار کی اجازت غیر مسلم حکومت میں

ابن حوقل نے یہ بھی لکھا ہے :-

"بلھرا کے علاقہ میں مسلمانوں کی مسجدیں بھی ہیں، جن میں جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے، اور دوسری نمازیں بھی پڑھی جاتی ہیں، نماز کے لئے میناروں پر اذان بھی ہوتی ہے۔ اور تکبیر و تہلیل اعلان کے ساتھ ادا کی جاتی ہے"

(ہزار سال پہلے ص۱۳۱)

[illegible] اکبر اسلامی کردار کا یہ عالم تھا، دینی معاملہ میں مداہنت کا نام ونشان تک نہ تھا، اب تو مسلمانوں میں خود مداہنت کا مرض پھیل پڑا ہے، وہ اذان ہی کو غنیمت سمجھتے ہیں، اور اسی آزاد بھارت میں سیکڑوں دیہات ایسے ہیں، جہاں برادران وطن اذان پر بھی ناک بھوں چڑھاتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ بہت سارے اذان و نماز سے خوش ہونے والے بھی ہیں ۔

مسلمانوں کے لئے اسلامی قانون غیر مسلم حکومت میں

عجائب الہند کے مصنف ابن شہریار نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے افسر کا نام "ہنرمن" ہوا کرتا تھا اور اسے قاضی کی حیثیت حاصل تھی، اس عہدہ پر مسلمان کے سوا کوئی دوسرا بحال کسی حال میں نہیں ہوسکتا تھا، اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے۔

"ہندوستانی قوانین کی رو سے کسی جرم کی خواہ کچھ بھی سزا مقرر ہو، لیکن مسلمان جب اس جرم کے مرتکب ہوتے تھے تو ان کو "ہنرمن" (قاضی) کے سپرد کر دیا جاتا تھا تاکہ اسلامی قوانین کی رو سے ان پر حکم لگائے"

(ہزار سال پہلے ص۱۳۱)

اس کو نقل کر کے خود سید گیلانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"کیا زمانہ کا انقلاب ہے کہ جس زمانہ میں مسلمان ہندوستان میں انگلیوں پر بھی بمشکل گنے جا سکتے تھے، اس وقت تو انھوں نے اس ملک میں یہ اختیار اور اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ مسلمانوں پر مسلمانوں ہی کی حکومت قائم ہوگی، اور مسلمانوں پر ان کے دین ہی کا قانون نافذ ہوگا، لیکن آج جب ان کی تعداد اسی ملک میں کروڑوں سے بھی متجاوز ہو چکی ہے، اس مسئلہ کے خیال کو بھی اپنے دماغ میں لانے کی جرأت نہیں کر سکتے، دوسروں سے منوانا دور کی بات ہے ..... یہی طے ہونا مشکل ہے کہ اس قسم کے اختیارات کا مطالبہ حکومت کے سامنے مسلمانوں کو پیش کرنا چاہیے یا نہیں"

سچ کہا علامہ اقبال نے، ؎

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارہ

مسلمانوں کے اعمال واخلاق
اور ان پر اعتماد کا حال

مگر کیسے عرض کروں کہ یہ سب نتیجہ تھا دینی غیرت وحمیت اور اسلامی اخوت ومحبت کا، ان میں کا ایک ایک فرد اخلاق واعمال کا مجسمہ اور خلوص ووفا کا پیکر تھا، جن کو دیکھ کر فرشتے بھی شرما جاتے تھے، اس سلسلہ میں خود ابن حوقل کی چشم دید گواہی ملاحظہ فرمایئے، وہ لکھتا ہے :-

"ان ہی علاقوں میں سے بعض علاقوں میں ایسے مسلمانوں سے بھی میری ملاقات ہوئی ہے، جن کی پارسائی اور اخلاقی برتری کا یہ حال ہے کہ اپنے مقدمات میں غیر مسلم طبقات کے افراد بھی عموماً ان کو اپنا گواہ مقرر کر کے حکومت کے سامنے

پیش کرتے ہیں، اور مقدمہ کا فریق ثانی بھی عموماً ان کی شہادت کے ساتھ اپنی رضا مندی کا اظہار کرتا ہے، کبھی کسی خاص گواہ کی گواہی پر فریق ثانی کو اگر اعتراض بھی ہوتا ہے، تو اس کی جگہ گواہی میں پھر مسلمان ہی کو پیش کر دیا جاتا ہے اور اسی کے بیان پر مقدمہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔" (ہزار سال پہلے ص۵۱)

کاش مسلمان اپنے ان کھوئے ہوئے اخلاق و اعمال کو بروئے کار لاتے اور پھر صحابۂ کرام رض کے نقش قدم پر مرمٹنے کا جذبہ پیدا کر لیتے، جو ہمارے اسلاف کا طریقہ تھا۔

مسلمانوں کی ترقی دین سے وابستہ ہے

خدا گواہ ہے کہ آج بھی اگر مسلمان پکا مسلمان بن جائے تو دنیا اس کے قدم پر سر جھکا دے، یہ غلط ہے کہ آج حالات سازگار نہیں ہیں، سب کچھ ہے مگر مسلمان ہی، وہ مسلمان باقی نہ رہے جیسا ان کو رہنا چاہئے تھا، خدا بھلا کرے ان مسلمانوں کا جنھوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ انگریزوں سے لڑنے کے لئے انگریز بننا ضروری ہے اور ہندوؤں سے حقوق حاصل کرنے کے لئے ہندو جیسا مگر یہ نہ سوچا کہ مسلمان کی تمام تر ترقی اسلام کی کامل پیروی میں مضمر ہے۔ یہ دعویٰ نہیں حقیقت ہے کہ مسلمان اسی وقت باعظمت ہو سکتا ہے، جب وہ پکا سچا مسلمان بن جائے۔ اسی لئے ہماری ہر آن دعا ہے۔ ؎

بے لوث محبت ہو، بے باک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر، دل صورتِ مینا دے

مسلمانوں سے غیر مسلموں کی عقیدت

عجائب الہند ہی کے حوالہ سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ کولم ملی میں ایک موذن تھا جو اذان دیا کرتا تھا، اس کے جھاڑ پھونک کے لوگ بڑے

قائل تھے، ناگ سانپ کے زہر کے ازالہ میں اس کو کمال حاصل تھا، شاید یا اس سلسلہ میں اس کا جھاڑ پھونک خطا کرتا ہو۔

اس واقعہ کو پیش کر کے بتانا ہے کہ دیکھئے دیندار مسلمانوں سے غیروں کو بھی کس قدر سچی عقیدت تھی، یہ تو خیر عوام کا حال تھا، لیکن سلیمان تاجر کا بیان ہے۔

"بلھرا کا راجہ اس ملک کا سب سے بڑا بادشاہ ہے اور تمام راجگانِ ہند اس کے فضل و شرف کو مانتے ہیں، اگرچہ ہندوستان کا ہر راجہ اپنے اپنے علاقہ کا مستقل حکمراں ہے، لیکن بلھرا کی سیادت سب ہی تسلیم کرتے ہیں"

شاہی خاندان کی عقیدت مسلمانوں سے

مگر بایں ہمہ مسلمانوں سے اس خاندان کو کیسی عقیدت تھی، سلیمان کا بیان ہے:۔

"بلھرا کی حکومت والوں کا خیال ہے کہ ان کی حکومت کی مدت اور ان کی عمر کی درازی کا سبب یہ ہے کہ عرب یعنی مسلمانوں سے وہ محبت کرتے ہیں"

(ہزار سال پہلے ص۱)

آپ نے سنا، یہ تھی عقیدت مسلمانوں سے حکمراں طبقہ کو، سوچئے کیا یہ عقیدت کسی دنیاوی جاہ و جلال کی وجہ سے تھی؟ نہیں محض اس وجہ سے کہ اس وقت کے مسلمان، مسلمان تھے، نام کے مسلمان نہیں تھے، جس پر نگاہ ڈال دی، مالامال ہوگیا، ان کے اعمال و اخلاق پاکیزہ تھے، کردار بلند تھے، اور خدا سے ہر وقت لرزہ براندام رہا کرتے تھے۔

اس مادی دنیا میں ایمان داروں کی بڑی کمی ہے اگر آج بھی مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں تو آپ یقین کریں، باوجود محکوم اور اقلیت میں ہونے کے ساری دنیا پر بھاری ہو جائیں۔ ۔ ہ

گنوادی تم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا نے زمیں پر آسماں سے تم کو دے مارا،

چین میں مسلمانوں پر اعتماد

سلیمان تاجر نے چین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"شہر خانفو چین کے مسلمان تاجروں کا مرکزی مقام تھا، یہاں بھی چین کے بادشاہ نے مسلمانوں پر حکومت اور ان کے متعلق فصل خصومات کے اختیارات کو ایک مسلمان ہی کے سپرد کر رکھا ہے، عید کے دن مسلمانوں کو وہی نماز پڑھاتا ہے اور خطبہ پڑھتا ہے، اور مسلمانوں کے خلیفہ کے لئے دعا کرتا ہے ..... اور اللہ کی کتاب کے مطابق اور اسلامی قوانین کے مطابق وہ فیصلہ کرتا ہے، اس پر بھی کسی کو اعتراض نہیں ہے"

(ہزار سال پہلے ص۱۹)

حضرت سید گیلانی اس واقعہ کو نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں اور آج کل کے مسلمانوں کو مخاطب کر کے۔

"جنھوں نے یورپ سے سیاست کا علم سیکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ سیاست کا علم صرف ان ہی کی ذات قدسی صفات میں منحصر ہے، ان کو سننا چاہئے کہ وہی عید کی نماز اور جنازوں کی نماز پڑھانے والے مسجد کے ملّانے، بے تیغ و تفنگ اقلیت کی انتہائی مشکلوں میں بھی وہ سب کچھ حاصل کر لیتے تھے، جسے آج سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا" (ہزار سال پہلے ص۱۹)

آداب شاہی سے مسلمان مستثنیٰ

بزرگ بن شہریار نے لکھا ہے کہ ان ملکوں کے بادشاہ کے سامنے بیٹھنے

کے خاص آداب تھے، جن کی پابندی ہر ایک کو کرنی پڑتی تھی، خلاف ورزی کی صورت میں سزا کے مستوجب ٹھہرتے تھے، مگر مسلمانوں کو اس قانون سے آزاد رکھا گیا تھا، خود ابن شہریار ہی کا بیان ہے :۔

"اس وقت تک یہ دستور چلا آرہاہے، کہ غیر مسلم راجگان کے سامنے مسلمان جس طرح چاہیں بیٹھ سکتے ہیں، لیکن مسلمانوں کے سوا دوسرے لوگ مذکورہ بالا قاعدے کے مطابق بیٹھنے پر مجبور ہیں، جس کا نام برسیلا ہے، نشست کے اس طریقہ کے خلاف راجہ کے سامنے اگر کوئی بیٹھنے کی جرأت کرے، تو اسے جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے" (ہزار سال پہلے صلا۲)

سچ ہے جو خدا کے احکام کی بجاآوری کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتا ہے اس سے کسی اور کے قانون کی پابندی کا بوجھ اٹھالیا جاتا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں یہ ہیں وہ مسلمان جو اقلیت میں ہیں، کمزور ہیں، محکوم ہیں، مگر — الحمدللہ ذلیل نہیں، بے وقعت نہیں، اور کسی حکمراں طبقہ کی نگاہ میں حقیر نہیں ۔

کاش آج کا مسلمان سوچتا کہ دنیا میں اس کی بے وقعتی کا سبب کیا ہے ؟ یہ غلط ہے کہ مسلمان کمزور اور اقلیت میں ہیں، تاریخ شاہد ہے باایں ہمہ باوقار زندگی کے مالک رہے ہیں، دعا کی جائے ۔

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

حاکموں کا حال

یہ تو آپ نے محکوم مسلمانوں کے حالات ملاحظہ فرمائے، اب ذرا حاکموں کا حال بھی سن لیجئے کہ یہ کس حالت میں تھے اور کس نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔

ابن حوقل نے آرمینیہ کے حالات لکھتے ہوئے بیان کیا ہے :۔

"اس علاقہ میں زیادہ تر عیسائی آباد ہیں، یہ وہ لوگ ہیں، جن میں بنی امیہ

دبنی عباس والوں ہی کے زمانہ سے کچھ معاہدات ہوگئے ہیں، اوران ہی معاہدات کی بنیاد پر یہ اپنے وطن پر قابض ہیں، البتہ معاہدات کی رو سے جو مطالبات ان کے ذمے عائد کئے گئے ہیں ادا کرتے ہیں ''

(ہزارسال پہلے ص۲۶۷)

سب کچھ ہونے کے باوجود معاہدہ کی خلاف ورزی کی جرأت کبھی نہیں ہوئی بس جو مطالبات معاہدات میں مذکور تھے، وہ ملتے رہنا چاہئے، پھر ملک گیری کی کوئی معمولی حرص بھی نہیں ہوتی تھی، اور یہی نہیں ابن حوقل نے اپنا مشاہدہ لکھا ہے :۔

''۳۵۸ھ تک یہ میرا مشاہدہ ہے کہ ان سے جو معاہدہ کیا گیا ہے، اور جن جن باتوں کی ذمہ داری لی گئی ہے۔ ان کی پوری پوری پابندی کی جاتی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مذکورہ بالا سن تک میں نے دیکھا کہ اس علاقہ کے غلاموں کو بغداد میں نہیں خریدا جاتا، اور نہ کوئی ان کی خریداری کو جائز سمجھتا ہے جس کی وجہ یہی ہے کہ ان سے عقدِ ذمہ کا معاہدہ ہے ''

(ہزارسال پہلے ص۲۶۸)

جذبہ جہاد اسلامی مسلمانوں میں

اسے کہتے ہیں معاہدہ کا پاس، اسی آئین دوستی کا نتیجہ تھا کہ ساری دنیا مسلمانوں پر اعتماد کرنے پر مجبور تھی، قوت مسلمانوں کو بہکایا نہیں کرتی تھی، بلکہ آئینِ اسلام پر چلنے میں ممد و معاون ہوا کرتی تھی ۔

ابن حوقل خراسانی مسلمانوں کے متعلق لکھتا ہے :۔

''جہاد کرنے میں ان خراسانی مسلمانوں سے اپنی طاقت وقوت اور جوش کے لحاظ سے اسلامی ممالک میں کوئی ملک ان کے جوڑ کا نہیں ہے ''

(ہزارسال پہلے صــــ)

یہ تھا جوشِ جہاد، اس زمانہ کے مسلمانوں میں، پھر اللہ تعالیٰ اس قوم کو عزت و وقار اور شان و شوکت سے کیوں نہیں نوازتا، قاعدہ ہے جس قوم میں جہاد کی ایسی اسپرٹ ہوگی، وہ عظمت و وقار سے زندگی گذارے گی،

ایک پیش گوئی حدیث میں

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک زمانہ ایسا آئے گا جب ساری دنیا مسلمانوں پر اس طرح ٹوٹ پڑے گی، جس طرح کھانے والے کھاتے وقت گوشت کے پیالے پر ٹوٹ پڑتے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا ایسا کیوں ہوگا یا رسول اللہ؟ کیا وہ تعداد میں بہت کم ہو جائیں گے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، وہ نسبتاً تعداد میں بہت زیادہ ہوں گے، مگر ان میں دو مہلک مرض پیدا ہو جائیں گے، پوچھا گیا، وہ کیا؟ آپ نے فرمایا زندگی کے ساتھ ضرورت سے زیادہ محبت، اور موت سے ناگواری۔

شاید یہی زمانہ ہمارا ہے، کہ مسلمان با ایں ہمہ کثیر تعداد بزدل، دوں ہمت اور کم زور ہو رہے ہیں جس کا حسرت ناک انجام یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ مسلمان کہیں بھی باعزت زندگی کا مالک نہیں رہا، دن رات اس کی ذلت و خواری کسی نہ کسی نہج سے بڑھتی جا رہی ہے۔

حج کا ذوق مسلمانوں میں

خراسانی مسلمانوں کے ذوق حج کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن حوقل رقمطراز ہے:۔

"ان میں جن لوگوں کا حکومت سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے ان کا بھی حال یہ ہے کہ باوجود اتنی بُعد مسافت کے حج کا انتہائی ذوق ان لوگوں پر غالب

ہے، صحراء کے قطع کرنے میں ان سے زیادہ جری کوئی نہیں "

(ہزار سال پہلے ص۲۷۵)

ایک طرف جوش جہاد سے مسلح تھے، تو دوسری طرف ذوقِ حج کا یہ عالم تھا، کہ صحرا در راستے میں حائل ہیں، آج کی سی سہولت میسر نہیں، پیدل یا اونٹ وغیرہ پر سفر کر کے مکہ معظمہ پہنچ رہے ہیں اور بیت اللہ کی زیارت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اب یہ ذوق کہاں باقی رہا؟ جانے والے آج بھی جاتے ہیں، مگر دلوں میں وہ امنگ، وہ اخلاص اور وفاداری جو چاہیئے کہاں باقی ہے؟

مسلمانوں میں احکام اسلام کا جذبہ

ابن حوقل ہندوستان کے ساحلی علاقوں کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے:۔

"ان شہروں میں جامع مسجدیں پائی جاتی ہیں اور مسلمان اسلامی احکام کی پابندی علانیہ کرتے ہیں " (ہزار سال پہلے ص۲۶۶)

آگے شراب وغیرہ کا تذکرہ کر کے لکھتا ہے:۔

"خدا کی قسم اس (شراب) کو نہیں جانتا اور نہ اس کو دیکھا ہے اور نہ اس سے واقف ہوں کہ وہ ہے کیا چیز، اور اس کا مزہ کیسا ہے "

(ہزار سال پہلے ص۲۶۶)

یہ تھا شریعت پر عمل پیرا ہونے کا دینی جذبہ۔ کہ نہ عوام احکام کی پابندی سے بیگانہ ہیں نہ خواص، ابن حوقل جیسا سیاح قسم کھا کر کہتا ہے کہ شراب سے وہ قطعًا واقف نہیں،

اندازہ لگایئے اس زمانہ کے مسلمانوں کی احکام کی پابندی کا کیا عالم تھا اب شراب سرمایہ دار اور با اقتدار مسلمانوں کے لئے جزو زندگی کی حیثیت میں ہے۔ عمومًا بڑا شاعر، بڑا عہدے دار، بڑا مالدار اور بڑا سیاح ان خرافات

میں زندگی برباد کر رہا ہے، الا ماشاء اللہ، ہاں غریب مسلمان اب بھی بحمد اللہ اس گناہ سے کسی نہ کسی طرح محفوظ ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کو ہمیشہ محفوظ رکھے۔

ہزار سال پہلے مسلمانوں کی صنعت کا حال

اب ایک سرسری نظر مسلمان حکومتوں کی صنعت وغیرہ پر بھی ڈال لیجئے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ ہزار سال پہلے مسلمان حکومتوں کی بیداری کا کیا حال تھا۔ کابل کا تذکرہ جہاں کیا، وہاں لکھتا ہے:-

"کابل سے بہترین سوتی کپڑے باہر بھیجے جاتے ہیں، سنبیات (ایک قسم کا کپڑا) بنتے ہیں، چین بھی جاتے ہیں اور خراسان کی طرف بھی روانہ ہوتے ہیں، سندھ اور اس کے ملحقہ علاقوں میں بھی بھیجے جاتے ہیں"

(ہزار سال پہلے ص۲)

ملاحظہ فرمایا آج سے ہزار سال پہلے مسلمانوں کا کتنا اچھا حال تھا، کابل سے ادنیٰ نہیں سوتی کپڑوں کی غیر ملکوں میں سپلائی ہوتی تھی، آج ان ممالک اسلامیہ میں چلے جایئے اور کپڑوں کو اٹھا کر دیکھئے کہ ان کے بازاروں میں کیا ہوتا ہے تو کسی پر میڈ اِن مانچسٹر، اور کسی پر میڈ اِن لنکاشائر، لکھا ہوا نظر آئے گا میڈ اِن کابل دیکھنے کو آنکھیں ترس جائیں گی، مگر نظر نہ آئے گا، پھر ہمارے اسلاف دنیا میں با اقتدار کیوں نہیں ہوتے، اور ہم ان کے مقابلے میں مصیبت زدوں کی صف میں کیوں نظر نہیں آئیں۔

ایران کے ایک شہر میں صنعت

اسی طرح ابن حوقل نے ایرانی شہروں میں ایک شہر بضیؒ کے متعلق لکھا ہے:-

"بضیؒ میں وہی پردے بنے جاتے ہیں جو روئے زمین میں مشہور ہیں، ان

پردوں پر لکھا ہوتا "عمل بصنعتی"۔" (ہزار سال پہلے ص۲۶۲)

اسلامی ملکوں کے باب میں یہ شہادت ایک مسلمان سیاح کی ہے اور وہ چشم دید گواہی، جس میں شک و شبہ کی کہیں سے کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے، کاش مسلمان اپنی گذشتہ تاریخ پڑھتے اور سوچتے کہ ہم کیا تھے کیا ہو گئے پھر نئے امنگ و ولولہ کے ساتھ اپنی پچھلی تاریخ دھرانے کی جدوجہد کرتے ان کا کام محض عزم و ارادہ ہے، پورا کرنے والا خدا ہے، اور ارادہ کے بعد وہ پورا ضرور کرتا ہے۔

مسلمانوں کے بنے ہوئے کپڑوں کی پائیداری

ممالک اسلامیہ میں جو کپڑے تیار ہوا کرتے تھے، وہ بہت مضبوط اور پائدار ہوا کرتے تھے، عدن، یمن اور ایران کے شہروں کی مصنوعات کا جہاں تذکرہ کیا ہے وہاں لکھا ہے۔

"شہروں میں ایسے کپڑے بنے جاتے تھے کہ ان کی بقاء کی مدت پانچ برس سے بیس برس تک ہوتی تھی" (ہزار سال پہلے ص۲۵۰)

اندازہ کیجئے کتنے پائدار اور مضبوط کپڑے تیار ہوا کرتے تھے، گویا گھٹیا درجہ کا کپڑا بھی کم از کم پانچ سال ضرور چلتا تھا۔

نامی گرامی لوگ بھی یہی کپڑے استعمال کرتے

دیناری کپڑا جو سمرقند سے چھ میل کی دوری پر دیدار نامی قصبہ میں تیار ہوتا تھا اور امیر، وزیر، قاضی، فوجی اور سارے دوسرے افراد شوق سے پہنا کرتے تھے، اس دیداری کپڑے کے متعلق ابن حوقل نے اپنا ذاتی تجربہ لکھا ہے:۔

"میں نے خود ایک سے زائد کپڑے اس کے پانچ پانچ سال تک استعمال

کئے ہیں "

اب تو اتنے مضبوط کپڑے تیار بھی نہیں ہوتے، نمائشی تو ضرور ہوتے ہیں، مگر پائدار قطعاً نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ آدمی کا کپڑوں پر کافی صرفہ ہوتا ہے، ہر دوسرے تیسرے مہینے بچوں کے کپڑے بوسیدہ ہو کر بے کار ہو جاتے ہیں، کسی نے بڑی احتیاط برتی تو چھ آٹھ ماہ تک، لیکن پانچ سال اور ان میں جتنا تفاوت ہے، ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے۔

مالدار مسلمانوں کا علم وفن سے تعلق اور اس کی قدر افزائی

مسلمانوں نے علم وفن کی جو قدر افزائی کی وہ بھی انہی کا حصہ ہے، جاحظ جو تیسری صدی ہجری کا ایک ادیب ہے خود اس کا بیان ہے۔

"میں نے کتاب الحیوان لکھ کر عبد الملک الزیات کی خدمت میں ہدیہ کی، تو اس کے صلہ میں پانچ ہزار اشرفیاں اس نے مجھے بھیجیں، پھر میں نے اپنی کتاب "البیان والتبیین" احمد بن ابی داؤد کے دربار میں پیش کی، اس نے بھی اسی وقت پانچ ہزار اشرفی سے میری ہمت افزائی کی، پھر کتاب الزرع والنخل لکھ کر میں نے ابراہیم بن عباس الصول کے پاس بھیجی، جواب میں اس نے پانچ ہزار اشرفیاں روانہ کیں " (ہزار سال پہلے ۲۲۵)

یہ تھی علم نوازی، امراء اسلام کی۔ اور یہ تھی حوصلہ افزائی ارباب فضل وکمال کی، پھر علم وفن کو ترقی کیوں نصیب نہ ہوتی، ہوئی اور خوب ہوئی۔

مسلمانوں میں علمی دلچسپی

ابن حوقل نے مسجدوں کے تذکرہ کے سلسلہ میں اس زمانہ کی علمی دلچسپی کا ذکر بھی کیا ہے، ہرات کی مسجدوں کا تذکرہ کرنے کے بعد رقم طراز ہے :-

"وجہ اس کی یہ ہے کہ ان مسجدوں میں ایک بڑا گروہ علماء اور فقہاء کا مقیم ہے
اور جیسے شام یا مسلمانوں کی سرحدی چوکیوں کی مسجدوں کا حال ہے وہی
حال ان کا بھی ہے یعنی ان علماء سے استفادہ کرنے والوں کی حالت یہ ہے
کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے" (ہزار سال پہلے ص۲۲۳)

گویا مسجدوں سے دار العلوم کا کام بھی چلا کرتا تھا اور طلبہ کا ہجوم رہا کرتا تھا، انداز بیان شاہد ہے کہ مسلمانوں میں علم دوستی کا نشہ تھا۔

ہرات و بلخ میں علمی ذوق

ہرات کی طرح بلخ شہر کی پہلے تعریف کرتا ہے، پھر اس شہر کی خوشنمائی کو بیان کرتا ہے اور اخیر میں لکھتا ہے :-

"اس شہر کے باشندوں پر عموماً علم و ادب کا ذوق غالب ہے، غور و فکر
اور دقیق علوم کے مسائل سے انھیں بڑی دلچسپی ہے، یہاں سے بڑے بڑے
علماء اٹھے ہیں" (ہزار سال پہلے ص۲۲۲)

اب تو بجائے علم و فن کے کھیل تماشہ کا ذوق غالب ہوتا جا رہا ہے، سینما تھیٹر کی کثرت ہے، کلب گھروں کی بہتات ہے، اور وہ تمام برائیاں ہیں جن سے اسلام نے سختی کے ساتھ روکا ہے، اور حیرت یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے اس تنزل پر ذرہ برابر افسوس بھی نہیں۔

حکومت گئی، شان و شوکت گئی۔ دینی وقار گیا، اور حد یہ ہے کہ علم و فن کی محبت بھی جا رہی ہے، ایک سیلاب آیا اور مسلمانوں کی یہ ساری چیزیں اس کی رو میں بہہ گئیں، اور بہتی جا رہی ہیں، یہاں پہنچ کر علامہ اقبال وہ شعر یاد آ رہا ہے، جو انھوں نے نوجوانان مسلم کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے، اس کے اخیر میں فرماتے ہیں

حکومت کا کیا رونا کہ وہ اک عارضی شئی تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبار کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

عنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشہ کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

چھوٹے لوگوں میں علمی ذوق

ابن حوقل جس دور کا تذکرہ کر رہا ہے، اس دور میں مسلمانوں کے بچہ بچہ میں علمی ذوق موجزن تھا، مزدور اور قلی چلتے پھرتے علمی مسائل پر گفتگو کرتے نظر آتے تھے، خود اسی کا اپنا بیان ہے کہ خوزستان کے شہروں میں یہ نظارہ اس کی آنکھوں نے دیکھا۔

"میں نے ایک حمال (قلی) کو گذرتے ہوئے دیکھا کہ اس کے سر پر..... بھاری بوجھ لدا ہوا تھا اور ایک دوسرا حمال بھی اسی کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا، اور دونوں "التاویل" (قرآنی آیات کی تفسیر) اور علم کلام کے حقائق و مسائل میں جھگڑتے جا رہے تھے، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ان دونوں پر جو بوجھ لدے ہوئے تھے اپنے خیالات کے مقابلہ میں ان کی کوئی پرواہ ان کو نہیں ہے"

(ہزار سال پہلے ۲۲۵)

ملاحظہ فرمایا، ایک دور وہ تھا، کہ قلی تک علمی مسائل و حقائق پر چلتے پھرتے مباحثہ کرتے نظر آرہے تھے اور ایک یہ ہمارا دور ہے کہ علماء تک کو علمی مسائل سے طبعی ذوق نہیں ہے، یوں فرائض کی حد تک پڑھتے پڑھاتے ہیں مگر درسگاہ سے باہر کی دنیا میں کہیں سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہی وہ حضرات ہیں جن کو معلمین کا درجہ حاصل ہے، جہاں دیکھیے شکوہ، غیبت، چغل خوری، حسد اور بغض و کینہ کی گفتگو جاری ہے، بڑا کمال دیکھنے میں آئے گا تو یہ کہ اخباری خبروں پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جہاں اکابر کا یہ حال ہو، اصاغر کو کون پوچھتا ہے، الناس علی دین ملوکہم۔

اسلاف کی علمی خدمات

اسلاف بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھ گئے، آج کوئی ان کا پڑھنے والا نہیں ہے، جہاں کتابیں ہیں کیڑوں کی نذر ہو رہی ہیں، علما کرام کا بڑا عیب یہ ہے کہ باایں ہمہ بے ذوقی ہر ایک اپنی جگہ یہ یقین کئے بیٹھا ہے کہ مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ کوئی عالم کسی عالم کی عزت کرنے کو ایک لمحہ کے لئے آمادہ نہیں۔

آہ کس طرح عرض کروں کہ علم وفن سے اس بے رغبتی پر دل کس قدر کڑھتا ہے مگر اس سے ہوتا کیا ہے، کاش اہل علم اور ارباب فضل وکمال خواب سے چونکتے اور اپنے فرائض کا احساس پیدا کرتے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب نکمے ہی ہیں، نہیں اپنے دوسرے طبقہ سے بہر حال غنیمت ہیں، مگر بیداری کی ضرورت ہے اور جو بیدار ہیں ان میں چستی کا انتظار ہے۔

مسلمانوں کے رفاہی کارنامے

مسلمانوں نے رفاہ عام کے کاموں کی طرف بھی کافی توجہ دی۔ بلکہ کہنا چاہئے جس دور کی باتیں ہو رہی ہیں اس دور میں مسلمان ان کاموں کو اپنا پہلا فریضہ سمجھتے تھے، ذاتی کاموں سے زیادہ ان کو رفاہ عام کے کاموں کا خیال رہتا تھا۔ ابن حوقل نے لکھا ہے کہ دریائے دجلہ کے انتہائی دہانہ پر مزابلہ کے پاس ایک ایسا گرداب عظیم تھا جہاں جہاز ڈوب جایا کرتے تھے، ہارون رشید کی اہلیہ محترمہ زبیدہ نے اسے پٹوا دیا، لکھا ہے :-

"زبیدہ نے اس گرداب کو پہلے کشتیوں کے ذریعہ سے قابو میں لانے کا حکم دیا اور آخر میں مسلسل پتھر کی چٹانوں کو ڈال ڈال کر اس کو بھروا دیا، اور اب بحری سفر کے مسافر اس گرداب کی آفت سے محفوظ ہو گئے۔"

(ہزار سال پہلے ص۲۱۵)

کیا اب بھی حکمراں طبقہ میں یہ جذبہ باقی رہا؟ کون نہیں جانتا کہ اب دوسرے لوگوں کی طرح مسلمان حکمراں طبقہ میں بھی ذاتی منفعت کا خیال زیادہ پرورش پانے لگا ہے، اپنے معمولی نفع کے آگے رفاہِ عام کے کام کو پیچھے ڈال دیتے ہیں، اگر کوئی راستہ ایسا ہے جس سے حکمراں طبقہ کو جماعتی یا انفرادی طور پر گذرنا پڑتا ہے تو اسے دیکھئے پختہ، صاف ستھرے اور ہر طرح اچھے نظر پڑیں گے، بخلاف اس کے عام گذرگاہ جن سے ان کو واسطہ نہیں، جس حالت میں بھی ہوں، ان کو توجہ نہیں ہوگی۔

مشائخ طریقت کی پاکیزہ زندگی
اور
ان کے اصلاحی کارنامے

تاریخی حقائق

صوفیاء اور اولیاء کرام

"ادھر چند مہینے ہوئے میں نے "تاریخ مشائخ چشت" پڑھی، اس سوا آٹھ سو صفحات کی ضخیم کتاب میں ساری باتیں ہی کام کی ہیں، مگر چند واقعات جو میرے قلب و دماغ پر اثر انداز ہوئے، ان پر نشان لگاتا گیا، آج کی فرصت میں انہی میں سے کچھ واقعات حاضر خدمت ہیں، "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" (ظفیر صدیقی نومبر ۱۹۵۴ء)

انسانی دلوں کی راحت رسانی

شیخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کسی تعارف کے محتاج نہیں، آپ نے ایک دفعہ فرمایا :-

"مجھے خواب میں ایک کتاب دی گئی، جس میں لکھا ہوا تھا کہ "جہاں تک ہو سکے دلوں کو راحت پہنچا"، کیوں کہ مومن کا دل اسرار ربوبیت کا محل ہے ——— یہ بھی فرمایا "قیامت کے بازار میں کوئی اسباب اتنا مروج اور قیمتی نہ ہوگا، جتنا دلوں کو راحت پہنچانا"، (تاریخ مشائخ چشت ص۱۰۶)

دلوں کو راحت پہنچانا ہمارے بزرگوں کی نظر میں کتنا اہم کام ہے، کیا اب یہ بات باقی رہی؟ اب تو اس دور میں کسی کو ستانا، اذیت دینا اور دل زخمی کرنا ہی عمدہ بات سمجھی جاتی ہے، وہ بات مزہ دار ہی نہیں جس میں

کچھ تیر و نشتر نہ ہوں، یقین کریں بندوں کے دلوں کو راحت پہنچانے پر بڑا ثواب ہے۔

مسلمان بھائیوں کا غم

ایک مرتبہ حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:۔

"جس قدر غم واندوہ مجھے رہتا ہے کسی کو اس جہاں میں نہ ہوگا، اس واسطے کہ اتنی مخلوق میرے پاس آتی ہے اور اپنے رنج وتکلیف کو بیان کرتی ہے ان سب کا بوجھ میرے دل وجان پر پڑتا ہے، وہ عجیب دل ہوگا جو مسلمان بھائی کا غم سنے اور اس پر اثر نہ ہو"

(تاریخ مشائخ چشت ص۳۸۴)

غریبوں اور مصیبت زدوں کی ایسی فکر اب کس کو ہوتی ہے؟ اپنا پیٹ بھر گیا سمجھے ساری دنیا آرام میں ہے، اب تو ہمارے زمانہ کی روش ہی بدلی ہوئی ہے، غریبوں کو کوئی نہیں پوچھتا، چند ہی لوگ نکلیں گے، جو خلوص سے ان مصیبت زدوں کے لئے دعا بھی کرتے ہوں گے۔

برائی کا بدلہ نیکی سے

شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کا یقین تھا کہ برائی کا بدلہ اگر برائی سے دیا جانے لگا تو پھر یہ دنیا انسانی بستی باقی نہیں رہے گی کچھ اور ہو جائیگی آپ فرمایا کرتے تھے:۔

"اگر کوئی کانٹا رکھے اور تو بھی اس کے عوض کانٹا ہی رکھے، تو کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے..... یہاں نیک و بد دونوں کے ساتھ نیکی ہونا چاہیئے" (تاریخ مشائخ چشت ص۴۹۱)

یہ تھا عمل ہمارے اسلاف کا، حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "احسن

الی من اساء الیك" (اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤ، جو تمہاری برائی کے درپے ہو) پر، اس دور میں یہ بات لوگوں کی سمجھ میں بھی نہ آئے گی کہ برائی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے، یہاں تو ردعمل کا دورہ پڑا ہوا ہے، اگر کوئی کسی کی انگلی کاٹنے کو کہے، تو دوسرا موقع پا کر اس کے بدلہ میں اس کی گردن کاٹ ڈالے گا ہندوپاک میں اقلیت کی خون ریزی اور عصمت دری کے جو واقعات پیش آئے وہ اسی ردعمل کے نام پر۔

دشمنی کا بدلہ نرمی سے

اسی چیز کو محبوب الہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسرے موقع پر اس طرح فرمایا :

"دو چیزیں ہیں ایک نفس دوسرے قلب، جب کوئی نفس سے پیش آئے تو اس سے قلب سے پیش آنا چاہئے، یعنی نفس میں دشمنی، غوغا اور فتنہ ہے، اور قلب میں سکوت رضا اور نرمی، پس جب کوئی نفس (دشمنی) سے پیش آئے تو اس سے قلب (نرمی) سے پیش آنا چاہئے اس طرح نفس (دشمنی والا) مغلوب ہو جائے گا، لیکن اگر نفس کا جواب نفس سے دیا جائے تو پھر دشمنی اور فتنہ کی کوئی حد نہیں رہے گی" (تاریخ مشائخ چشت ص۱۵۸)

کتنے دل نشیں پیرایہ میں اس مسئلہ کو آپ نے سمجھانے کی سعی کی ہے کاش ہم اس مسئلہ کو یقین کے ساتھ سمجھ لیں تو پھر دنیا میں جو فتنہ و فساد برپا ہے اور انسانی آبادی کو خاکستر بناتا چلا جاتا ہے، ختم ہو جائے، اور انسانیت کو سکون میسر آجائے۔

دل کی پاکی سے جھگڑا ختم ہوتا ہے

ایک دفعہ آپ نے دوسرے کی عداوت کے ازالہ کی تدبیر بتاتے ہوئے

فرمایا:۔

"اگر دو آدمیوں میں جھگڑا اور رنجش ہو، تو طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنا دل بالکل پاک و صاف کرلے، جب ایک شخص اپنا باطن عداوت سے پاک کرے گا، تو دوسرے کی طرف سے بھی آزار کم ہو جائے گا۔"

(تاریخ مشائخ چشت صہ ۱۵۱)

ضرورت ہے کہ یہ نصیحتیں ہمارے وزراء، علماء، صوفیاء اور دوسرے طبقوں کے لوگ غور سے پڑھیں اور ان پر عمل کریں۔

برائی بیان کرنے والوں کو معاف کرنا

آپ سے ایک دفعہ یہ شکایت کی گئی کہ برسر منبر کچھ لوگ آپ کو برا کہتے ہیں، یہ سن کر آپ نے فرمایا:۔

"جس نے مجھے برا اور ناسزا کہا ہے میں نے اسے معاف کر دیا، تمہیں بھی چاہیئے کہ ان لوگوں کو معاف کر دو۔" (تاریخ مشائخ چشت صہ ۱۵۱)

اب یہ اعلیٰ اخلاق ناپید ارہوتا جا رہا ہے۔ خدا کرے ہم ان کے فوائد کو سمجھیں۔

بد باطنوں کا جواب خاموشی

کچھ بد باطنوں نے خانقاہ میں آکر منھ پر آپ کو برا بھلا کہدیا، سن کر خموشی اختیار فرمائی، اس سلسلہ میں ایک دن فرمایا:۔

"لوگوں کے آپس کے معاملہ کی تین قسمیں ہیں، پہلی قسم یہ ہے کہ ایک شخص سے دوسرے کو نہ فائدہ پہنچے اور نہ نقصان، ایسا شخص جماد کا حکم رکھتا ہے دوسری قسم اس سے بہتر ہے اس میں وہ لوگ شامل ہیں جن سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے، نقصان نہیں پہنچتا، تیسری قسم یہ ہے کہ اس سے دوسرں

کو ہمیشہ فائدہ پہنچتا ہے، اگر لوگ اسے مضرت پہنچاتے ہیں تو وہ اس کی پاداش و مکافات کا خیال نہیں کرتا، بلکہ تحمل کرتا ہے اور تکلیفوں کو سہتا ہے۔ اصل میں یہ کام صدیقوں کا ہے" (تاریخ مشائخ چشت ص۵۲)

ایک چوتھی قسم کا آپ نے ذکر ہی نہیں فرمایا، جن سے صرف نقصان ہی نقصان پہنچتا ہے یہ قسم ہمارے اسلاف کے خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی اور غالباً یہی وجہ ہوئی کہ اسے ذکر نہیں فرمایا مگر ہمارے اس زمانہ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جو صرف ایذا رسانی کا ہی کام کرتے ہیں، نفع پہنچانا جانتے ہی نہیں۔

انسانوں سے ہمدردی

انسانوں سے محبوب الہیٰؒ کو بڑی ہمدردی تھی، لکھا ہے:۔

"گرمی کا موسم تھا، ایک دن حاضرین کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ سائے میں جگہ نہ رہی، لوگ دھوپ میں بیٹھنے لگے، حضرت محبوب الہیٰ کی طبیعت بے چین ہوگئی، فرمایا ــــــ ذرا پاس پاس ہو بیٹھو، تاکہ وہ بھی سائے میں بیٹھیں۔ کیونکہ دھوپ میں بیٹھے تو وہ ہیں اور جلتا میں ہوں" (تاریخ مشائخ چشت ص۵۳)

اب یہ درد اور بے چینی کہاں رہی؟ یہ بڑی قیمتی دولت تھی، جس سے اپنے اور غیر دونوں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے، کاش اسے آج ہم پھر اپنا لیں۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت میں کچھ کم نہیں کرّوبیاں

درویشوں کو غریبوں کا خیال

حضرت محبوب الہیٰ کے متعلق لکھا ہے کہ اکثر روزہ رکھا کرتے تھے

مگر سحری شاذ و نادر ہی آپ نے کبھی کھائی ہو، خادم سحری خواجہ عبدالرحیم عرض کرتے ہیں:۔

"مخدوم! آپ نے افطار کے وقت بہت ہی کم کھانا تناول فرمایا، اگر سحری کے وقت بھی تھوڑا سا کھانا تناول نہ فرمائیں گے تو ضعف بڑھ جائے گا، اور طاقت سلب ہو جائے گی، خواجہ عبدالرحیم کی یہ بات سن کر حضرت محبوب الٰہی زار و قطار رونے لگتے اور فرماتے۔ بہت سے مساکین اور درویش مسجدوں کے کونوں اور دکانوں کے گوشوں میں بھوکے اور فاقہ زدہ پڑے ہوئے ہیں، بھلا یہ کھانا میرے حلق میں کس طرح اتر سکتا ہے" (تاریخ مشائخ چشت ص۵۴)

آج جن لوگوں نے بھوکوں ننگوں اور مصیبت زدوں کے نام پر انگریزوں کو نکال کر حکومت سنبھالی، ان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ذات پر ہزاروں روپے ماہانہ خرچ کرتے ہیں، مگر ایک بھوکے کا بھی فاقہ نہیں توڑتے، ایک ننگے کو بھی انھوں نے چھ سال کی حکومت میں اپنا ایک پیسہ نہیں دیا جو کچھ کیا اپنے لئے کیا، ان کو حضرت محبوب الٰہی کے اس واقعہ سے سبق سیکھنا چاہئے کہاں ہیں مختلف جماعتوں کے لیڈران کرام پیغمبر اسلام کے اس فقیر بے نوا سے سبق حاصل کریں۔

انسانی خدمت کی اہمیت

حضرت محبوب الٰہیؒ عبادت سے زیادہ اہمیت انسانی خدمت کو دیتے اور فرماتے نماز، روزہ کوئی مشکل کام نہیں، مشکل یہ ہے "بنی نوع انسان میں شگفتگی پیدا کرنا، لوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا، برائی سے بچانا، اور بھلائی کی طرف بلانا"

٭ ٭ ٭

جنابت کی قسمیں اور ان سے پاکی

حضرت شیخ رکن الدین ملتانیؒ فرمایا کرتے تھے :-

"جنابت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک جنابت (ناپاکی) دل کی، دوسری جنابت بدن کی، بدن کی جنابت وہ ہے، جو عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے حاصل ہو، اور دل کی جنابت نالائقوں کی صحبت سے ہوتی ہے، بدن کی جنابت تو پانی سے پاک ہوجاتی ہے، لیکن دل کی جنابت آنسوؤں سے دھوئی جاتی ہے" (تاریخ مشائخ چشت ص۵۹)

دل کی گندگی اور اس کی پاکی کا مسئلہ خوب سمجھایا، واقعہ ہے بدکردار و بداخلاق کی صحبت انسان کے قلب کو آلائشوں سے بھر دیتی ہے، اگر کوئی اسے دور کرنا چاہتا ہے تو اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ رب العزت کے آگے روئے اور گڑگڑائے، کاش عام مسلمان اور علماء کرام اس مسئلہ کو سمجھتے اور عمل کرتے۔

ایک بزرگ کا جواب

شیخ ہجویریؒ نے بیان فرمایا:-

"ایک علم کے مدعی نے ایک فقیر سے کہا کہ تو نے نیلگوں لباس کیوں پہنا ہے؟ اس نے جواب دیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے تین چیزیں باقی رہیں، ایک فقیری، دوسرے علم، تیسرے تلوار ـــــ تلوار بادشاہوں نے پائی، مگر انھوں نے اس کو موقع پر استعمال نہ کیا، علماء نے علم اختیار کیا، مگر صرف سیکھنا ہی پسند کیا (عمل بھول گئے ظفیر) اور فقیری فقیروں کے گروہ نے پسند کی، مگر اس کو امیری کا آلہ بنایا، ان تینوں گروہ کی مصیبت پر نیلگوں لباس پہنا ہے" (تاریخ مشائخ چشت ص۷۶)

آج کل کے امراء اور حکمراں طبقہ علماء اور سجادہ نشیں صوفیا دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیں نیلگوں پوش فقیر نے جو بات کہی تھی صحیح ہے یا غلط؟ اگر صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو پھر ان کو سوچنا چاہیئے کہ ایک دن مرنا ہے اور رب العزت کے سامنے حاضر ہونا ہے، اپنی اپنی صحیح راہ اختیار کریں اور غلط راستے سے توبہ کریں، اسی میں نجات ہے ۔

خلیفہ وقت کو نصیحت

ایک دفعہ ہارون رشید اپنے وزیر فضل کے ساتھ خواجہ فضیل بن عیاض کی خدمت میں حاضر ہوئے، خواجہ صاحب نے حاضری کی اجازت نہیں دی خلیفہ کی حیثیت سے داخل ہونا پڑا، اس موقع سے خلیفہ ہارون رشید نے نصیحت کی درخواست کی، انھوں نے نصیحتیں کیں، ان میں ایک نصیحت یہ تھی، ہارون رشید کو مخاطب کر کے کہا :-

"یہ ملک تیرا گھر ہے، اور خلقت تیری اولاد، ماں باپ کے ساتھ نرمی بہن بھائیوں پر مہربانی، بچے بچیوں سے نیک سلوک کر، اگر کوئی مفلس بڑھیا رات کو بھوکی سو جائے گی، تو قیامت کے دن وہ بھی تیری دامن گیر ہوگی، اور تیرے ساتھ جھگڑے گی" (تاریخ مشائخ چشت ص۵۷)

یہ نصیحت اس لائق ہے کہ آج کل کے صدر جمہوریہ، گورنر جنرل، وزرائے اعظم اور دوسرے ذمہ دار حکام اس کو بار بار پڑھیں، اور اگر یہ درست ہے اور یقیناً درست ہے تو پھر عمل کرنا سیکھیں، جو لوگ اسلامی حکومت کو سمجھنا چاہتے ہیں، ان واقعات پر نظر کریں کہ حکمرانوں کی ذمہ داریاں کیا ہیں ۔

حق گوئی کی مثال

حق گوئی کی مثال ملاحظہ فرمایئے، لکھا ہے :-

"حضرت سفیان ثوریؒ نے حج کے موقع پر منیٰ کے میدان میں خلیفہ منصور کو پکڑ لیا اور کہا، امیر المومنین! حضرت عمرؓ نے ایک حج میں جس کے تمام مصارف پر صرف سولہ دینار خرچ ہوئے تھے فرمایا تھا "یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے سارا بیت المال لے لیا"۔ —— آپ نے خدا اور امت محمدیہ کا بے شمار مال بغیر اجازت صرف کیا ہے، آپ اللہ تعالیٰ کو اس کا کیا جواب دیں گے؟" (تاریخ مشائخ چشت ص۱۶۷)

اب اس زمانہ میں کسی وزیر، ولی عہد اور حکمراں سے حق بات کہنے کی کوئی جرأت ہی نہیں کرتا، حالانکہ یہ اہل علم کا فریضہ ہے کہ وہ کسی سے بھی منکر سرزد ہوتے ہوئے دیکھیں تو اس کو ٹوکیں اور اس کو راہ راست پر لانے کی سعی کریں، ہمارے زمانہ کے علماء اور صوفیاء چند افراد کو چھوڑ کر اگر خود نماز پڑھ لیتے ہیں اور دوسرے کام بے دلی ہی سے کر لیتے ہیں تو خدا پر بڑا احسان رکھتے ہیں، دوسروں کی اصلاح کی کوئی فکر نہیں کرتے، مگر سوچنا چاہیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"تم میں جو کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے، اس کو قوت سے روکے، اتنی قدرت نہ ہو تو زبان سے روکے، اور اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو دل میں بُرا سمجھے اور یہ ادنیٰ ضعیف تر درجہ ہے۔"

امام غزالیؒ کی نصیحت ایک بادشاہ کو

امام غزالیؒ نے محمد بن ملک شاہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں سب سے زیادہ عذاب جس کو دیا جائے گا وہ ظالم بادشاہ ہوں گے، حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے، اگر ایک خارشی بکری کی خبر گیری مجھ سے رہ گئی تو قیامت میں مجھ سے

مواخذہ ہوگا۔" (تاریخ مشائخ چشت ص۱۷۱)
اس کے بعد بادشاہ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :۔
"اے بادشاہ! دیکھو حضرت عمرؓ کو باوجود کمال احتیاط، عدل وانصاف کے مواخذہ کا کتنا ڈر تھا، اور تیرا حال یہ ہے کہ تجھ کو اپنی رعایا کی کچھ پروا نہیں، اور کچھ نہیں جانتا کہ تیرے ملک والوں کا کیا حال ہے۔"
(تاریخ مشائخ چشت ص۱۷۱)
پھر اسی طرح کی آپ نے نصیحتیں فرمائی ہیں، ظلم وجور سے منع کیا ہے، اور پبلک پر رحم وکرم کرنے کی تاکید کی ہے۔

اشرفی کی تھیلیوں سے خون

شیخ محی الدین عبد القادرؒ کے متعلق لکھا ہے کہ آپ مدرسہ میں تھے۔ اتنے میں :۔
"خلیفہ مستنجد باللہ ابو المظفر یوسف آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں، اور دس تھیلیاں اشرفیوں کی خدمت میں پیش کیں، آپ نے فرمایا مجھے ان تھیلیوں کی ضرورت نہیں، خلیفہ نے اصرار کیا، تو آپ نے ایک تھیلی اپنے دائیں ہاتھ میں لے لی۔ اور دوسری بائیں میں، اور دونوں کو دبا کر نچوڑا، تو ان سے خون بہنے لگا، پھر آپ نے فرمایا، ابو المظفر کیا تو حیا نہیں کرتا کہ لوگوں کا خون لے کر میرے پاس آیا ہے۔" (تاریخ مشائخ چشت ص۱۱۹)
گویا آپ کو بتانا تھا کہ یہ تھیلیاں ظلم وجور کا نتیجہ ہیں جو تم نے ستم ڈھا کر اور غریبوں کا خون بہا کر حاصل کیا ہے، یہ تمہاری جائز کمائی نہیں ہے، پبلک کا خون چوسنے سے ڈرا اتنی بے حیائی پر نہ اتر آ۔
ضرورت ہے کہ آج بھی حق پرست علی الاعلان مظالم پر تنقید کریں،

اور حکمراں طبقہ کو ظلم و جور سے روکیں، پیٹھ پیچھے کہنا کافی نہیں ہے، منھ پر کہیں اور تلخ انداز میں کہیں۔

عسرت کے زمانہ میں حضرت محبوب الٰہی کا استغناء

حضرت محبوب الٰہی کے متعلق لکھا ہے کہ ایک زمانہ میں سخت عسرت و تنگی کی زندگی گزار رہے تھے مگر اس زمانہ میں بھی استغناء کا یہ عالم رہا کہ:

”سلطان جلال الدین خلجی نے گاؤں پیش کرنے کی اجازت چاہی تو فرمایا ”مجھے اور میرے خدمت گاروں کو تمہارے گاؤں کی چنداں ضرورت نہیں، میرا اور ان کا خدا کارساز اور میر ساماں ہے۔“

(تاریخ مشائخ چشت ص۱۶۱)

پھر کسی بڑے سے بڑے کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے، جو بادشاہ کی جاگیر کو ٹھکرا دے، بادشاہ خود محسوس کرے کہ وہ کس تاب و دماغ کا انسان ہے۔

حضرت چراغ دہلوی کا مخلوق خدا سے تعلق

حضرت چراغ دہلویؒ اپنے پر آشوب زمانہ میں ایک مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم رہے اور ہر آن غریبوں اور آنے جانے والوں کی ضرورتیں پوری کرتے رہے، ایک دن خود فرمانے لگے۔

”اب مجھ کو فرصت مشغولی اور خلوت کی نہیں ہے، دن بھر مخلوق کے ساتھ رہنا چاہئے۔ اگر قیلولہ بھی میسر نہیں ہوتا، بارہا قیلولہ کرنا چاہتا ہوں، مگر خادم جگا دیتے ہیں کہ فلاں آیا ہے اٹھئے“ (ایضاً ص۱۸۳)

ہمارے زمانے کے وہ پیر صاحب اس واقعہ کو پڑھیں، جو اپنے دروازہ پر پہرہ دار رکھتے ہیں اور مخصوص وقت کے سوا کسی غریب سے نہیں ملتے - باقی مالدار، بڑے آدمی سے تو سب ہی ملتے ہیں، یہ پیر اور پیرزادے بھی ملے تو کیا بات ہوئی؟ -

اکبر شاہ کی اولاد کا حال

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے بعد ان کی اولاد نے جس طرح فضول خرچی اور جس قدر بیہودہ زندگی گذاری، خدا کی پناہ، جہاں دار شاہ کے متعلق بیان ہے کہ یہ اپنی محبوبہ پر سالانہ کروڑ روپیہ خرچ کرتا تھا، اسی طرح فرخ سیر نے گھوڑوں پر بے انتہا روپیہ خرچ کیا، اس کا نتیجہ کیا ہوا مورخ کے قلم سے سنئے، سر سید احمد خاں لکھتے ہیں :-

"اکبر شاہ اگرچہ تخت نشیں ہوئے مگر اخراجات کی تنگی کا وہی عالم تھا، جو شاہ عالم کے وقت میں تھا، شاہ عالم ہی کے وقت میں اخراجات کی نہایت تنگی تھی، تمام کارخانے ابتر ہو گئے تھے، شاہزادے جو قلعے کے نو محلے میں رہتے تھے ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا، اور چھتوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ "بھوکے مرتے ہیں، بھوکے مرتے ہیں"" (تاریخ مشائخ چشت ص ۳۳۵)

موجودہ زمانے کے وزراء وغیرہ اس واقعہ کو عبرت وبصیرت کی نگاہ سے پڑھیں، جو غریبوں کا حق غصب کرتے ہیں اور آج بڑی شاندار زندگی کے مالک بنے ہوئے ہیں، قدرت کا قانون ان کو بھی معاف نہ کرے گا، دیر سویر ایک دن آئے گا کہ ان کی اولاد بھی بھوک بھوک چلائے گی، مگر کوئی نہ سنے گا -

مخلوقِ خدا کیلئے شاہ کلیم اللہ کی ترغیب

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ اپنے مریدین کو ترغیب دیتے کہ تبلیغ کرو،

اور مخلوق کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ، فرماتے ہیں :-

"اپنے جان و مال کو اسی کام میں صرف کر دو۔ ------ دینی اور دنیاوی فیض دنیا کو پہنچاؤ، اپنا عیش و آرام اور راحت انسانوں پر فدا کر دو۔" (تاریخ مشائخ چشت ص۳۹۷)

یہ کسی سیاسی لیڈر کا بیان نہیں، ایک درویش عالم کا فرمان ہے غور کیا جائے مخلوق کی خدمت اور ان کی اصلاح کی ہمارے یہاں کتنی وقعت تھی، نادانی سے لوگوں نے سمجھا ہے، کہ علماء کو اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں -

محتاجوں کی خدمت

شاہ نظام الدینؒ کے متعلق فخر الطالبین میں مذکور ہے :-

"ان کے پاس اشرفی، روپیہ، پیسہ علیحدہ علیحدہ کاغذ میں بندھے ہوئے رکھے رہتے تھے، جو محتاج آتا اس میں سے دیتے تھے، فقیر کو ایک پیسہ سے زیادہ نہ دیتے تھے اور لوگوں کو اشرفیاں تک دیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ شریف کے لئے بڑی مشکل ہے، وہ شرم کے مارے بھیک بھی نہیں مانگ سکتا اور فاقہ کرتا ہے۔ ان لوگوں کا کیا ہے، یہ تو در در پھر کر خوب جمع کر لیتے ہیں۔" (ایضاً ص۴۴۷)

اس زمانہ میں کسی پیر اور پیر زادہ کا خیرات کرنا، اور محتاجوں کی امداد کرنا تقریباً عنقا ہے، یہ تو خود گداگر بنے در، در مارے پھرتے ہیں جس حلقہ میں نذرانے نہیں ملتے، اس حلقہ میں جانا ہی بند کر دیتے ہیں، اور جب حال یہ ہو تو ان سے تبلیغ اور اصلاح امت کی توقع سراسر دھوکہ ہے آجکل کے اکثر پیر اور پیر زادے دل کا استغناء کھو چکے ہیں، ایک بھکاری اور ان میں کوئی زیادہ فرق نہیں، اگر فرق ہے تو یہ کہ یہ ذرا مہذب اور

شائستہ ہیں جو جونک کی طرح مریدین کا خون چوس لیتے ہیں اور ان کو خبر تک نہیں ہوتی، مگر سارے ایسے نہیں ہوتے، کچھ برگزیدہ بندے بھی ہوتے ہیں مگر کم، اور ان ہی جیسوں سے دنیا قائم ہے۔

بزرگوں کے اخلاق

شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے اخلاق کے متعلق لکھا ہے کہ بہت بلند تھا، لوگوں کی دل دہی اپنا فرض سمجھتے تھے اور ہر آنے والے کو ایک نظر سے دیکھتے تھے، چنانچہ مذکور ہے:۔

"ہر شخص کے لئے یہ کھڑے ہو جاتے تھے، اور اس کی تعظیم کرتے تھے حد یہ ہے کہ چار سال کے بچہ کے لئے بھی وہی مبارک وضع رکھتے تھے جو ستر سالہ بوڑھے یا اکابر و فضلاء کے لئے" (تاریخ مشائخ چشت ۵۵۲)

اللہ تعالیٰ ان حضرات کی قبر کو نور سے بھر دے، یہ مساوات و عدل کی اپنے عمل سے تعلیم دے گئے اور ہر حق والے کو اس کا حق دیا، اب یہ چیز نایید ہے، اب خاندانی خانقاہوں میں اگر کوئی غریب پہنچ جائے تو وہ صبح سے شام تک بیٹھا رہ جائے مگر ملاقات تک نصیب نہ ہوگی، اور اگر کوئی ذکیل سرمایہ دار اور حاکم وقت آجائے تو فوراً حجرہ کے کواڑ کھل جائیں اور پیر زادے کھڑے استقبال کے لئے نظر آئیں، اب غریبوں، دیہاتیوں اور اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ وہ شفقت و محبت کہاں؟ جو ہمارے اسلاف میں تھی یہ تو اپنے چھوٹوں کو حقیر نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے ان کی نمائشی زندگی کی قلعی بہت جلد کھل جاتی ہے اور عوام میں ان کا وقار باقی نہیں رہتا ہے دولت کے سہارے اس کے برقرار رکھنے کی سعی کی جاتی ہے، مگر اب بھی کچھ خانقاہیں پرانی یاد تازہ کرتی ہیں اور جہاں غریبوں کے لئے بھی وہی انتظام ہے جو مالداروں کے لئے ہے۔

بادشاہوں سے بے نیازی

شیخ اورنگ آبادی کا حال یہ تھا کہ بادشاہ دعوت دیتا، مگر آپ ٹھکرا دیتے، نواب مدعو کرتا، مگر آپ تشریف نہ لے جاتے ــــــــ

آہ اب یہ خودداری کہاں باقی رہی؟ اب تو حرص و آز نے دنیا کا کتا بنا دیا، بعض پیرزادوں کو جب پائیں گے تو کسی بااثر اور رئیس کے گھر ہی پر، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

شاہ فخر الدین دھلوی

حضرت شاہ فخر الدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بڑے پایہ کے عالم اور بزرگ گذرے ہیں، ان کے اخلاق کے متعلق لکھا ہے کہ ہر چھوٹے بڑے سے انتہائی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ کسی کو مصیبت میں گرفتار دیکھتے تو تڑپ اٹھتے، اور اس وقت تک اطمینان کی سانس نہ لیتے جب تک اس کی حسب استطاعت امداد نہ کر دیتے، ان کا ایک واقعہ بڑا عبرت انگیز اور سبق آموز ہے، لکھا ہے:۔

"ایک مرتبہ حج کے ارادے سے نکلے، جب جہاز میں سوار ہونے لگے ایک بڑھیا نے بڑھ کر سوال کیا اور عرض کیا مجھے لڑکی کی شادی کرنی ہے اور میرا حال یہ ہے کہ فاقہ کرتی ہوں کس طرح یہ کام انجام دوں شاہ صاحب نے یہ سنتے ہی جہاز سے اپنا سامان اتار لیا اور جو کچھ زادِ راہ تھا اس بڑھیا کے حوالہ کر دیا اور خود وطن واپس آگئے"

(تاریخ مشائخ چشت ص۴۸۳)

اسے کہتے ہیں انسانوں سے سچی ہمدردی اور مخلوق خدا پر شفقت و محبت، ہے کوئی پیر اور پیرزادہ؟ جو اس ایثار کے لئے اپنے کو تیار پاتا ہو؟

اب ان لوگوں کے دل سخت ہو گئے، دل بھیڑیا جیسا اور زبان شیریں، اوپر سے زرق برق، اور باطن سے کثیف اور گندہ، ظاہر سے باطن کو کوئی واسطہ نہیں، میری باتوں کا یقین نہ ہو تو ایک خفیہ کمیٹی کے ذریعہ ان کی پرائیوٹ زندگی کی رپورٹ تیار کروائی جائے ——— یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سب کے سب ایسے ہی ہیں، یہ سمجھنا غلط ہو گا، کچھ خدا کے بندے ضرور ہیں مگر بہت کم، بلکہ برائے نام گنے چنے۔

لوگوں کی غمی وخوشی میں شرکت

انہی شاہ فخرالدین صاحبؒ کے متعلق لکھا ہے:-

"مصیبت میں ہر شخص کی دست گیری کے لئے تیار رہتے، لوگوں کی خوشی اور غم میں شرکت فرماتے، اگر کسی غریب کے یہاں کوئی تقریب یا غمی ہوتی تو کئی کئی بار تشریف لے جاتے، اور اپنے مرید و معتقدین کو ہدایت فرماتے کہ وہ وہاں ضرور جائیں کہ اس کی دل دہی ہو"

(تاریخ مشائخ چشت ص۴۸۵)

خاکروب کی خدمت

اسی سلسلہ کا ایک واقعہ ہے کہ ان کا خاکروب کئی دن نہ آیا، بہت متفکر ہوئے، پوچھنے پر معلوم ہوا بیمار ہے فوراً دیکھنے تشریف لے گئے، محبت سے حالات پوچھے اور ایک حکیم صاحب کو اس کے علاج کے لئے متعین فرما دیا اور علاج کے لئے روپیہ دے کر فرمایا:-

"میاں پیر محمد! تم جو دو روز نہیں آئے، اور فقیر سے اس زمانے میں پرسش احوال میں تاخیر ہوئی معاف فرما دو" (ایضاً ص۴۸۵)

ایمان داری سے یہ بتایا جائے، اب یہ اخلاق واعمال اس دور کے

پیر اور پیرزادوں میں باقی رہا؟ اب بھی کوئی پیرزادہ کسی غریب کی مصیبت میں حالت دریافت کرنے اس کے گھر جائے گا؟ اپنا خیال تو یہ ہے کہ یہ بات آج کل غیر ممکن ہے، ہاں کوئی وکیل صاحب کوئی نواب صاحب یا کوئی وزیر صاحب بیمار پڑیں تو بلاشبہ تشریف لے جائیں گے، غریبوں کو جس طرح دنیا دار ظالم حکام اور وزراء حقیر سمجھتے ہیں۔ ہمارے پیر اور پیرزادوں کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ بہتر نہیں، جن لوگوں کو پیر کی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ میری باتوں کی تائید کریں گے۔

بادشاہِ وقت کو خطاب

شاہ فخر الدینؒ نے ملک میں ابتری پھیلتے ہوئے دیکھا تو نہ رہا گیا، ایک دن بادشاہ سے صاف صاف کہا:۔

"سلطان وقت جب تک بذات خود امور سلطنت کی طرف متوجہ نہ ہوگا اور محنت و مشقت اختیار نہ کرے گا، حالات کبھی ٹھیک نہ ہوسکیں گے"

(تاریخ مشائخ چشت ص۴۹۵)

اور پھر انھوں نے بادشاہ کو بے پروائی کے نتائج سے آگاہ کیا، کہ ملک کا کیا حشر ہوگا، ہمارے اسلاف تبلیغ اور اصلاح کا حق ادا کر گئے، کہیں سے کوئی ایسی کمزوری اختیار نہ کی جو قوم و ملک کے لئے مضر ہو۔

جاگیر قبول کرنے سے انکار

شاہ صاحب نے بادشاہ اور امراء وقت سے کوئی جاگیر قبول نہ کی، بلکہ ان کو ڈانٹ پلاتے رہے، لکھا ہے۔

"ہر چند حضرت ظل سبحانی اور ان کے امراء نے جو آپ کے مرید و معتقد تھے

دیہات قبول کرنے کی درخواست کی لیکن قبول نہ کی، بلکہ فرمایا کہ اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسی شہر میں رہیں تو اس طرح کی بات پھر زبان پر نہ آئے۔" (تاریخ مشائخ چشت ص۱۵۰)

بتایا جائے یہ عزت نفس اب ہمارے زمانہ کے پیر اور پیرزادوں میں ہے؟ پھر جو کچھ ہمارے پہلے زمانہ کے بزرگوں کو حاصل تھے، ان کو کیوں کر نصیب ہوں گے، اب خدا پر بھروسہ نہ کسی پیشہ ور پیر، پیرزادہ کو رہا اور نہ کسی درویش کو اب تو قناعت کا مسئلہ فراموش کر دیا گیا، رات دن ھل من مزید کا نعرہ ہے، مریدوں کو لوٹنے کے لئے رات دن دورے کئے جاتے ہیں، چوں کہ ناجائز پیسوں سے گوشت پوست نیا رہتا ہے، اس لئے آج جتنی برائی مسلمانوں کے ان صنم خانوں میں ہے، شاید ہی کہیں ہو، اور دین کے احکام سے جو چڑھ ان کی عورتوں اور بچوں کو ہے کسی معمولی مسلمان کو بھی نہیں، اللہ تعالیٰ ان کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

مسئلہ سماع کی حقیقت

لکھا ہے کہ ایک دفعہ سلطان المشائخ کے عرس کے موقع پر مولانا شاہ فخرالدین صاحبؒ کے ایک دو مرید اور صوفی یار محمد طوائفوں کا ناچ دیکھنے لگے، آپ نے کسی طرح دیکھ لیا تو بہت خفا ہوئے اور۔

"اپنے دست مبارک کی انگلیاں ان کے گریبانوں میں ڈال کر ان کو کھینچا اور فرمایا ہمارے بزرگوں نے بڑا خون جگر پی کر قوالوں کے سماع کو درجہ اباحت تک پہنچایا ہے اور تم ہو کہ عورتوں کا رقص دیکھتے ہو اور ان کا گانا سنتے ہو۔" (ایضاً ص۵۱۱)

اب تو ہمارے زمانہ کے کچھ پیروں نے سماع اور قوالی کو واجب قرار دے لیا ہے، جب تک عرس میں قوالی نہ ہو، مرنے والے کی روح

خوش ہی نہیں ہوسکتی، اور اب بھی کچھ پیروں کے مریدین قوالی سنتے عورتوں کے گانے ناچ کو بھی معیوب نہیں سمجھتے، بلکہ وہ کہتے ہیں یہاں بھی خدا کی یاد قلب کو گرما دیا کرتی ہے۔ ع چوں کفر از کعبہ خیزد کجا ماند مسلمانی!

ایک بزرگ کا نظام الاوقات

خواجہ محمد عاقل جو سلسلہ چشتیہ کے ایک بزرگ ہیں، ان کا نظام الاوقات ملاحظہ فرمائیں:۔

"مغرب کی نماز با جماعت ادا کرنے کے بعد وہ ذکر و شغل میں مصروف ہو جاتے تھے پھر کھانا کھا کر عشاء کی نماز با جماعت پڑھتے، اس کے بعد مریدوں کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو جاتے تھے، آدھی رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا، تہجد کی نماز پڑھ کر ذکر جہر کرتے تھے، قرآن پاک کی تلاوت فرماتے تھے، طلبہ کو درس شام کے وقت دیتے تھے ڈیڑھ پہر دن باقی ہوتا تھا کہ ان کا حلقہ درس شروع ہو جاتا تھا۔" (تاریخ مشائخ چشت ص۵۵۵)

اندازہ لگایا جائے کہ ہمارے بزرگان دین اپنے اوقات کو کتنے اچھے کاموں میں صرف کرتے تھے اور کتنی محنت کرتے تھے، اب یہ چیزیں عنقا ہوتی جا رہی ہیں، ضرورت ہے پھر انہی پرانے طریقوں کو دہرایا جائے۔

کافروں کو کیوں مسلط کیا گیا

حضرت شاہ محمد سلیمان تونسویؒ بھی سلسلہ چشتیہ کے ایک نامی گرامی بزرگ گزرے ہیں، ان کی زندگی دین کی اشاعت اور سنت نبوی کی ترویج میں گذری، احکام دین کے عاشق تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کے سارے مصائب اور درد دکھ کی وجہ دین سے دوری ہے، فرماتے تھے:۔

"مسلمانوں نے اچھے اعمال چھوڑ دیئے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے کافروں

کو ان پر مسلط کردیا ہے" (تاریخ مشائخ چشت ص۶۹۰)
کتنی اچھی اور صحیح بات فرماتے تھے، اب یہ احساس کہاں رہا، اب ہر ایک دوسرے کو الزام لگاتا ہے اور سیاسی وجہیں پیش کر کے اپنے مریدوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے، حالانکہ صحیح وجہ وہی ہے جو شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے۔

بایزید بسطامی کی انکساری

شاہ سلیمان تونسوی فرمایا کرتے تھے :۔

"حضرت بایزید بسطامی کی سی انکساری پیدا کرنی چاہئے، ایک مرتبہ بارش کی کمی ہوئی، نماز استسقاء کے باوجود بارانِ رحمت نازل نہیں ہوئی تو لوگوں نے کہا کہ بُرے لوگوں کی شامت اعمال سے یہ ہوا ہے، حضرت بایزید بسطامی نے جب یہ سنا تو فوراً شہر سے نکل کھڑے ہوئے کہ سب سے بڑا تو میں ہی ہوں"
(تاریخ مشائخ چشت ص۶۳۲)

اب یہ انکساری ہمارے پیشہ ور پیرادر پیرزادوں میں باقی رہی؟ اب وہ اپنی خانقاہ میں بیٹھ کر دوسروں کی غیبت کرتے رہتے ہیں اور سارا قصور دوسروں کے سر ڈالتے ہیں، اپنے کو پاک دامن اور منزہ عن الخطا سمجھتے ہیں، حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ خود جتنے بُرے ہوتے ہیں کہ الامان الحفیظ، کاش یہ اپنے اعمال واخلاق کا جائزہ لیتے، مگر سب ایسے نہیں ہوتے۔

توحید کا پھول

حضرت شاہ صاحب نے یہ بات بڑی درست فرمائی :۔

"توحید کا پھول اس زمین میں نہیں اگتا جہاں شرک، حسد اور ریا کے کانٹے موجود ہوں" (تاریخ مشائخ چشت ص۶۳۲)

انصاف سے بتایا جائے آج بہت کم پیر ہیں جو ان عیوب سے پاک ہیں بلکہ ریا، اور حسد ان کی گھٹی میں ہے، دوسروں کی عزت و شہرت ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی، دکھاوے کے لئے نہ معلوم کتنی ناجائز باتیں کرگزرتے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ کل ہمیں بھی مرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہونا ہے۔

موجودہ زمانہ کے ولی کون

یہ بزرگ زمانہ کے حالات سے بڑے تنگ دل رہتے تھے، فرماتے ہیں:-

"اس زمانہ میں جو لوگ پنج وقتہ نماز با جماعت پڑھ لیا کرتے ہیں، وہ ولی ہیں کہ اس زمانہ میں بے دینی بہت ہے"

مطلب یہ تھا کہ یہ بھی غنیمت ہے، ورنہ کوئی پابندی سے با جماعت نماز پڑھنے کے لئے بھی تیار نہیں، آج خود سیکڑوں ایسے لوگ ہیں، جو نماز سے کوسوں دور ہیں، صرف مرید آبادمیں، با دل ناخواستہ پڑھ لیا کرتے ہیں تاکہ مریدین کی جماعت میں وقار کم نہ ہونے پائے، اور لوگ بزرگ اور خدا رسیدہ سمجھنے پر مجبور رہوں۔

غلط عذر کا سہارا نفس کی کمزوری ہے

جو لوگ احکام دین سے روگردانی کرتے اور غلط قسم کا عذر پیش کرتے شاہ سلیمان تونسوی ان کو بڑی ملامت فرماتے، چنانچہ کچھ لوگوں نے روزہ کے لئے خشکی کا عذر پیش کیا تو فرمایا:-

"دنیا دار رمضان المبارک کے روزے نہیں رکھتے، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں خشکی ہوتی ہے، یہ بات نفس کی گمراہی اور شیطان کے غلبہ کی بنا پر ہے"

(تاریخ مشائخ چشت ص ۶۳۶)

عملیات سے پرہیز کی نصیحت

اسی طرح آپ نے ان لوگوں کی غلطی کو آشکارا کیا جو عملیات میں غلو پیدا کر لیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں :-

"سالک کو چاہئے کہ عملیات میں وقت کو ضائع نہ کرے، ایسے مشغلے راہِ فقر کے ڈاکو اور رکاوٹیں ہیں، اصل مقصود خدا کا یاد کرنا ہے.... ذکر جہر یہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ سب اوراد و وظائف سے بہتر ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے افضل ذکر لا الٰہ الا اللّٰہ ہے"

(ایضاً ص ۶۳۷)

آپ اندازہ لگائیں شاہ صاحب کو سنت نبیؐ سے کیسا عشق تھا، کوئی کام جو سنت کے خلاف ہوتا دیکھا اس پر خاموش نہ رہ سکے، اپنا فریضہ ادا کرتے چلے گئے، تاویل سے کہیں بھی کام نہیں لیا، سیدھے سادے دین کو پیچیدہ بنانے کی کبھی بھی سعی نہیں فرمائی، اسی کا نام محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

پیر کے بجائے بھروسہ اللہ تعالیٰ پر

ایک دفعہ فرمایا :-

"تم اپنے پیر سے جس قدر امداد چاہتے ہو، اور کائنات کے کاموں میں اس کا جس قدر دخل خیال کرتے ہو، یہ سب باتیں اس کے احاطہ

اختیار سے باہر ہیں، اللہ پر صحیح بھروسہ رکھو، سوائے اس کے کسی سے التجا نہ کرو، اسی سے عرض مدعا کرو، اور اسی پر اعتماد رکھو۔"

(تاریخ مشائخ چشت ص۱۳۸)

آہ اب یہ صاف گوئی عام پیروں میں کہاں باقی رہی؟ اب تو کچھ پیر یہ سمجھانے کی سعی کرتے ہیں کہ جو کچھ کر سکتے ہیں ہم یا ہمارے سلسلہ کے بزرگان دین ہی کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے حکومت کی باگ ڈور انہی ولیوں کے ہاتھوں میں دے رکھی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ پیروں کی قبریں پرستش گاہ بن گئیں، ان کی پوجا ہونے لگی، پھول چڑھنے لگے، چادروں سے ڈھکی جانے لگیں، اور حد یہ ہے کہ قبر کو پیرا ور پیر زادے سجدہ کروانے لگے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

علماء کو تنبیہ

شاہ محمد سلیمان ؒ نے علماء کو بھی تنبیہ کی اور فرمایا:-

"علماء کی گمراہی خود انہی تک محدود نہیں رہتی، عوام بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں، ایک عامی کی گمراہی خود اسی تک رہتی ہے، لیکن ایک عالم کی بے راہ روی سے عوام بھی متاثر ہو جاتے ہیں، علماء نہ تو جنت میں تنہا جاتے ہیں نہ دوزخ میں، دونوں جگہ کثیر جماعت ان کے ساتھ ہوتی ہے، لہذا علماء کو چاہیئے کہ علم پر عمل کریں۔"

(ایضاً ص۱۳۹)

اب اخلاص کے ساتھ یہ صاف گوئی عنقا ہوتی جا رہی ہے اگر کوئی تنقید کرتا ہے بھی تو علماء کی صرف تذلیل و توہین کے ارادے سے، اخلاص مفقود ہوتا ہے۔

❋ ❋ ❋

علم بغیر عمل

ایک جگہ شاہ صاحب فرماتے ہیں :۔
"علم بغیر عمل، اور عمل بغیر صحیح عقیدۂ اہل سنت و جماعت، کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا" (تاریخ مشائخ چشت ص۲۴۴)
جو بات فرمائی اس کے صحیح ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے ؟

زمانہ کا فرق

ایک دفعہ آپ نے فرمایا تھا :۔
"پہلے زمانہ میں قاضی صاحبِ نسبت ہوتے تھے، اب رشوت خور ہیں"
پھر رشوت خوری کی مذمت فرماتے ہیں :۔
"جو کوئی حرام کھاتا ہے، اس کا رزق تنگ ہو جاتا ہے، اور وہ عاجز ہو جاتا ہے، چنانچہ دیکھتے نہیں کہ چور (جو حرام مال کھاتا ہے، ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتا ہے" (ایضاً ص۲۴۲)
اب ایسی صاف گوئی کہاں باقی رہی ؟ برائیوں کا رات دن ارتکاب ہوتا ہے، لوگ دیکھتے ہیں، مگر اکثر لوگوں کی زبان تک نہیں ہلتی، وہ بڑی آسانی سے برائیوں کو برداشت کر لیتے ہیں، اور اپنی ذمہ داری بھول جاتے ہیں ۔

شریعت کی پابندی

شریعت کے معاملہ میں آپ بہت سخت گیر تھے، فرمایا کرتے تھے :۔
"جو شخص چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کا محبوب ہو جائے، اسے چاہیے کہ ظاہر اور باطن میں شریعت کی متابعت کرے، چنانچہ قرآن پاک میں فرمایا گیا

ہے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ؀"

(تاریخ مشائخ چشت ص۳۴۳)

ایک دفعہ فرمانے لگے :۔

"کہ اگر اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بالفرض اس وقت موجود ہوتے، تو اس زمانہ کے لوگوں کو کافر کہتے اس لئے کہ انھوں نے شریعت کا اتباع چھوڑ دیا ہے، اور مخلوق ان کو دیوانہ کہتی، اس لئے کہ ان کے افعال و اخلاق شریعت کے مطابق ہوتے؀" (ایضاً ص۳۴۴)

آپ نے موجودہ دور کے لوگوں کے اعمال واخلاق کا معیار جس طرح واضح فرمایا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں، صحابہ کرام رضؓ کا نقش قدم اب کہاں باقی رہا؟ دین کے معاملہ میں سستی عام بات ہے، کتاب و سنت کی پیروی جیسی چاہئے وہ لگ بھگ ناپید ہو رہی ہے۔ ؎

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

سنت سے دوری کا انجام

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکثر یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ :۔

"ایک مرتبہ جب سکھوں نے ملتان کا محاصرہ کیا، تو ایک بزرگ حضور رسول مقبول صلعم کی خدمت میں امداد کے طالب ہوئے، خواب میں رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا "میری امت نے میری پیروی چھوڑ رکھی ہے؀"

(ایضاً ص۳۴۵)

کاش آج کے مسلمان سوچتے کہ سنت کی پیروی کتنی اہم چیز ہے، اور اتباع سنت کے ترک سے قوم اور ملک کو کس قدر نقصان ہے؟ افسوس یہ احساس بھی باقی نہ رہا۔

ظلم کا انجام

لکھا ہے کہ حکومت کے باب میں ان کا خیال حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے اس خیال کے مطابق تھا:۔

"کہ حکومت کفر کے ساتھ چل سکتی ہے، لیکن ظلم و نا انصافی کے ساتھ نہیں" (تاریخ مشائخ چشت ص۱۴۹)

یہ بات اپنی جگہ بہت درست ہے، کفر وفسق حکمراں کی ذات تک محدود رہتا ہے مگر ظلم وجور اور نا انصافی سے ملک تباہ و برباد ہو جاتا ہے پبلک اپنے حقوق سے محروم ہو جاتی ہے، کمزور اور نہتے جور و ظلم کا شکار بنائے جاتے ہیں، کھلی بات ہے ایسی حالت میں حکومت کیونکر چل سکتی ہے۔

انگریزوں نے ظلم اور نا انصافی کی تو باوجود اپنی زبردست طاقت کے ہندوستان سے گئے، کل اگر آزاد بھارت اور پاکستان کے حکمراں بھی ظلم وجور اور نا انصافی پر تلے رہے تو یہ بھی حکومت کی گدی سے محروم ہو کر رہیں گے۔

ظالم حکمراں کا تسلط بداعمالی کا نتیجہ

مگر ساتھ ہی حضرت شاہ سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"ظالم حکمراں کا مسلط ہونا، لوگوں کی بداعمالی کی دلیل ہے" اعمالکم عمالکم" پر ان کا اعتقاد تھا، اور اپنی مجلسوں میں اسی پر اصرار کیا کرتے تھے، کہا کرتے تھے کہ جب خدائے تعالیٰ کسی ملک کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو ظالم حاکموں کے قبضہ میں دے دیتا ہے، یہ شعر

ان کے وردزبان رہتے تھے۔

چوخواہد کہ ویران کند عالمے ❊ نہد ملک در پنجہ ظالمے

بقومے کہ نیکی پسند د خدائے ❊ دہد خسرو عادل و نیک رائے

(رب العزت جب کسی ملک کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے تو اس پر ظالم کو تسلط دے دیتا ہے، اور جو قوم نیک خو اور حق پرست ہوتی ہے اس قوم کا حکمراں رب العزت عادل و نیک شخص کو بناتا ہے)

بلا شبہ سارے مصائب اور پریشانیاں اعمال و اخلاق کی پستی اور کتاب و سنت سے بے پرواہی کا نتیجہ ہیں، کاش مسلمان اس راز کو سمجھتے اور اس پر یقین کر کے عمل کی درستی کی فکر میں لگ جاتے۔

اعمال بد کا انجام

شاہ سلیمان صاحبؒ نے اس پر بڑا زور دیا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں

"ہر بلا اور مصیبت جو انسانوں پر نازل ہوتی ہے ان کے اعمال ناشائستہ کا نتیجہ ہوتی ہے، چنانچہ حدیث شریف آیا ہے "اعمالکم عمالکم" یعنی تمہارے کردار تمہارے حاکم ہیں، اگر تمہارے اعمال نیک ہوں گے، تو تمہارے حاکم بھی اہل اسلام میں سے اور عادل ہوں گے، اور اگر اس کے برعکس ہوں گے تو حاکم بھی کافر اور جابر ہوں گے" (تاریخ مشائخ چشت ۶۲۹)

ضرورت ہے کہ مصیبت زدہ اور پریشان حال لوگ اس اعتقاد کو دل میں جگہ دیں، اور اپنی اصلاح اپنے سے شروع کر دیں، دوسروں کو گالیاں دینے سے زیادہ مفید یہی شکل ہوگی کسی جماعت کو کوسنا مصائب کے پہاڑ کو نہیں ٹال سکتا، جو لوگ حکومت سے انصاف کی درخواست کرتے ہیں وہ اپنی جگہ درست کرتے ہیں کہ یہ ان کا شہری حق ہے، مگر ساتھ ہی بنیادی اصلاح کی طرف توجہ دینے کی زیادہ ضرورت ہے۔

غیر مسلموں سے خوشگوار تعلق

شاہ سلیمان صاحب تونسوی رحمۃ اللہ علیہ غیر قوموں سے خواہ مخواہ الجھنے کو پسند نہیں فرماتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ ہندوؤں کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھے جائیں، چنانچہ لکھا ہے کہ آپ اپنے مریدوں کو ہدایت فرماتے :۔

"اپنے مذہب، اپنے تمدن، اور اپنی شریعت پر قائم رہو، لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسرے مذاہب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، اپنے تعلقات میں کبھی بدمزگی پیدا نہ ہونے دو...... سالک کو چاہئے کہ کسی کو رنج نہ پہنچائے، بلکہ ساری مخلوق سے صلح رکھے" (تاریخ مشائخ چشت ص۱۵)

جو لوگ مسلمان عالمانِ دین کو تنگ نظر کہتے ہیں، یا دیندار طبقہ کو غیر مذاہب والوں کا دشمن سمجھتے ہیں وہ آنکھیں کھولیں اور اس "ہدایت نامہ" کو بغور پڑھیں اور پھر فیصلہ کریں۔

دنیا کو یقین کرنا چاہئے کہ اسلام دوسروں کا دشمن ہرگز نہیں ہے، ہاں وہ گمراہ اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو رشد و ہدایت کی البتہ تاکید کرتا ہے اور وہ بھی نرمی سے سختی سے نہیں، جبر و تشدد اس مذہب میں خواہ مخواہ قطعاً جائز نہیں۔

اہل دنیا کا حال

شاہ سلیمان تونسوی فرمایا کرتے تھے :۔

"اہل دنیا "سفید چشم" اور بے وفا ہوتے ہیں، جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے، تو پیر و فقیر کی تلاش میں پھرتے ہیں اور آہ و زاری کرتے ہیں، لیکن ویسے بلا مطلب وہ کبھی فقراء کی طرف متوجہ نہیں ہوتے"

⁂ ⁂ ⁂

شیخ سعدی کا قصہ

اس سلسلہ میں آپ یہ حکایت بیان فرماتے تھے :۔

"ایک مرتبہ شیخ سعدیؒ حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ سے ملاقات کے لئے گئے، شیخ عطارؒ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا ـــــــ تو امیروں سے دوستی رکھتا ہے۔ میں تجھ سے نہیں ملتا، شیخ سعدی کو سخت صدمہ ہوا، چھ ماہ تک وہاں رہے، پھر حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے بلا کر حاضری کا شرف بخشا" (تاریخ مشائخ چشت ص۶۵۱)

ہمارے اس زمانہ کے خاندانی پیرزادے اور پیر صاحبان نیز علماء کرام اس واقعہ کو پڑھیں اور بصیرت حاصل کریں، جن کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی غریب مولوی ان سے ملنے چلا گیا، تو کبر و نخوت سے ان کی پیشانی پر بل پڑ گیا، اس سے اس طرح ملے گویا کوئی اجنبی اچھوت آگیا، اور اگر کوئی امیر یا امیرزادہ آگیا، تو ان کی پیشانی تک جھک گئی، اٹھ کر ہنستے ہوئے بغل گیر ہوئے۔ اور تپاک سے ان کو جگہ دی، اور پھر تھوڑی دیر کے لئے دل و دماغ سب اس دولت مند آدمی کے آگے جھکے رہے، اے کاش اس ذہنی غلامی کا ہمارے پیر اور پیرزادوں کو احساس ہو۔

ایک عبرت پذیر واقعہ

اس سلسلہ میں خود شاہ تونسوی کا ایک دلچسپ واقعہ سننے کے لائق ہے، لکھا ہے کہ ایک مرتبہ نواب محمد صادق خاں نے خواجہ مہاروی کے صاحبزادوں سے جرمانہ وصول کیا، شاہ تونسویؒ کو خبر ہوئی تو بڑا صدمہ ہوا، اور نواب صاحب سے خط و کتابت بند کر دی، نواب صاحب کو اس کا احساس ہوا، تو انھوں نے کچھ لوگوں کو معافی کی درخواست

لے کر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ اتفاق سے خواجہ مہاروی کے صاحبزادے بھی موجود تھے ان کو بھی اس وفد کے ساتھ کر دیا، چنانچہ صاحبزادے نور احمد صاحب وفد کے ساتھ خواجہ تونسوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے نواب صاحب کے یہاں چلنے کی درخواست کی پہلے تو ٹالا، مگر جب صاحبزادے کا اصرار ہوا تو فرمانے لگے :۔

"صاحبزادے صاحب آپ کو اس کام کے لیئے یہاں تشریف لانا ہرگز ہرگز مناسب نہ تھا، آپ کی خاطر تو میں نواب صاحب سے ناراض ہوا تھا.... اب آپ ہی خود تشریف لائے ہیں صاحبزادہ صاحب نے جواب دیا، قبلہ کیا کریں مجبور و لاچار ہو کر آئے ہیں، ہماری گذران اس ملک میں ہے ۔ خواجہ صاحب نے فرمایا نہیں نہیں، وہ تمہارے ملک میں ہے اور اس کی گذران تمہارے ملک میں ہے، خداوند کریم کا بھی لحاظ چاہیئے، آپ کے والد صاحب قطب الاقطاب تھے، آپ خدا کے دروازہ کو چھوڑ کر اہل دنیا کے پاس التجا لے جاتے ہیں" (تاریخ مشائخ چشت ۵۵۰)

موجودہ دور کے سجادہ نشین حضرات اس واقعہ کو غور سے پڑھیں اور اگر کوئی بھولا ہوا سبق یاد آجائے تو دعائیں دیں ——— اور پھر اپنے کو پہچانیں، دولت پرستی کسی بھی پیر اور پیرزادہ کو زیب نہیں دیتی۔ ؎

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

مزار پر فسق و فجور دیکھ کر

خواجہ شاہ سلیمان تونسوی بڑی خوبیوں کے مالک تھے اور بڑی اصلاح فرمائی، ۷ صفر ۱۲۶۷ھ کو اللہ کو پیارے ہوئے، آپ کے ایک خلیفہ حافظ

محمد علی صاحبؒ کا واقعہ ہے۔

"ایک مرتبہ حیدر آباد میں حضرت شاہ یوسف کے مزار پر حاضری کا اتفاق ہوا، تو دیکھا کہ وہاں طوائفوں کا ناچ ہو رہا ہے، آپ کو اس قدر غصہ آیا کہ محفل میں پہنچ کر مشائخ کو للکارا — یہ بال تمہاری ڈاڑھی کے نہیں ہیں، بلکہ زنار کے تار ہیں، اولیاء اللہ کے مزاروں پر ایسا فسق و فجور ہوتا ہے اور تم دیکھتے ہو" (تاریخ مشائخ چشت ص۶۲۷)

دینی حمیت و غیرت اسی کا نام ہے، منکر پر خاموشی پسند نہیں فرمائی گئی بلکہ علی الاعلان دیکھنے والوں کو ڈانٹا گیا، اس حق گوئی کی اس دور میں بڑی ضرورت ہے۔ سننے میں آیا ہے یوپی کے بعض مزارات پر آج بھی یہی رسم قبیح انجام دی جاتی ہے۔ جو پیرزادے اس میں مبتلا ہیں ان کو توبہ کرنا چاہیے، اور پھر آئندہ سے پرہیز اور اجتناب کا عزم بالجزم۔

بانی مسلم یونیورسٹی
اور
ان کے رفقاء

تاریخی حقائق

مرحوم سرسید بانی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اور ان کے دوستوں کی زندگی کے بعض گوشے

علی گڈھ میگزین نے اس سال علی گڈھ نمبر نکالا، سنا تو مجھے بھی پڑھنے کا شوق ہوا، حسن اتفاق سے وہ "نمبر" میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اسے پڑھا، پڑھتے وقت کچھ خاص واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، ان پر نشان ڈالتا گیا۔ آج انہی میں سے چند واقعات مندرجہ بالا عنوان سے حاضر خدمت ہیں۔

سرسید احمد خاں، بانی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کو علمی دنیا میں جو شہرت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں، ان کے مذہبی خیالات کے متعلق لوگوں میں بلا شبہ مختلف رائیں ہیں، مگر جہاں تک قوم مسلم کا تعلق ہے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے اخلاص وللّٰہیت کے باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں۔

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک عیسائی کا حملہ اور سرسید کی بے چینی

مولانا حالی مرحوم لکھتے ہیں:-

"جب سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچی، جس کی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اس نے اسلام کے استیصال میں تسمہ لگا نہیں رکھا، اس وقت جو حال سرسید کی بے چینی اور جوش وخروش کا تھا وہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے" (علی گڈھ میگزین علی گڈھ نمبر ص۵۶)

اللہ اللہ یہ حال ہے اس مسلمان کا جس کو کہا جاتا ہے کہ بعض مصالح کی بنیاد پر انگریزی حکومت اور خود انگریزوں سے بڑا خاصا تعلق تھا، تعلقات اپنی جگہ تھے، مگر دین کے معاملہ میں دیکھ رہے ہیں کتنے بے چین ہیں اور کیسا ان میں جوش و خروش ہے، آج ان کا نام لینے والے ہر معاملہ میں ان کا بار بار حوالہ دیں گے، مگر جہاں دین کی بات ہوتی ہے وہاں ان کا سارا حسن ظن رکھا کا رکھا ہی رہ جاتا ہے اور ان میں کوئی بے چینی پیدا نہیں ہوتی ــــ مولانا حالی مرحوم ہی کا بیان ہے:-

"وہ (سرسید) جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھتے تھے، اکثر سر ولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے، اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں" (علی گڑھ میگزین ص۹۵)

اس کو بار بار پڑھئے اور سوچئے، سرسید مرحوم میں کتنی اور کیسی غیرت وحمیتِ دینی پائی جاتی تھی مگر آہ ان کے نام لیواؤں میں اب یہ غیرت وحمیت دینی کہاں نظر آتی ہے؟ جو دو چار ہیں ان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں بلکہ اب تو خود اسی یونیورسٹی کے فرزندانِ ارجمند اپنی اسی یونیورسٹی میں بیٹھ بیٹھ کر سر ولیم سے زیادہ سخت حملے کرتے رہتے ہیں اور ان کو احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ تیر کس کا دل زخمی کر رہا ہے اور کس کے کلیجہ کو چھید رہا ہے۔

سرسیّد کا دینی جذبہ

سرسید مرحوم اپنے ایک خط میں اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں:-

"ان دنوں ذرا میرے دل کو سوزش ہے ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت صلعم کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا، اور ان کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا"

(علی گڑھ میگزین ص۹۵)

یہ اس شخص کی گواہی ہے جو جدید تعلیم یافتوں کا امام ہے، کیا اس کے بعد بھی یقین نہ ہوگا کہ عیسائیوں نے مذہب اور دین کی باتوں کے بیان کرنے میں بڑی ناانصافیاں کی ہیں، بے جا تعصب سے کام لیا ہے، جن جدید تعلیم یافتوں کی دینی معلومات کا بیشتر ذخیرہ انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں ان کو سوچنا چاہیئے کہ ان کی "دینی معلومات" کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟

محبت رسول کا سرسید کے دل پر اثر

ولیم میور وغیرہ نے کتنی گندگی اچھالی ہوگی، کہ سرسید مرحوم کے قلم سے یہ جملے ٹپک پڑے:۔

"مصمم ارادہ کر لیا کہ آنحضرت صلعم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے، اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مرگیا حاضر کرو۔ ع

مارا ہمیں تمغہ شہنشاہی بس است"

(علی گڈھ میگزین ص۹۹)

اللہ اللہ یہ ہے محبت رسول، اور حمیت دین کا جذبہ، کہاں ہیں وہ لوگ جو سرسید کا نام لے کر اپنی بڑائی جتاتے ہیں اور ان کی غیرت وحمیت جواب دے گئی ہے، وہ ہر جائز ناجائز شعبہ میں تو خرچ کر سکتے ہیں مگر دین کی عزت وعظمت کی خاطر ایک پیسہ خرچ کرنا جرم سمجھتے ہیں، حد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں زبان کھولنے کی بھی ان کو جرأت نہیں ہوتی، دماغی عیاشی کے لئے سیکڑوں ناول اور ڈرامے لکھ سکتے ہیں، مگر دین کی عظمت اور اس کی سربلندی کے لئے ایک جملہ لکھنے میں بھی شرم محسوس کرتے ہیں اور سوچتے ہیں اس کا کیا معاوضہ

ملے گا۔

سرسید کے قلم سے انگریز مصنف کا جواب

سرسید مرحوم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیے گئے اعتراض کا صرف جواب ہی نہیں لکھا بلکہ اس کی کتابت وطباعت کے اخراجات کی خود ہی فکر کی، اس سلسلہ میں سید مرحوم لکھتے ہیں :۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ اس خط کے پہنچنے کے بعد میر ظہور حسین کے پاس جائیں ..... اور دونوں صاحب مل کر کسی مہاجن سے ہزار روپیہ قرض لیجئے سود اور روپیہ میں ادا کروں گا ..... ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے اور میں نے لکھا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروفِ مستی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو" (علی گڈھ میگزین ص۔)

غیرت وحمیت دینی

اس وقت سودی لین دین کی بحث چھوڑیئے، اور ایمانداری سے سید مرحوم کے بے پناہ ایمانی جذبہ اور دینی غیرت وحمیت کا اندازہ لگایئے اور دیکھئے ان کے جوش وخروش کا کیا عالم ہے اور وہ کس قدر بے چین ہیں، اور لندن میں بیٹھ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کا کیسا حق ادا کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں نہ انگریزوں کے علوم وفنون سے مرعوب ہوتے ہیں اور نہ حکومتِ وقت سے خوف زدہ۔

آہ جس یونیورسٹی کے بانی کے ایمان وعمل کا یہ حال ہے، آج اس ادارہ کے بعض فیض یافتوں کی دینی حالت قابلِ صد افسوس ہے بالخصوص جن کا تعلق کمیونزم سے ہے، دنیاوی لحاظ سے بلاشبہ یہ بہت اونچے، بلند خیال، بلند اقبال اور ہر طرح قابل مدح وستائش ہیں، مگر جہاں تک دینی غیرت وحمیت

اور ایمان وعمل کا تعلق ہے اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ بجز چند افراد کے بانیِ ادارہ کے ساتھ ان کو گرویدگی نہیں۔

کاش لوگ سوچتے کہ بانیِ ادارہ کا مقصد جہاں دنیا کے اونچے عہدے حاصل کرنا تھا، وہاں یہ بھی مقصد تھا کہ مسلمان ان اونچے عہدوں پر رہ کر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی خدمت انجام دیں اور اس دین پر جہاں زد پڑ رہی ہو، اس کا دروازہ بند کرنے کی سعی کریں۔

مسلمانوں کی تاریخ انگریزوں کے قلم سے

سرسید مرحوم میں جس طرح دینی غیرت تھی، اسی طرح آپ کو مسلمان اور مسلمانی تاریخ سے محبت تھی، چنانچہ کوئی مولف و مصنف اگر اپنی کتابوں میں مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کرتا اور آپ کو معلوم ہو جاتا تو برداشت نہیں کرتے تھے، اس سلسلہ میں آپ نے ایک مرتبہ محسن الملک کو لکھا:-

"انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے، جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو" (علی گڈھ میگزین ص۲۱)

کہاں ہیں انگریز مصنفوں کے کلمہ گو! آنکھیں کھول کر دیکھیں سید مرحوم جیسے رواداراور انگریز دوست کا کیا خیال ہے، یہ کوئی دیوبندی مولوی کا بیان نہیں بلکہ مسلم یونیورسٹی کے بانی کی تحریر ہے، علیگ بھائی بھی اسے غور سے پڑھیں، جو انگریز مصنفوں کی تاریخوں پر بغیر کافی تحقیق یقین کر لیتے ہیں، اور مسلمان محقق مصنفوں کو کوئی وقعت نہیں دیتے، اور حد یہ ہے کہ فارسی عربی اور اردو صحیح تاریخوں کا پڑھنا ان کو بارگذرتا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

مسلمان نوجوانوں پر اظہار افسوس

انگریز مصنفوں کی بے ایمانی کا راز فاش کرنے کے بعد سرسید مرحوم آگے رقمطراز ہیں :-

"ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات ازراہِ ناانصافی اور تعصب مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے، اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں۔"

(علی گڑھ میگزین ص۱۰۲)

جس خطرہ کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، افسوس آج تک اس خطرہ کا تشفی بخش انسداد نہ ہوسکا، سرسید مرحوم نے جس زہر سے مسلمان بچوں کو بچانا چاہا تھا، بعد میں چل کر اس کے ماننے والوں میں بعض کو اس کا صحیح احساس باقی نہ رہا۔

علیگ برادری نے جتنا دھیان ناول اور افسانے پر دیا، کاش یہ اس کا کوئی ادنیٰ حصہ تاریخ پر صرف کرتے، تو آج اردو میں صحیح تاریخوں کا بڑا ذخیرہ ہوتا، گو اب بھی اردو میں صحیح تاریخوں کی کمی نہیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے نظام حیدرآباد کو جس کی علم دوستی کی بدولت بہت سی عربی تاریخیں اردو میں منتقل ہو سکیں۔

ملت اسلامیہ کا غم

لندن میں رہ کر سرسید مرحوم ایک ایک چیز کو عبرت و بصیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور مسلمانوں کی حالت پر آنسو بہاتے ہیں، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :-

"مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے، یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک

اور اپنی قوم کی حمایت اور بے جا تعصب اور تنزل و ذلتِ آئندہ کے خیال سے رنج وغم زیادہ بڑھ گیا ہے ۔" (علی گڑھ میگزین ص۱)

جو اپنی قوم کو کہیں نہیں بھولتا، دوسروں کی ترقی دیکھ کر اپنی قوم کے تنزل پر آنسو بہاتا ہے، اور ان اسباب کو تلاش کرتا ہے جن کی وجہ سے قوم پائمال ہو رہی ہے ——— دنیا سن کر سکتے میں آجائے گی کہ آج ان کے نام لیواؤں کی بڑی جماعت بے حسی کی زندگی گذار رہی ہے اور غفلت کی نیند سوتی ہے، آج اس جماعت کے پیش نظر صرف اپنا ذاتی فائدہ ہے اور بس۔

یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سب کے سب ایسے ہی ہیں، بلکہ وہ باکمال اور حساس افراد بھی ہیں جو رات دن قوم کی خیر خواہی میں دل وجان سے منہمک ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کا حال

سرسید مرحوم نے مسلمانوں کی اسی حالت کا ماتم کیا ہے :۔

"افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں ہے، ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں، ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منھ میں ہاتھ دیتے ہیں ۔" (علی گڑھ میگزین ص۱)

مگر آہ کس کو بتایا جائے کہ تم جہاں جارہے ہو، وہاں کھرے سکے نہیں ملتے کھرے سکوں کی تلاش ہو تو ہمت سے کام لو، مرعوب ہونا ترک کرو، بہادر اور نڈر بنو، اور اپنے ملک و قوم کی خیر خواہی میں لگ جاؤ، نتیجہ خدا کے ہاتھ ہے تمہارا کام جدوجہد کرنا اور قوم کو راہِ راست دکھانا ہے ۔

مسلمانوں کی طرف سے مایوسی

سرسید مرحوم نے ایک مرتبہ وقار الملک کو لکھا تھا :۔

"میں قسمیہ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے مسلمانوں کی بہتری، ترقی اور درستیِ اخلاق کی جس پر میں کوشش کررہا ہوں مطلق توقع نہیں ہے مایوسی محض ہے مگر اس خیال سے کہ ہمارا فرض کوشش کئے جانا ہے کرتا ہوں، پس جس چیز کے حصول سے مایوسی ہو، اس مایوسی کے سبب سے اپنا فرض کوشش ترک نہیں ہوسکتا" (علی گڈھ میگزین ص۱)

یہ ہے اپنے فرض کا احساس، آج جدید تعلیم یافتوں کو کون بتائے کہ آپ کی ذمہ داری بھی بڑی اہم ہے، مگر آپ کو احساس نہیں، آپ بس پڑھنا اور پھر کھانا کمانا ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں، یہ محض غلط ہے، صرف مولویوں کو ہر چیز کا ذمہ دار قرار دے کر مطعون کرنا یہ ذمہ داری کا احساس نہیں ہے، آزاد ہندوستان میں دینی جذبہ لے کر آگے بڑھنے اور قومی خدمت کی بڑی گنجائش ہے۔

سرسید کو علوم عربیہ کا دھیان

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ سرسید عربی فارسی کے بالکل خلاف تھے وہ بالکل غلط ہے، اسی طرح ہمارے علیگ بھائیوں میں جن کا یہ خیال ہے کہ عربی فارسی کی کوئی اہمیت ہی نہیں وہ بھی ان کی بھول ہے، سرسید مرحوم ایک بار عماد الملک کو لکھا تھا:۔

"اسی کے ساتھ یہ تدبیر بھی چاہتا ہوں کہ علوم عربیہ اور درس کتب مذہبی جو معدوم ہوتا جاتا ہے کسی طرح قائم رہے، اگر عربی فارسی ہم میں سے معدوم ہو جائے، تو اسی کے ساتھ ہماری قومیت بھی معدوم ہو جائے گی"

(علی گڈھ میگزین ص۱)

آہ اب یہ خیال کس کو ہے؟ کہ مذہبی تعلیم اور جس زبان میں اس کا ذخیرہ ہے اس کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے اور اس سے غفلت موت کے مرادف

ہے، آج عربی داں جب تک جدید تعلیم حاصل نہ کرے اور انگریزی داں جب تک علوم مشرقیہ اور دینی معلومات حاصل نہ کرے اس کا علم ادھورا ہے، تنگ نظری دونوں ہی میں باقی رہ جاتی ہے، کاش لوگ غور کریں۔

انسانوں کا فرض

سرسید مرحوم ایک زندہ دل اور با اخلاق انسان تھے اور ان کا مطمح نظر، نیکی کرنا اور برائی دور کرنا تھا، خود فرماتے ہیں :-

"ہم کو خدا نے دنیا میں اس لئے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں، برا کرنے والے کی برائی سے ہم کو کیا کام۔ ہم کو اپنا دل، اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیئے، بدوں یا بدطینتوں پر افسوس کرنا چاہیئے، مگر اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے کو بھی ویسا ہی کرنا ہے، جو لوگ برا کہنے والے ہیں، ان کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہیئے، اگر وہ برائی ہم میں ہے تو اس کے دور کرنے میں کوشش لازم ہے۔" (علی گڑھ میگزین ص۱۰)

یہ ہیں ہمارے گذرے ہوئے بزرگوں کے اخلاق و اعمال، برائی ان کے وہم میں بھی نہیں آتی تھی، بس نیکی ہی نیکی ان کے مدنظر رہتی، برائی کا جواب بھی نیکی ہی سے دیا کرتے، تاکہ برائی دور ہو، اب یہ اخلاق و اعمال اور صبر و تحمل ہم لوگوں میں کہاں باقی رہا؟ جو لوگ آپ سے روحانی وابستگی رکھتے ہیں ان کو سوچنا چاہیئے کہ مسلمانوں کے اخلاق و اعمال کیوں کر سدھر سکتے ہیں۔

اخلاص کی قیمت

بانیٔ علی گڑھ کا دل میل کچیل اور کینہ کپٹ سے پاک تھا، ایک دفعہ محسن الملک کو ان کے خط کے جواب میں لکھا :-

"مولوی س۔خ کو اب بھی میں اپنے بھائی سے کم نہیں سمجھتا، مگر جو ملال کہ میرے دل میں ہوا، وہ اب تک کم نہیں ہوا، پھوٹ جاوے وہ آنکھ، جو کسی کو دیکھے اس نگاہ سے، جو اس کے دل میں نہیں ہے، گل جاوے وہ زبان، جو وہ کہے جو اس کے دل میں نہیں ہے، اور ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ، جو وہ لکھے جو اس کے دل میں نہیں ہے۔" (علی گڈھ میگزین ص۱۰)

دیکھ رہے ہیں منافقت سے بےزاری کا اعلان، اور اخلاص عمل کا اظہار، اب تو اس نیکی کو لوگ بے وقوفی کہتے ہیں، وہ بڑا نادان سمجھا جاتا ہے جس کا عمل دل کے مطابق ہو، اب کمال یہ ہے کہ دل میں کٹاری ہو، اور زبان شیریں، دل میں برائی ہو، اور زبان پر تعریف، علیگ برادری اپنے بانی کی اس تحریر کو بار بار پڑھے اور سوچے کہ کیا ہمارا طرز عمل یہی ہے، جس کی بانیِ یونیورسٹی تعلیم دے گئے ہیں۔

مسلمانوں سے ہمدردی

سرسید مرحوم کو اپنی قوم سے بڑی ہمدردی تھی، اور قوم و ملت کا غم اتنا غالب تھا کہ وہ اپنا سارا غم فراموش کر گئے تھے، ایک موقع سے انھوں نے ایک انگریز مسٹر شکسپیر کی مدد کی تھی، اس مدد کے سلسلہ میں ان کو جاگیر دینا چاہا، مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، خود لکھتے ہیں:۔

"جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شکسپیر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپے سے زیادہ کی مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا، تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں ہوگا

کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو، اور میں ان کی جائداد سے لطف اندوز ہوں،
میں نے اس کے لینے سے انکار کیا۔ (علی گڈھ میگزین ص۱۱)

اللہ اللہ یہ تھا دردِ دل قوم و ملت کے باب میں، ایک لاکھ کی جاگیر پر لات مار دی، اور اپنی عزت و حمیت کی لاج رکھ لی، سوچا جائے اب ایسے لوگ کہاں باقی رہے، اب تو کچھ لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی کی گردن مروڑ کر ہم اس کی جائداد پر قابض ہو جائیں۔

کہاں ہیں وہ بااثر حضرات، جو رات دن دوسروں کے برباد کرنے کی فکر میں رہتے ہیں اور اپنی ادنیٰ کمائی کی بڑی قیمت مانگتے ہیں، چاہے دوسرے کے بال بچوں کی لاشوں کو روند کر ہی کیوں نہ حاصل ہو، اس واقعہ سے سبق حاصل کریں۔

ملک سے ہجرت کا خیال

۱۸۵۷ء میں بہت سے لوگ بد دل ہو کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے حالات دیکھ کر سرسید مرحوم کو بھی یہی خیال آیا کہ ہندوستان چھوڑ دیں مگر حالات کا جب انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا تو سمجھ میں آیا کہ میرا خیال غلط ہے، چنانچہ خود لکھتے ہیں :-

"یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے، کہ اپنی قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہئے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنا قومی فرض ہے، میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔" (علی گڈھ میگزین ص۱۱)

اسے کہتے ہیں اپنی قوم سے سچی ہمدردی، اپنا آرام دیکھ کر پوری قوم کو بھول جانا کسی قومی لیڈر کا کام نہیں۔

مگر آہ اسی بوڑھے سپاہی کی یونیورسٹی کے وہ بلند اقبال فرزندان ارجمند، جو کل تک ہندوستان میں تھے، مگر جونہی پاکستان میں ان کو اطمینان بخش جگہ ملی، یہاں سے بھاگ گئے، یہ بھی نہ سوچا کہ اس یونیورسٹی کا کیا ہوگا، کل تک جن غریب عوام مسلمان کا نام لے کر ہم نے لیڈری اور برتری حاصل کی ہے اس کا کیا حشر ہوگا، یہی نہیں بلکہ جب موقع آیا تو بے دردی سے مسلمانوں کو آگ و خون کی بارش میں ڈھکیل دیا اور خود ہوائی جہاز پر بیٹھ کر اڑ گئے، خدا جزائے خیر عطا کرے ان لیڈران عظام اور علماء کرام کو، جنہوں نے جان کی بازی لگا کر اس دہکتے جہنم میں مسلمانوں کی جان بچائی، اور ساری مصیبتوں سے دوچار ہو کر اب تک یہاں ڈٹے ہوئے ہیں، اور قوم و ملک کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

سرسید کے فرزند کا حال

مسٹر محمود جو سرسید کے فرزند ارجمند ہیں، بہت ذہین، حاضر الذہن اور دور اندیش تھے، چنانچہ جسٹس محمود کا فیصلہ مدلل و مکمل ہونے میں جو شہرت رکھتا ہے، وہ کسی باخبر سے پوشیدہ نہیں، ان کے متعلق بیان کیا ہے کہ ان کے دل میں خدا کا خوف بہت تھا، ملازمت سے سبکدوش ہو کر جب پنشن پانے لگے، تو قرآن پاک اپنے خاص انداز میں پڑھتے اور روتے جاتے تھے، شیخ ممتاز حسین نے لکھا ہے :-

"گرمی کے موسم میں ایک صبح کو یہ دیکھا گیا کہ سلندر باغ لکھنؤ کے سبزہ زار پر پلتھی مار کر محمود صاحب بیٹھے زبانی کچھ پڑھ رہے ہیں، ان کے یہاں رہنے والے ایک صاحب سے یہ معلوم ہوا کہ ان کو قرآن شریف کا ایک پارہ زبانی یاد ہے، کچھ دنوں سے اکثر صبح کو تنہائی میں رب العالمین کا دھیان دل میں رکھ کر اسے پڑھتے ہیں، اور اس کے بعد چند اشعار دنیا کی بے ثباتی کے جو

انھیں یاد ہیں پڑھ کر رد تے ہیں ـــــ میں صبح کو ٹہلنے نکلا تھا دور سے میں نے خود یہ سماں ایک بار دیکھا کہ محمود صاحب آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔" (علی گڑھ میگزین ص۲۲۵)

یہ ایک انگریزی داں کا صحیح واقعہ ہے، جو اپنے علم وعقل، اور فہم وتدبر میں مسلّم ہے، غور کیجئے اللہ کے بندہ پر اپنے آقا اور مالک کا کیسا خوف تھا، یہ کوئی ملّا نہیں تھے، بلکہ لندن کے پڑھے ہوئے اور اپنے وقت میں بڑی شہرت وعزت کے مالک، آہ اب تو ہمارے انگریزی دانوں کو قرآن سے لگاؤ ہی نہیں باقی رہا، اب تو اکثریت انہی لوگوں کی ہے جنہوں نے کبھی قرآن پاک پڑھا ہی نہیں ہے۔ بس سنتے چلے آرہے ہیں، خشیت الٰہی دلوں میں اب کہاں پیدا ہوتی ہے؟ اب تو جو لوگ اپنے کو مہذب ومتمدن کہتے ہیں، ان کی دنیا ہی اور ہے، پھوس بوڑھے ہونے پر بھی موت کی تیاری نہیں کرتے، کہ قیامت میں ذلت ورسوائی سے رستگاری ہوسکے۔ اس باب میں عام عالموں کا حال بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں۔

ناموس اسلام کا محافظ

مولوی بشیر الدین (اٹاوہ) پہلے سرسید کے مخالفوں میں تھے، ان کا بیان ہے کہ "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس"، کے چوتھے اجتماع میں میں نے ایک تجویز پیش کی، اور اس پر ایک ولولہ انگیز تقریر کی، تجویز یہ تھی کہ ڈیلی فورس کی "تاریخ ہندوستان"، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو مسخ کر کے اہانت آمیز انداز میں پیش کیا گیا ہے، نصاب سے حکومت خارج کردے۔

مولوی بشیر الدین صاحب فرماتے ہیں کہ اس تجویز پر:۔

"سرسید بولنے کھڑے ہوئے تو عالم ہی کچھ اور تھا، ایک ایک لفظ میں

دینی حرارت سمائی ہوئی تھی، اور جوشِ اسلامی کا دریا تھا جو امنڈ رہا تھا، میں کچھ ہکا بکا سا رہ گیا..... اور مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ یہ شخص ناموسِ اسلام کا سچا محافظ، دینِ رسالت مآب کا سچا ہیرو، اور قوم کا سچا ہمدرد ہے۔" (علی گڈھ میگزین ص ۲۴۷)

یہ ایک ناقد اور مخالف کی گواہی ہے، اس کے بعد سرسید کے اخلاص پر شبہ کرنا ظلم ہوگا، غور کیجئے اس مردِ مسلمان کے دل میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی محبت تھی، اور آپ کی تعلیمات سے اس کو کتنا عشق تھا، آہ اب مہذب اور متمدن کہے جانے والوں میں دین کی یہ عظمت کہاں باقی رہی؟ اب تو کچھ لوگ آپ کے نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں لکھتے، "محمد صاحب" کہا کرتے ہیں، اور ان کو احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم ادب کے طریقے کو چھوڑ کر گستاخی کر رہے ہیں، اور اگر کسی مصلحت وقت کی وجہ سے زبان پر دین کا نام آتا بھی ہے، تو دل پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔

اظہارِ رائے کی آزادی

مولوی بشیر صاحب ہی کا بیان ہے کہ سرسید کسی کو دبانا نہیں چاہتے تھے، ہر ایک کو اپنی رائے کے اظہار کا موقع دیتے، اور پھر اپنا نقطۂ نظر بہت نرمی سے پیش کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"سرسید میں لاکھ روپیہ کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے ہر نیاز مند کو کھل کر بات کرنے کا موقع دیتے تھے،.... جس مخالف کے متعلق ان کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ سچائی کے ساتھ ان کے مشن کی مخالفت کر رہا ہے، اس کی مخالفت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور بڑے اہتمام سے تسکین بخش انداز میں اس کے اعتراضات کے جوابات دیتے تھے۔"

(علی گڈھ میگزین علی گڈھ نمبر ص ۲۴۳)

اب یہ اندازِ فکر اور یہ اخلاق ہمارے مہذب دوستوں میں کہاں باقی رہا؟ اب تو کوئی اپنے خلاف ایک بات بھی سننے کے لئے تیار نہیں، چاہے کہنے والا کتنا ہی مخلص کیوں نہ ہو، پچھلے دنوں ہر شخص نے مشاہدہ کیا کہ یہ متمدن طبقہ اپنے مخالفوں کی بات سننے سے کتراتا تھا، اور موقع پا کر غنڈوں سے پٹوانے میں بھی ان کو عار نہ ہوتا تھا، بلکہ وہ سمجھتا تھا یہی اعمال و اخلاق کا قانون ہے، کاش بانی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی زندگی کے اس پہلو کو غور سے پڑھتے اور سبق حاصل کرتے۔

صاف گوئی

مولوی بشیر صاحب فرماتے ہیں:۔

"ایک بار میں نے ان سے کہا کہ آپ نے مسلمانوں میں جدید تعلیم رائج کرنے کا جو کام شروع کیا ہے یہ تو بہت اچھا ہے یہ بتایئے کہ مذہبی معاملات کو کیوں چھیڑ دیا،..... ہنسے اور فرمایا کہ بھائی اگر میں یہ سوال نہ چھیڑتا تو مسلمان کبھی کالج کی طرف توجہ نہ کرتے" (علی گڈھ میگزین ۲۴۳)

اس واقعہ سے کتنی سچائی ٹپکتی ہے، معلوم ہوتا ہے سر سید دل کے بہت صاف اور دماغ کے سلجھے ہوئے آدمی تھے، جھوٹ اور فریب کو برا جانتے تھے اب تو لوگ ایک غلط بات کے لئے سو جھوٹ بولتے ہیں اور لفاظی سے اسے صحیح ثابت کرنے کی خواہ مخواہ سعی کرتے ہیں، چاہے ان کو اس سلسلے میں ذلت و رسوائی سے دوچار ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔

مدرسہ علی گڈھ کی بنیاد

علی گڈھ مدرسہ کی بنیاد پہلے پہل مولوی سمیع اللہ مرحوم نے ۱۸۶۴ء میں رکھی اس وقت سر سید بنارس میں تھے، مگر اس کی باضابطہ بنیاد ۱۸۷۵ء میں رکھی

گئی، اور اس میں مولوی سمیع اللہ کے ساتھ سرسید بھی شریک تھے، اس افتتاح کا ایک مؤثر واقعہ مولوی بشیر صاحب بیان کرتے ہیں، جو خود مولوی سمیع اللہ نے ان سے بیان کیا تھا، کہتے ہیں :-

"خود مولوی سمیع اللہ نے مجھ سے بیان کیا، کہنے لگے" میں اور سرسید نماز تہجد کے وقت اٹھ کر میدانِ تعمیر میں گئے، سہانا روح پرور وقت، فضا کی خاموشی، طبیعتوں میں قومی ہمدردی، اور دینی حمیت جوش زن، ایک عجیب کیفیت طاری تھی، سرور انگیز بھی تھی، رقت آمیز بھی، اور عبرت خیز بھی، مغلیہ سلطنت کی تباہی کے بعد ارضِ ہند پر ملت اسلامیہ کی یہ پہلی بنائے تعمیر تھی، زندگی اور ترقی کے خواب کی پہلی تعبیر، جوش سے طبیعت میں گریہ طاری ہو گیا، ہم دونوں روتے جاتے تھے رب دو جہاں کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے جاتے تھے، اور اس کے فضل و بخشش کے لئے زبان پر دعا تھی، سرسید مجھ سے اصرار کرتے تھے کہ میں سنگِ بنیاد رکھوں، اور میں سرسید سے اصرار کرتا تھا آخر میں سرسید کا اصرار غالب آگیا، میں نے رقتِ قلب کے ساتھ یہ فریضۂ مسعود انجام دیا" (علی گڈھ نمبر ص۲۴۹)

جس ادارہ کی بنیاد رکھنے والوں نے قلب کی اس رقت کے ساتھ رکھی ہو، اور اس مسعود وقت میں رکھی ہو جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سائلوں کو پکارا جا رہا ہو، پھر بتایا جائے کہ اس خدمت کی قبولیت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، اللہ اللہ کیسا اخلاص ہے، روتے جا رہے ہیں اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے جا رہے ہیں، خدا جانتا ہے ایسی بنیاد کبھی بھی بے ثمر نہیں ہو سکتی، آج مسلم یونیورسٹی کی ساری کامیابی انہی بزرگوں اور مخلصوں کی نالۂ صبح گاہی اور گریۂ و بکائے نیم شبی کا نتیجہ ہے، کیسے بتاؤں کہ اب یہ سوز و گداز، یہ خلوص و للّٰہیت عنقا ہے، آدمی کی زبان پر تو سب کچھ

ہوتا ہے مگر اس کے دل میں کوئی پیچ نہیں ہوتا، خدا گواہ ہے آج ہماری ناکامیابی کی بنیادی وجہ یہی اخلاص وللہیت اور خضوع وخشوع کا فقدان ہے۔

ہمارے علیگ بھائی اس واقعہ کو بار بار پڑھیں اور سوچیں ان کے اسلاف میں خشیتِ الٰہی کیسی رچی ہوئی تھی، آہ یہ بے لوث خدمت کا جذبہ قوم کے ساتھ ایسی والہانہ محبت اور اپنی ذلت ومسکنت کا رب العزت کے آگے اس طرح اعتراف اب پچھلوں میں کہاں رہا؟ کاش ہم سمجھتے اور سچائی سے سوچتے۔

اختلاف کے باوجود ہمدردی

مولوی سمیع اللہ کا خلوص علی گڈھ کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے بعد میں سرسید اور مولوی سمیع اللہ مرحوم میں اختلاف اس حد تک بڑھا کر ترکِ تعلقات کی نوبت آگئی، مگر بایں ہمہ مولوی سمیع اللہ مرحوم نے کالج کی کبھی برائی نہ چاہی، مولوی بشیر الدین صاحب ہی کا بیان ہے :۔

"اس افسوسناک صورت حال کے بعد مولوی سمیع اللہ کالج کے انتظامی امور سے بہت حد تک دست کش رہے، لیکن کالج کے ساتھ ان کی ہمدردیاں اس دور میں بھی باقی رہیں ۔ کالج کے جو طلباء ان سے ملنے جاتے تھے، دل کھول کر مدد کرتے، ان کو بہت مخلصانہ مشورہ دیتے اور خیر وترقی کی تلقین فرماتے ۔" (علی گڈھ میگزین علی گڈھ نمبر صفحہ ۲۵)

میں اپنے علیگ بھائیوں سے ہی پوچھتا ہوں کہ وہ ایمانداری سے بتائیں کہ کیا یہ جذبات ہمارے بڑوں میں باقی رہا؟ اور کیا اب بھی نیک نیتی کا وہی عالم ہے جو ہمارے بزرگوں میں تھا؟ اب تو بصد حسرت وافسوس

کہنا پڑتا ہے ۔ ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

سرسیدؔ کا ایک واقعہ

محسن الملک نے سرسید مرحوم کا ایک عجیب پُراثر واقعہ بیان کیا ہے جس کے راوی مولوی بشیرالدین صاحب ہیں، فرماتے ہیں :۔

"یہ واقعہ انھوں نے مجھے خود بتایا ہے، سرسید سے خاصی بحث رہی، رات میں سو رہے تھے کہ گریہ و زاری کی آواز آئی دیکھا تو معلوم ہوا سید احمد خاں رو رہے ہیں، پوچھا کیا گھر سے کوئی تار آیا ہے، سرسید نے جھلاّ کر جواب دیا کہ پوری قوم تباہ ہوگئی اور تم پوچھتے ہو گھر سے کوئی تار آیا ہے۔" (علی گڈھ نمبر ص۲۵)

اس سوز و گداز کو ملاحظہ فرمایئے، رات کی تنہائی میں قوم کی بربادی پر رونے والا، اور ملت اسلامیہ کی تباہی پر آنسو بہانے والا اگر کامیاب نہ ہوتا تو پھر دنیا میں کون کامیاب ہوتا، سرسید مرحوم کے اسی خلوص اور سوز و گداز کا نتیجہ تھا کہ رب العزت نے اسے ہر طرح کی کامیابی عطا فرمائی، اور ہر طرح کی عزت سے نوازا ۔

اس واقعہ میں ہمارے مہذب لیڈروں اور متمدن جوانوں کے لئے بڑا عبرت آموز سبق ہے، کاش وہ پڑھیں اور اثر قبول کریں ۔

وقار الملک کا اخلاص

وقار الملک کا حصہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے قیام میں کسی سے کم نہیں ۔ ان کی بڑی خوبی حق گوئی تھی کبھی اس سلسلہ میں رو رعایت نہ کی، عموماً رائے میں سرسید کے مخالف رہتے، کیونکہ وقار الملک میں مذہبیت اور آئین و ضابطہ کی پابندی بہت تھی، لکھا ہے :۔

"سرسید کا انتہائی احترام کرنے کے باوجود انھوں نے اپنی رائے میں فرق نہ آنے دیا، اور کھلے طور پر ان کی مخالفت کی، البتہ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ جب اکثریت نے اس کو پاس کر دیا، تو انھوں نے انتہائی خندہ پیشانی سے سر تسلیم خم کر دیا" (علی گڑھ نمبر ص۲۵۳)

یہ وقار الملک کے اخلاص کی دلیل ہے، اپنا نقطۂ نظر پوری قوت سے پیش کرتے، مگر جب اکثریت نے اس کو نہ مانا تو پھر یہ اصرار نہ کیا، کہ یہی بات کیوں نہ ہوئی، ہمارے اس دور میں تو کچھ اور ہی معاملہ ہے، اگر کسی کی بات نہ رہی تو وہ ایک مخالف پارٹی کا روپ دھار لیتا ہے اور کیسر ادارہ کی ہی مخالفت میں سرگرم عمل ہو جاتا ہے، آج کوئی غور کرنے کے لئے تیار نہیں جو حق اس کو ہے کیا وہی حق اور لوگوں کو بھی حاصل ہے یا نہیں، اگر سب یہی کرنے لگیں تو ادارہ کا کیا حال ہو، اور غالبًا اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارا کوئی اجتماعی ادارہ آج کامیاب نہیں ہوتا۔

وقار الملک کا ایک واقعہ

وقار الملک کا ایک بڑا ہی مؤثر واقعہ مولوی بشیر الدین صاحب نے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"حیدرآباد میں ان (وقار الملک) کی کوٹھی میں ایک کوٹھری تھی، جس میں ایک اندھا فقیر رہتا تھا، اس کو کھانا نواب صاحب ہی کے مکان سے جاتا تھا، ایک دن زور کی بارش ہو رہی تھی، انھوں نے نوکروں سے کہا، کہ اندھے کو کھانا پہنچا دیا جائے، بارش کے سبب نوکروں نے تعمیل ارشاد میں تامل کیا، اور گویا بات ٹال گئے، نواب صاحب (یعنی وقار الملک) خاموشی سے اٹھے، کھانا لے کر اس اندھے کے پاس گئے۔ اور بڑی محبت سے اسے کھانا کھلایا" (علی گڑھ میگزین ص۲۵۵)

یہ اخلاق تھا نواب صاحب کا، جو کسی اعتبار سے آج کل کے کسی رئیس اور تعلیم یافتہ سے کم نہ تھے، جو کام ان کے نوکروں پر بار تھا، اسے خود بہ نفس نفیس کیا، اور کس دل چسپی سے کیا کہ کوئی بار محسوس نہ کیا، اور یہ خدمت بھی کس کی کی؟ ایک اندھے فقیر کی۔

غور فرمائیں آج کوئی مالدار تعلیم یافتہ ایسی خدمت کے لئے اپنے آپ کو تیار پاتا ہے، خدا گواہ ہے خاص خاص لوگوں کو چھوڑ کر یہ جذبہ "فقیر نوازی،، عنقا ہو چکا ہے، آج کا مہذب طبقہ دوسری دنیا کا انسان ہے، اسے انسانی ہمدردی چھو نہیں گئی ہے، ہمارے اس دور میں یہ خدمت ننگ و عار کے مرادف سمجھی جائے گی، ایک ادنیٰ کا کام اعلیٰ کرے؟ کیسے ہوسکتا ہے، اب جو مالدار اپنے سگے غریب بھائی سے ملنا اپنی ذات سمجھتا ہے، ایک نرے بجوٹ بھائی اپنے جاہل بھائی کو منھ لگانا سب سے بڑا گناہ جانتا ہے، مگر یہ حضرات سوچتے نہیں کہ یہ اخلاقی بلندی نہیں انتہائی گراوٹ ہے ــــ اور بڑوں کی بات تو جانے دیجئے آج ایسی "فقیر نوازی،، کو معمولی انسان بھی اپنے لئے عار جانتا ہے۔

وقار الملک کا حال

انہی وقار الملک کا ایک اور واقعہ سننے کے لائق ہے جس سے ان کی مذہبیت کا اندازہ ہوتا ہے، ساتھ ہی ان کی انصاف پسندی اور عدل پروری کا۔ راوی مولوی بشیر صاحب ہی ہیں، فرماتے ہیں:-

"وقار الملک نے اپنے لڑکے کو ندوہ میں داخل کرا دیا تھا، میں نے پوچھا کہ آپ نے ندوہ میں کیوں داخل کرا دیا، کہنے لگے کچھ مذہبیت آجائیگی میں نے فوراً کہا آپ دوسروں کے لڑکوں کو علی گڈھ بلا کر لا مذہب بناتے ہیں، چپ ہو گئے، لڑکے کو ندوہ سے بلا لیا اور علی گڈھ کالج

میں نام لکھا دیا۔" (علی گڑھ نمبر ص۲۵۳)

طبیعت کی نیکی اور دل کی سچائی ملاحظہ فرمارہے ہیں، خواہ مخواہ بحث شروع نہ کردی۔ بلکہ وہی کیا جو اس وقت ان کو کرنا چاہئے، ساتھ ہی اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ خود علی گڑھ کے بانیوں کو احساس تھا کہ مسلمان لڑکوں میں دینی جذبہ کی ضرورت ہے وہ علی گڑھ میں رہ کر نہیں پیدا ہوسکتا وہ جذبہ کسی دینی مدرسہ ہی میں پرورش پاسکتا ہے، مگر وقت کا تقاضا تھا جس کے پورا کرنے پر وہ مجبور تھے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ کیا ہمارے رئیس، نواب اور مالداروں میں دینی تعلیم کا احترام باقی رہا، اب قرآن کی بسم اللہ ہی اے۔ بی، پاک، کھ سے ہوتی ہے، حد یہ ہے کہ اب مسلمان اپنے بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم دینا بھی ضروری نہیں سمجھتے، نہ نماز، روزہ کا مسئلہ بچہ کو سکھایا جاتا ہے، نہ نہانے دھونے کا، نہ قرآن پڑھنا سکھایا جاتا ہے! ورنہ کلمہ اور اس کا معنی، نہ اسلامی تاریخ پڑھائی جاتی ہے اور نہ اسلامی معاملات و اخلاق، اور حد یہ ہے کہ آج مسلمانوں کے بچے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

محمد علی جوہر کی تنقید

قاضی عبدالغفار صاحب نے لکھا ہے میں مولانا محمد علی جوہر کے اخبار "ہمدرد" کے کارکنوں میں شامل ہوا، تو "مصر" کے عنوان سے ایک اداریہ لکھنے کا حکم ملا، کتابیں دی گئیں، نوٹ لکھائے گئے، دس بارہ دن محنت کی، لکھ لکھ کر جب پیش خدمت کیا تو مولانا مرحوم نے چند ہی سطریں پڑھ کر منھ بنالیا اور یہ کہہ کر مسودہ پھینک دیا۔

"یہ کیا فضولیات گھسیٹ کر لائے ہو"

پھر ایک گھنٹہ سمجھاتے رہے، قاضی صاحب کا بیان ہے کہ دوبارہ لکھ کر پیش کیا، مگر یہ بھی خوب پسند نہ آیا، حکم ہوا تیسری مرتبہ کوشش کرو، میں نے پھر از سر نو ترتیب دیا، اب کی جب لے کر حاضر ہوا، تو پڑھا اور شوق سے پڑھا اور پورا مضمون پڑھ کر۔

"گلے سے لگالیا، تعریفوں کے پل باندھ دیئے، پہلے جس قدر ان کی تنقید سے شرمندہ ہوا تھا، اب ان کی توصیف سے شرمندہ ہوگیا، معلوم ہوا کہ تنقید کی تلخی ہی میں شہد اور دودھ کی لبریز نہریں بہا کرتی ہیں ہفتوں میرے مضامین کی تعریف ہوتی رہی" (علی گڑھ نمبر ص)

ملاحظہ فرمایا جائے کہ ہمارے پہلے والے کس طرح اپنے عزیزوں کو تعلیم دیا کرتے تھے اور اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ بڑے اچھے اچھے ادیب مضمون نگار پیدا ہوئے اب تو کوئی مسودہ دیکھنے والا ہی نہیں ملتا، جس کو دیجئے وہ کہیں ڈال دے گا اور ہفتوں، مہینوں بلکہ سالوں بعد جاکر پوچھئے، جواب دے گا کیا کروں موقع نہیں ملا، اور یہ کام آپڑا، اور ایسا ہوا، بس غلط عذروں کی بھرمار کر دیں گے نوجوانوں کی تربیت کرنا لوگ جانتے ہی نہیں، ہندوستان کے علماء کرام میں یہ امتیاز غالباً صرف حضرت علامہ گیلانی مدظلہ کو حاصل ہے کہ ان میں کبھی بھی ذرا سی سستی دیکھنے میں نہ آئی، کوئی علمی مضمون اصلاح کیلئے دے دیجئے، پڑھتے جائیں گے اور بولتے جائیں گے معلوم ہوگا کوئی سمندر ہے جو جوش زن ہے، انگریزی دانوں میں چند ہی افراد نکلیں تو نکلیں اس سلسلہ میں اپنا کوئی تجربہ نہیں ۔

مشاہیر علماء ہند کے سبق آموز واقعات

تاریخی حقائق

حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی کے بعض گوشے

دار العلوم دیوبند جو ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون کا دمکتا آفتاب ہے۔ اور جس کی شعاعیں ہند سے نکل کر پاکستان، انڈونیشیا افریقہ، ایران، برما، ملایا، جاوا، سمرقند، بخارا، افغانستان، نیپال اور دنیا کے دوسرے خطوں میں پھیلیں۔ جس کو دیکھ کر رشید رضا مصری نے اعتراف کیا تھا کہ میرا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ دنیا سے علم حدیث اٹھ چکا ہے۔ بلکہ دار العلوم دیوبند دیکھ کر یقین کرنا پڑا کہ علوم حدیث اپنی پوری تابانی کے ساتھ موجود ہے اور انشاء اللہ موجود رہے گا۔

اس دار العلوم دیوبند کے پہلے شاگرد شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ م ۱۳۳۹ھ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے علم وعمل کی بے انتہا دولت سے نوازا تھا اور اس پورے سلسلۂ علمائے دیوبند کے سرگروہ ہونے کا فخر بلاشبہ حضرت شیخ الہندؒ ہی کو حاصل ہے۔ آپ براہ راست قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ م ۱۲۹۶ھ کے شاگرد رشید تھے۔ اور کتب حدیث باضابطہ شیخ الہندؒ نے حضرت نانوتویؒ ہی سے پڑھی تھی۔ ابھی حال میں حیات شیخ الہندؒ پڑھتے ہوئے خیال گذرا کہ آپ کے مخصوص حالات علماء وعوام کے سامنے پیش کر دیئے جائیں۔ اس عنوان بالا کے تحت اس سے پہلے حضرت نانوتوی، حضرت تھانوی، حضرت محدث کشمیری، حضرت شیخ الاسلام مدنی کے حالات مختلف رسالوں میں لکھ چکا ہوں، سلسلہ کی یہ اہم کڑی اب تک شائع نہ ہو سکی تھی، امید ہے اہل علم اور اہل دل

اس سلسلہ کو عقیدت و محبت کی نگاہ سے پڑھیں گے اور ذوق وشوق سے دل میں جگہ دیں گے۔

دارُالعلوم دیوبند کے اولین طالب علم

حضرت میاں اصغر حسینؒ[1] صاحب لکھتے ہیں :-

"حضرت مولانا (شیخ الہندؒ) کی عمر پندرہ سال کی تھی، اور ابھی آپ قدوری اور تہذیب پڑھ رہے تھے کہ دیوبند میں خدا تعالیٰ کے مقبول اور سراپا اخلاص بندوں کی تجویز سے ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو ایک عربی مدرسہ کا اجراء ہوا، اور مولانا ملا محمد محمود صاحب دیوبندی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کی تجویز سے پندرہ روپے ماہوار مشاہرہ پر مدرس مقرر ہوئے اور دیوبند کی مشہور مسجد چھتہ میں تعلیم عربی شروع ہوئی، ہمارے حضرت مولانا اجراءِ مدرسہ کے سابقین اولین طلبہ میں داخل ہوئے" (حیات شیخ الہند ص ۹)

اسی کی تعبیر بعض حضرات نے یہ کی ہے کہ پہلے استاذ بھی محمود تھے اور پہلے شاگرد بھی محمود، نتیجہ کے اعتبار سے یہ نیک فال پوری دنیا کے لئے محمود ثابت ہوئی۔

۱۲۸۴ھ میں آپ نے کنز، میبذی، مختصر معانی وغیرہ پڑھی اور اگلے سال مشکوٰۃ، ہدایہ، مقامات وغیرہ میں امتحان دیا اور ۱۲۸۶ھ میں صحاح ستہ کی تعلیم حاصل کی۔

شیخ الہند حضرت نانوتوی کی خدمت میں

دیوبند کا یہ مدرسہ چونکہ ابھی نیا نیا تھا گو یہاں طلبہ کا بڑا مجمع اکٹھا ہو چکا تھا

---

[1] حضرت مولانا شیخ الہند کے تلمیذ رشید اور دار العلوم دیوبند کے استاذ حدیث تھے، بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں، ولادت ۱۲۹۴ھ اور وفات ۱۳۶۴ھ ہے، آپ کے تلامذہ کی تعداد برصغیر اور غیر ممالک میں بہت پھیلی ہوئی تھی۔ اور ممکن ہے اب بھی بہت سے بقید حیات ہوں۔ ـــ

مگر دورۂ حدیث کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ اس لیے صحاح ستہ کے لئے شیخ الہند کو مدرسہ کے سرپرست حضرت نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا، حضرت میاں صاحبؒ لکھتے ہیں :۔

"۱۲۸۶ھ میں کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب اپنے فخرِ زمانہ استاذ حجۃ اللہ البالغہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے شروع کی۔ مولانا ممدوح میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں تصحیح کا کام کرتے تھے، پھر جب مطبع دہلی میں منتقل ہوگیا تو مولانا ممدوح بھی دہلی مقیم ہوئے اور کبھی کبھی دیوبند اور اپنے وطن نانوتہ بھی تشریف لے جاکر مقیم ہوتے۔ حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے ان سب مقامات میں اکثر اپنے باکمال استاذ کے ساتھ رہ کر دل وجان سے قابل رشک خدمت کرکے سعادت حاصل کی اور سفر وحضر میں سلسلۂ درس جاری رکھ کر استاذ کی شفقت اور اپنی ذکاوت سے بکمال تحقیق کتابیں پڑھیں۔" (حیات شیخ الہند ص۱۱)

آج کے طلبہ اس لذت علم کو کیا جانیں گے جو قلعہ نما عمارت میں رہتے ہیں، اور جن کی راحت و آسائش کے سارے سامان مدارس فراہم کرتے ہیں، جہاں بجلی کی روشنی، مشین کا پانی، پختہ آرام دہ کمرے اور ضروریات زندگی کی ساری چیزیں مہیا ہوتی ہیں، جو خود اپنے کو اساتذہ کا محتاج نہیں سمجھتے، بلکہ ان میں یہ یقین پیدا ہوچلا ہے کہ اساتذہ ہمارے نوکر ہیں، ہم مطلوب ہیں اور اساتذہ طالب، ہم حاکم ہیں اور اساتذہ محکوم، اور اسی ذہن کا نتیجہ ہے کہ آجکل کے طلبہ بات بات پر اسٹرائک کی دھمکی دیتے ہیں اور موقع آتا ہے تو تذلیل و توہین کی کوئی حرکت اٹھا نہیں رکھتے، مگر سب ایسے ہرگز نہیں ہوتے بہت سے برگزیدہ سعادت مند بھی ہوتے ہیں مگر کم۔ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

حضرت کا طرز تعلیم

حضرت نانوتوی کا طرز تعلیم کیا تھا، اور تلامذہ کو اس کی نزاکت کا کس قدر پاس تھا لکھتے ہیں کہ :-

"مولانا (نانوتوی) کی خدمت میں سبق پڑھنا کچھ آسان کام نہ تھا، عبارت میں غلطی کرنا یا ترجمہ سمجھنے کے خیال سے ٹھہرنا تو گناہ کبیرہ تھا، اس قسم کے امور اور بے موقع سوال سے مولانا نانوتویؒ مکدر ہو جاتے اور سبق کا لطف ہی جاتا رہتا، جو شخص ذہین و مستعد ہوتا اور دراصل کتاب پہلے سے سمجھے ہوئے ہوتا، وہ مولانا کے مضامین سمجھنے کی امید کر سکتا تھا، اچھے اچھے استعداد کے مولوی اس شرط پر شریک کئے جاتے تھے کہ صرف سنتے رہیں عبارت پڑھنے یا کچھ دریافت کرنے کا حق نہ ہوگا، لوگ خوشی سے قبول کرتے اور حاضر ہوتے" (حیات شیخ الہند صلا)

سوچئے آج کے وہ طلبہ اس بات کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں جو جماعت میں مل کر بیٹھ جاتے ہیں، جن کو نہ کبھی عبارت پڑھنے کی توفیق ہوتی ہے نہ ترجمہ کرنے کی، اور نہ ان میں اتنی استعداد ہوتی ہے، اور واقعہ تو یہ ہے کہ اکثر و بیشتر طلبہ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو یہی پتہ نہیں ہوتا کہ کہاں سے سبق شروع ہوا، اور کہاں ختم ہوا، یوں بیٹھتے ہیں جیسے عوام وعظ کی مجلسوں میں لیکن بلاشبہ کچھ طلبہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو محنت سے پڑھتے ہیں اور اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں، اور ملک اور بیرون ملک میں انہی گنے چنے طلبہ کی وجہ سے مولویت زندہ ہے اور خدا کرے آئندہ بھی زندہ رہے۔

درس میں تحقیقی تقریر

کون نہیں جانتا کہ استاذ کی تقریر سے دراصل وہی مستفید ہوتا ہے

جو مطالعہ کر کے آیا ہو اور اس نے اس مطالعہ میں مشقت جھیلی ہو کر سبق میں کیا کیا اشکالات ہیں اور ان کے حل کا کیا طریقہ ہے، کہاں الجھاؤ ہے۔ اور یہ الجھاؤ کہاں سے پیدا ہو رہا ہے، جو طلبہ یوں ہی اندھے کی طرح جا کر درس گاہ میں بیٹھ جاتے ہیں وہ غریب کیا جانیں کہ استاذ نے مسئلہ کے حل میں کیا بات فرمائی اور کیا نکتہ بیان کیا۔

"مولانا (نانوتوی) کا طرز ہی جدا تھا، حدیث ہو یا منطق، کلام ہو یا معانی ہر فن کے متعلق عجیب و غریب تحقیقات بیان فرماتے، جس سے ہر مسئلہ کی انتہائی تحقیق اور اختلافات کی تطبیق بدیہی اور مشاہد طور پر ہو جاتی تھی اور اس قسم کے مضامین بیان فرماتے کہ نہ کسی کے خیال میں آتے تھے نہ کسی سے سنے۔" (حیات شیخ الہند ص۱۱)

واقعہ ہے کہ پہلے کے اساتذہ مجتہدانہ شان رکھتے تھے، ذہن و دماغ کے سارے دریچے کھلے رکھتے تھے غور و فکر کا ان میں بے پناہ ملکہ تھا، فن کی حیثیت اولی ہوتی تھی، پھر سبق کی، اب تو اساتذہ بھی سیاسی انجمنوں میں پڑ کر مطالعہ کی لذت سے محروم ہو چکے ہیں اور علمی مسائل پر غور و فکر کی نوبت تو شاید باید ہی کسی کو آتی ہو، اس لئے کہ خود باہمی اختلاف ہی اتنا کافی ہے کہ ذہن میں کوئی دوسری بات ٹھہرنے کے لئے جگہ ہی نہیں رہ گئی ہے، الا ماشاء اللہ۔

کتب احادیث اور فنون کی تعلیم حضرت نانوتویؒ سے

شیخ الہندؒ نے قدرت کی طرف سے طبع سلیم، ذہن ثاقب اور قوی حافظہ تو پایا ہی تھا، لیکن اسی کے ساتھ مطالعہ محنت، استاذ کی خدمت اور علمی بحث و کرید نے ان کو اجاگر کیا، اور پھر یہ صحاح ستہ اور دوسری کتابیں، ان کے ساتھ آپ نے صرف ایک ہی سال میں نہیں پڑھیں، بلکہ صحاح ستہ اور دیگر فنون کی اعلی کتابوں میں آپ نے کئی سال صرف کئے، اور یہ ساری کتابیں

آپ نے حضرت قاسم العلوم نانوتوی ہی سے پڑھیں۔ حضرت میاں صاحب لکھتے ہیں:۔

"اسی طرح رفتہ رفتہ ۱۲۸۹ھ تک حضرت نے تمام صحاح ستہ ودیگر فنون کی اعلیٰ کتابیں مولانا کی خدمت میں ختم فرمائیں، اور اسی زمانہ میں باوقات مختلف ادب کی بعض کتابیں اپنے والد ماجد سے اور حساب وغیرہ و دیگر فنون کی کتابیں مدرسہ میں پڑھ کر علوم عقلیہ ونقلیہ میں اعلیٰ استعداد حاصل کرکے فارغ التحصیل ہو گئے۔" (حیات شیخ الہند ص ۔)

گویا دورۂ حدیث اور بعض دوسری کتابوں کے پڑھنے میں آپ کو حضرت نانوتوی کی خدمت میں ۱۲۸۶ھ سے ۱۲۸۹ھ تک چار سال رہنا پڑا، اور ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ میں آپ کی دستار بندی ہوئی، اس عرصہ میں اخیر کے ایک دو سالوں میں جب حضرت نانوتوی کا قیام دیوبند میں رہا تو آپ خود پڑھتے بھی تھے۔ اور مدرسہ میں طلبہ کو درس بھی دیا کرتے تھے جیسا کہ پرانے زمانے کا دستور تھا کہ منتہی طلبہ سے درس وتدریس کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

استاذ کے ساتھ حج اور شاہ عبدالغنی سے سند حدیث

۱۲۹۴ھ میں حضرت نانوتوی اور بہت سے دوسرے اکابر حج کے لئے روانہ ہوئے تو حضرت شیخ الہند نے بھی حج کا قصد فرمالیا اور استاذ کے ساتھ ہو گئے، وہاں مدینہ منورہ میں حضرت قاسم العلوم نانوتوی کے استاذ محترم مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی دہلوی مہاجر مدنی بقید حیات تھے، حضرت شیخ الہند اپنے محترم استاذ کے ساتھ ان کی خدمت میں وہاں برابر حاضر ہوتے رہے اور اخیر میں چلتے ہوئے وہاں سے بھی سند حدیث کی اجازت حاصل کی۔ مگر کس طرح؟ حضرت میاں صاحب لکھتے ہیں:۔

"استاذ الاساتذہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ دہلوی مہاجر مدنی تشریف فرما تھے، سب حضرات ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، جناب ممدوح بھی کمال شفقت اور گوناگوں عنایات فرماتے، اور باوجود انتہائی کم گوئی کے باخلاق وعنایات حسب درجات ومراتب گفتگو فرماتے مگر ہمارے حضرت کا کمال دیکھئے کہ استاذ یعنی مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں شاہ صاحب سے اجازت وسند حدیث لینا خلاف نیازمندی سمجھا، لیکن واپسی کے قریب حضرت استاذ ہی نے تحریک فرمائی تو حضرت شاہ صاحب نے بکمال بشاشت ہمارے مولانا کو سند حدیث عنایت فرمائی" (حیات شیخ الہند صـ۲۱)

دیکھا آپ نے کہ اپنے استاذ کا کس قدر لحاظ و پاس تھا کہ بغیر استاذ کی تحریک کے خود سند حدیث کی اجازت کے لئے بھی استاذ الاساتذہ تک سے درخواست کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

ایک ہمارا یہ زمانہ ہے کہ تلامذہ استاذ کے سامنے خود ہی اپنی بڑائی جتاتے ہوئے نہیں شرماتے اور ایران توران کی ہانکنے لگتے ہیں، نہ بڑوں کا ادب اور نہ اساتذہ کا احترام بلکہ چاہتے ہیں استاذ ہی ہمارا ادب ولحاظ کریں ورنہ وہ اپنے استاذ کی عزت کے درپے ہوجاتے ہیں، مگر اس کا بھی انکار درست نہیں ہے کہ اس دور میں بھی کچھ سعادت مند طلبہ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اساتذہ سے صحیح تعلق رکھتے ہیں، گو ان کی تعداد برائے نام ہوتی ہے

خلافت واجازت بیعت

استاذ کی شفقت ومحبت بھی دیکھئے کہ اپنے شاگردوں کے لئے دل میں کیسا حوصلہ رکھتے تھے اور اس کی ترقی وعروج کے کیسے خواہاں ہوتے تھے شاگرد کی زبان بند رہی تو استاذ کی زبان حق ترجمان کھل پڑی، یہی نہیں بلکہ

اسی سفر کے واقعات میں لکھا ہے :۔

"مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس آکر ایک ماہ قیام ہوا، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی استدعا خفیہ پر شیخ العرب والعجم (شاہ عبدالغنی صاحب) نے ہمارے حضرت مولانا (شیخ الہند) کو نہ صرف شرف بیعت عطا فرمایا بلکہ خلافت واجازت بیعت سے بھی ممتاز کیا، بعض بزرگوں کے بیان سے معلوم ہوا کہ اخیر زمانے میں اجازت نامہ تحریر فرما کر ہندوستان روانہ فرمایا تھا" (حیات شیخ الہند ص۱۴)

واقعہ ہے استاذ اسے کہتے ہیں اور اپنی صلبی اولاد کے لئے بھی کوئی کیا اس سے زیادہ کرسکتا تھا جو حضرت نانوتویؒ نے اپنے چہیتے شاگرد کے لئے کیا، اللہ تعالیٰ نے کتنا عظیم حوصلہ عطا فرمایا تھا، اب ایسی مثالیں نایاب ہوتی جارہی ہیں، بلاشبہ شاگرد بھی باکمال تھا، مگر یہ کمال بھی استاذ ہی کی توجہ سے پیدا ہوا تھا، بڑوں کی نظر چھوٹوں کے حق میں کیمیا ہوا کرتی ہے، جب تک اساتذہ کی نظر کرم نہ ہو کچھ نہیں ہوتا، بڑے بڑے ذہین اپنی نادانی کی وجہ سے مارے مارے پھرتے ہیں اور گمنامی کی موت مرجاتے ہیں۔

موجودہ دور کے لئے درس عبرت

کہاں ہیں آج کے استاذ شاگرد، اس واقعہ کو بار بار پڑھیں اور عبرت حاصل کریں، ساتھ ہی یہ بھی سوچیں کہ پہلے سیاسی گندگیوں سے ابتدائے زندگی میں اپنے شاگردوں کو اساتذہ کس طرح بچاتے تھے اور ان کے ذہن و فکر کی کتنی عمدہ اور پختہ تربیت فرماتے تھے، رذائل اخلاق سے تزکیہ اور فضائل و مکارم اخلاق سے جب تک کوئی آراستہ نہ ہوجائے، کوئی لباس اس پر فٹ نہیں آتا، صرف تنقید و تبصرہ اور باہمی اختلاف

سے پہلے زمانے میں بڑھایا اور گرایا نہیں جاتا تھا، کاش موجودہ دور کے با اقتدار اور باعزت علمار سوچتے۔

خدا کرے کہ پہلا دور پھر ایک بار ہمارے اس زمانے میں پلٹ آتا۔ ایسے استاذ و شاگرد کی بہتات ہوتی اور دنیا تاریک ہونے کے بجائے بقعہ نور بن جاتی اور اسلام کا بے یار و مددگار قافلہ ہر گلی کوچہ میں رواں دواں نظر آتا۔

استاذ کی خدمت اور تیمارداری

اسی سلسلہ حج میں لکھا ہے کہ واپسی میں جہاز کے اندر حضرت نانوتوی بیمار ہو گئے، حضرت میاں صاحب کی زبان قلم سے ہی سنئے:۔

«حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مقامات مقدسہ اور اپنے بزرگوں کی جدائی کی کلفت اور خانہ کعبہ کے ادب و احترام کی وجہ سے دور تک پا پیادہ چلنے کی تکلیف سے جدہ پہنچ کر بخار ہو گیا اور پھر جہاز کی تنگی اور کشمکش سے اس پر اضافہ ہوا.... اور رفتہ رفتہ مرض اتنا بڑھا کہ سب مایوس ہو گئے... نہ دوا تھی نہ علاج اور نہ جائے راحت وسکون، تاہم حضرت مولانا (شیخ الہند) نے خوب حق خدمت ادا کیا، شدت مرض میں تمام تمام رات بیدار رہے عدن پہنچے تو لیموں خرید اکہیں سے کنین، کہیں سے گلاب دستیاب کر کے کھلایا۔ مولانا (نانوتوی) کو کسی قدر افاقہ ہوا تو قافلہ کی جان میں جان آئی، حضرت مولانا اپنے استاذ اور پیر و مرشد کو اپنے وطن قصبہ نانوتہ میں پہنچا کر ربیع الاول ۱۲۹۵ھ میں دیوبند واپس آئے۔» (حیات شیخ الہند ص)

یہ تھی شاگرد کی جاں نثاری و جاں سپاری، حق ہے اپنے استاذ پر جان دیتے تھے اور خدمت میں دن رات ایک کر دیا کرتے تھے، اپنے سے زیادہ

استاذ کے راحت وسکون کی فکر ہونی چاہیئے کہ انھوں نے قلب وروح کی پرورش کی ہے اور شاگردوں کو ایسی دولت بخشی ہے جو صرف استاذ ہی کا حصہ ہے اور ان کے سوا کہیں اور سے یہ دولت نہیں ملتی۔

ایک ہمارا یہ زمانہ ہے کہ استاذ و شاگرد کا تعلق تاجرانہ درجہ کا رہ گیا ہے، نہ استاذ میں وہ شفقت اور نہ شاگرد میں جاں نثاری کا وہ جذبہ۔ ضابطہ کا لگاؤ، اور وہ بھی شرما حضوری والا، نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

دارالعلوم کی مدرسی اور استاذ سے استفادہ

حج کے بعد جب حضرت نانوتوی صحت یاب ہوئے تو آپ کا قیام دیوبند میں رہنے لگا، حضرت شیخ الہند دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہو گئے تھے، مگر استاذ سے والہانہ تعلق تھا، درس وتدریس کا حال یہ تھا کہ شیخ الہند روزانہ:

"نو نو، دس دس اسباق مطالعہ اور محنت سے پڑھاتے، اپنی کتاب ایضاح الادلہ قلمبند فرماتے اور حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کو سنا کر صلہ خوشنودی وتحسین حاصل فرماتے، اور شب کا بہت سا حصہ علاوہ کتب بینی کے عبادت، اوراد ووظائف میں گذارتے اور استاذ معظم کی خدمت میں بھی قصور نہ ہوتا جو واپسی حج کے بعد اکثر مریض رہتے تھے، حضرت مولانا اپنے ان مشاغل حسنہ میں جن کو وہ ذخیرۂ آخرت سمجھتے تھے، نہایت محویت کے ساتھ مشغول تھے" (حیات شیخ الہند ص۱۵)

اب اساتذہ دو تین اسباق میں تکان محسوس کرتے ہیں، اور یہاں دیکھ رہے ہیں تین چار نہیں، نو نو اور دس دس اسباق پڑھا رہے ہیں تصنیف وتالیف کا کام بھی کر رہے ہیں اور استاذ محترم کی تیمارداری اور خدمت میں بھی کوتاہی نہیں ہو پاتی، کیا برکت تھی، کیسی قوت تھی اور کیسا علم تھا، یہ سب اس دور کی برکت تھی اور اخلاص وللہیت نے یہ جوش عمل پیدا کر رکھا تھا جو کبھی

تھکن کو محسوس ہونے نہیں دیتا، علامہ اقبالؒ نے سچ کہا تھا ؎

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت وہ سیارہ

حضرت نانوتوی کی وفات اور تدفین

حضرت شیخ الہند کو اسی زمانے میں اپنے استاذ و مربی کا غم وفات برداشت کرنا پڑا۔ ۴ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ کو بعد نماز ظہر قاسم العلوم والخیرات چل بسے اور یہ مزار قاسمی کی زمین آپ کے ایک جاں نثار خادم نے وقف کی، اس قبرستان قاسمی میں سب سے پہلی قبر آپ کی ہی بنی :-

"حضرت کے جاں نثار خادم مسیح دیوبند حکیم مشتاق احمد صاحب رئیس نے شہر سے باہر مگر مدرسہ سے قریب ایک قطعہ اپنی مملوک زمین کا اسی وقت وقف کیا جو آجکل مرقد علماء و طلبہ و جوار صالحین بنا ہوا ہے، اور بعد مغرب راضی بقضا ہوکر عظیم الشان اسلامی مجمع نے اس خزانۂ علوم و کمالات کو سپرد خاک کیا۔" (حیات شیخ الہند ص ۱۶)

حضرت استاذ کی وفات کا اثر

اس کے تیسرے دن حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی وفات کا حادثہ پیش آیا۔ حضرت شیخ الہندؒ اپنے استاذ اور مربی حضرت نانوتوی کے جاں نثار خادم تھے، آپ اپنے استاذ کے اس حادثہ سے بہت متأثر ہوئے، حضرت میاں صاحبؒ نے لکھا ہے :-

"مخدوم استاذ کی وفات کے حادثہ نے حضرت مولانا کو بالکل پژمردہ کر دیا تعلیم و تعلم سے دل سرد ہو گیا، رنج و غم تو تھا ہی اس کے ساتھ یہ خیال بھی دل نشیں ہو گیا تھا جس کو کبھی خود ہی اظہار فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے

مشاغل علمی اور درس وتدریس صرف اس لئے تھے کہ کچھ استعداد و قابلیت پیدا ہو جائے اور حضرت کے مضامین اور ارشادات کو سمجھنے لگیں، اب کہ حضرت ہی رخصت ہو گئے، اس قیل و قال اور بے نتیجہ اشغال سے کیا فائدہ، فکر معاش نے ایسا ہی تنگ کیا تو گھاس کھود کر بسر کر لیں گے۔"

(حیات شیخ الہند ص۱)

یہ قول ہی تک نہ رہا بلکہ لکھا ہے :-

"حضرت مولانا (شیخ الہند) نے مدرسہ آنا چھوڑ دیا اور اپنے مکان میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی، حضرت اس عزم پر مضبوطی سے قائم تھے۔"

(حیات شیخ الہند ص۱)

حضرت مولانا محمد رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ جو خود وصال قاسمی کے حادثہ سے بے انتہا متاثر تھے، انھوں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو شیخ الہند کو سمجھانا شروع کیا اور آپ کے ارشاد نے الہام ربانی اور لطیفہ غیبی کا کام دیا، پھر حضرت شیخ الہندؒ کو اپنے ساتھ مدرسہ آنے پر مجبور کیا، حضرت میاں صاحب نے لکھا ہے :-

"مولانا ممدوح کے ارشاد کی تعمیل کی، اور بچشم گریاں درس جاری فرمادیا۔"

(حیات شیخ الہند ص)

موجودہ علماء کیلئے عبرت وبصیرت

اس واقعہ سے ان لوگوں کی آنکھیں کھلنی چاہئے جو سیاسی توڑ جوڑ میں شیخؒ کا اپنے کو پیرو بتاتے ہیں، لیکن خاندان قاسمی سے بُعد ظاہر کرتے ہوئے انھیں جھجک تک پیدا نہیں ہوتی، بلکہ بعض نادان اپنی نجی مجلسوں میں حضرت نانوتوی کو نظرانداز کرنے کی سعی کرتے ہیں، انا للہ۔ سوچا جائے کہ شیخ الہندؒ حضرت نانوتویؒ کے کیسے عاشق تھے، وصال پر حضرت شیخ الہندؒ نے جو جملے

فرمائے تھے بار بار پڑھئے، پھر صحیح اندازہ ہوگا کہ حضرت قاسم العلوم کا ایک جوہری کی نظر میں کیا مرتبہ تھا، اور وہ ان عام علماء کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے جو نئے نئے پیدا ہو رہے تھے، حضرت شیخ الہند کی شیفتگی ووارفتگی اور موجودہ دور کی سرد مہری دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے ؎

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

موجودہ نسل کی بے خبری

ماتم کیجئے کہ موجودہ نسل تو اب یہ بھی نہیں جانتی کہ دارالعلوم میں درسِ حدیث کا سارا سلسلہ حضرت نانوتویؒ ہی پر منتہی ہوتا ہے اور وہی تنہا اس چہار دیواری میں حدیث کے اول و آخر استاذ ہیں جس سے سلسلہ[1] پھیلا، بُرا ہو سیاست حاضرہ کی غلاظت وعفونت کا جس نے نوجوان علماء کے ایک طبقہ کا ذہن و فکر ماؤف کر کے رکھدیا ہے، اور آفتاب کی شعاعوں سے مستفید ہونے کے باوجود اس کی حقیقت سے ناواقف ہیں اور بعض منکر۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے فکر صحیح عطا کیا ہے وہ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہیں کہ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں میں علم وفن کے اندر انہی علماء کو رسوخ حاصل رہا ہے جن کو حضرت نانوتویؒ سے والہانہ عقیدت رہی ہے اور جنہوں نے اس فنا فی اللہ شخص سے محبت رکھی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ

---

[1] حضرت نانوتوی کے تلامذہ جن سے حدیث کا سلسلہ جاری رہا، شیخ الہند، مولانا احمد حسن امروہی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا عبد العلی میرٹھی، مولانا منصور علی مرادآبادی، مولانا رحیم اللہ بجنوری، مولانا یعقوب نانوتوی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔

سیاست کوئی بُری شئ ہے مگر موجودہ سیاست جس نے سچ کو جھوٹ، روشنی کو تاریکی اور دن کو رات ثابت کر رکھا ہے ایک دھوکہ ہے، ایسے وقتی اقتدار اور حکومت وقت کی بیجا ہمنوائی سے علمائے دیوبند نے ہمیشہ نفرت کی ہے، کاش ہم غور کرتے کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے ؎

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سردارا

تلامذہ پر استاذ کی جدائی کا اثر

حضرت نانوتوی کی وفات کا اثر آپ کے دوسرے شاگردوں پر بھی بہت گہرا ہوا، اسی حیات شیخ الہند میں ہے :-

"مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ میں سے دوسرے شاگرد مولانا سید احمد حسن امروہی رحمۃ اللہ علیہ بھی ترک تدریس میں حضرت مولانا (شیخ الہند) کے ہم خیال اور شریک حال تھے، ایک ماہ تک مغموم و محزون اور شغل تعلیم سے کنارہ کش رہے، لیکن اہل دیوبند کے اصرار خصوصاً حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے ارشاد سے مجبور ہو کر بدستور سابق مراد آباد کی مسجد شاہی کے مدرسہ کی مدرسی میں مشغول ہو گئے۔"

پہلے کے کیا استاذ تھے اور کیسے شاگرد، قربان جایئے اس عقیدت و محبت پر، اسی کی برکت تھی کہ علم وعمل زندہ تھا اور اخلاق و مروت مثالی ہوا کرتا تھا، ان میں باہم اخلاص و ایثار تھا، اسی لئے دنیا علم کے ساتھ مکارمِ اخلاق سے بھی مالا مال تھی، پڑھتے کم تھے مگر علم وعمل زیادہ ہوتا تھا، اب برسہا برس گذرنے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والوں کو قطعاً کوئی کتابی مناسبت پیدا نہیں ہوئی ہے، ذرا جاذب نظر کپڑا زیب تن

کرلیا، کچھ مولویانہ بھیس بنا لیا، اللہ اللہ خیر سلّا، اور بہت سے تو اس کی بھی تکلیف گوارا نہیں کرتے، بلکہ سالہا سال اس لائن میں زندگی گذارنے کے بعد خود اپنے اوپر لعن طعن کرتے ہیں اور اسی پر ان کو فخر ہوتا ہے۔

موجودہ علماء کا فریضہ

کاش موجودہ دور کے اساتذہ اور طلبہ سوچتے کہ ہم میں کیا کمی آچکی ہے اور برابر آتی جارہی ہے، اور کوئی بات سمجھ میں آتی تو اس کے دفعیہ کی کوشش کرتے، خامیوں کی اصلاح کرتے، کمی دونوں ہی طرف سے ہے شاگردوں کی جانب سے بھی اور اساتذہ کرام کی طرف سے بھی، اب ہمارے نوجوان اس طرح کے واقعات کو پڑھ کر ایسے گذر جاتے ہیں، گویا ان کے دل ودماغ کو کوئی چوٹ ہی نہیں پہنچی، کہ وہ اپنے حالات پر غور کرنے کی تکلیف برداشت کرتے، حالانکہ ماضی کو فراموش کردینے ہی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ساری دنیا میں ذلیل وخوار ہے۔

حضرت نانوتوی میں اللہ تعالیٰ نے اخلاص کی وہ دولت ودیعت کر رکھی تھی کہ جس کو پڑھا دیا اپنے وقت کا شیخ الہند بن گیا اور ملک کا نامور عالم دین، مدرسہ قائم کردیا تو وہ آج تک آفتاب بن کر دنیا کو روشنی بخش رہا ہے۔

حضرت شیخ الہند کا تقرر دارالعلوم میں

حضرت شیخ الہندؒ کا دار العلوم میں بحیثیت مدرس ۱۲۹۲ھ میں تقرر ہوا، یہ تقرر حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ مہتمم دارالعلوم نے کیا تھا، سب سے پہلے اس کا تذکرہ، آپ کے والد[1] ماجد سے انھوں نے کیا، شیخ الہندؒ کے

---

[1] آپ کے والد کا نام مولانا ذو الفقار علی تھا، یہ بھی مولانا مملوک علیؒ کے شاگرد تھے۔ ۱۳۲۲ھ میں انتقال فرمایا، تقریباً چالیس سال دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے۔

والد خود ایک بڑے جید عالم تھے اور خوشحال بھی، اس لئے یہ بات انھیں گوارا نہ تھی کہ ان کا فرزند معاوضہ لے کر مدرسہ میں پڑھائے، لیکن دوسرے بزرگوں نے جب مصالح پیش کر کے زور دیا تو وہ خاموش ہو گئے اور آپ کا مشاہرہ پندرہ روپے ماہانہ طے پایا، ابتداءً مدرس چہارم تھے، پھر مدرس سوم کے درجہ پر آئے، اس کے بعد مدرس دوم کے عہدے پر، لیکن استعداد چونکہ شروع سے ہی ٹھوس تھی اس لئے بالآخر صدر المدرسین کی مسند پر فائز ہوئے۔

"چنانچہ ۱۲۹۳ھ میں آپ صحاح ستہ کی نہایت مشکل اور اہم کتاب ترمذی شریف اور مشکوٰۃ شریف اور ھدایہ وغیرہ کتابوں کے اسباق روزانہ بے تکلف پڑھایا کرتے تھے، اور ۱۲۹۵ھ میں تو صحاح ستہ کی دیگر کتب کے علاوہ سب سے بڑی اور افضل کتاب اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف بھی آپ نے پڑھائی" (حیات شیخ الہند ص۱۳)

دارالعلوم کی تدریسی خدمت

یہ سب استاذ محترم حضرت نانوتویؒ کی دعا کی برکت تھی اور ساتھ ہی اپنی محنت اور خداداد ذہانت کی، ۱۲۹۵ھ میں آپ باضابطہ مدرس اول کے عہدہ پر فائز ہوئے اور اس وقت سے لے کر آخر عمر ۱۳۳۹ھ تک مسلسل تینتیس ۳۳ سال صدر المدرسین کی مسند پر جلوہ افروز رہے، اس عرصہ میں دارالعلوم نے ترقی کی بہت ساری منزلیں طے کیں اور اسے غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، حضرت میاں صاحبؒ لکھتے ہیں:-

"جیسا کہ ان کے طرز عمل سے ظاہر ہے وہ ہمیشہ دارالعلوم کی خدمت خدا تعالیٰ کا کام اور دینی فرض سمجھ کر بجا لاتے رہے، مشاہرہ قبول فرماتے تھے مگر بضرورت اور بکراہت، اگر وہ متاع دنیا کی طلب

فرماتے تو بہت مواقع ایسے تھے کہ لوگ حضرت کو سر آنکھوں پر بٹھلاتے اور صدہا روپیہ مشاہروں اور نذرانوں کی صورت میں پیش کرتے، لیکن آپ نے باوجود ذاتی ضرورتوں کے ہمیشہ اپنے استاذ حضرت نانوتوی قدس سرہ کے لگائے ہوئے باغ دارالعلوم دیوبند کی سرسبزی و شادابی کو مطمح نظر رکھا اور درسی دینی خدمت میں عمر تمام کردی۔"

(حیات شیخ الہند ص۲)

دارالعلوم کے موجودہ اساتذہ سوچیں کہ وہ کیسے بزرگوں کی روحانی اولادیں اور موجودہ دور میں ان پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں، اب معاملہ الٹا ہے۔

دیکھ رہے ہیں کہ پہلے ہمارے اسلاف مشاہرہ کی پروا نہیں کیا کرتے تھے اور اسباق نو نو پڑھاتے تھے اور کبھی نہیں ہچکچاتے تھے۔

حضرت نانوتوی کا ارشاد اور خدمت کا معاوضہ لینے سے انکار

حضرت میاں صاحب نے لکھا ہے کہ ۱۳۱۲ھ میں مدرسین کے مشاہروں میں اضافہ ہوا۔ تو آپ کا مشاہرہ بھی پچاس روپے کر دیا گیا، آپ نے خاموشی اختیار فرمائی، لیکن اس زمانہ میں ہوا یہ کہ:۔

"دو مرتبہ استاذ شفیق (حضرت نانوتوی) کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں "محمود حسن کب تک مدرسہ سے مشاہرہ لیتے رہو گے"، دونوں مرتبہ پورا عزم مشاہرہ چھوڑ دینے کا فرمایا، لیکن حضرت مولانا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے مجبور رہتے۔ (مشاہرہ کے ترک کی) اجازت نہ دی بلکہ ہنس کر فرمایا "نہیں ان کو کہنے دو، ہرگز نہ چھوڑو"، مگر جب حضرت مولانا ممدوح (گنگوہی) کی وفات ہوگئی اور ماتحت مدرسین کے اضافے کے ساتھ

آپ کے پچھتر روپے مقرر ہوئے تو آپ نے اضافہ بالکل قبول ہی نہ فرمایا اور کچھ عرصہ کے بعد مشاہرہ لینا بالکل موقوف کر دیا، پھر بھی اسی پابندی اور دلسوزی سے درس دیتے رہے۔" (حیات شیخ الہند ص۲۰)

اب یہ اخلاص وایثار مدرسین اور اہل علم میں کہاں باقی رہا؟ اب تو ہر شخص دن رات اپنے مشاہرہ کے اضافہ کے ہی فکر میں غلطاں وپیچاں ہے اور پڑھنے پڑھانے کی جو فکر چاہیئے وہ عنقا ہوتی جا رہی ہے۔

اور سوچیئے تو سہی کہ اپنے استاذ کا کیسا ادب تھا کہ صرف خواب میں دیکھا تھا کہ مرحوم استاذ محترم فرما رہے ہیں کہ کب تک مشاہرہ مدرسہ سے لیتے رہوگے، اور جونہی موقع ملا آپ نے اس حکم کی تعمیل کی اور معاوضہ قبول نہ فرمایا پھر ایسے شاگرد کیوں شیخ الکل اور شیخ الہند نہ بنتے، اور پوری دنیا میں ان کا احترام کیسے نہ ہوتا۔

درس میں پابندی اور مستعدی

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مستعدی کے سلسلہ میں لکھا ہے:۔

"حضرت مولانا کی معنوی برکت کے ساتھ ظاہری مستعدی وتندہی اور دلسوزی نے بھی مدد کے لئے باران رحمت کا کام کیا، اور مدرسہ دیوبند کو ایک عظیم الشان دار العلوم کی حیثیت تک پہنچا دیا، صبح کی نماز ادا فرما کر درس کے لئے آجاتے کبھی پیشاب یا وضو کے لئے درمیان میں اٹھے تو مضائقہ نہیں، ورنہ مسلسل درس دیتے ہوئے گیارہ بارہ بج جاتے تھے، اور ظہر کے بعد پھر یہی مشغلہ موجود تھا۔" (حیات شیخ الہند ص۲۱)

ساڑھے نو ماہ میں نصاب کی تکمیل

جب امراض نے کمزور کر دیا تھا تو بھی ۳۲ھ تک یہ حال تھا کہ پانچ

چھ گھنٹے ضرور پابندی سے روزانہ درس دیتے، اخیر میں جب آپ کے نمایاں شاگرد درس دینے لگے تو آپ صرف دو تین گھنٹے بخاری، ترمذی کے لئے آتے تھے اور پابندی کا یہ عالم تھا کہ خود حضرت میاں صاحب کا بیان ہے :-

"ترمذی اور بخاری شریف تقریباً ساڑھے نو ماہ میں بطمانینت تمام کرا دیتے تھے"

حضرت میاں صاحبؒ ہی کا بیان ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے چوالیس سال کامل تعلیم میں بسر کئے اور اڑتیس سال تو مسلسل درس و تدریس میں اس طرح بسر کئے کہ :-

"اس درمیان میں حضرت نے سوائے معمولی چند روزہ سفروں کے نہ کوئی طویل سفر فرمایا اور نہ کوئی ایسا شغل ہی پیش آیا اور نہ کوئی ایسا مرض ہی لاحق ہوا کہ جس سے کار تعلیم میں دو چار ماہ کا طویل حرج واقع ہوتا" (حیات شیخ الہند صلا)

اخلاص عمل کا خوشگوار ثمرہ

اور تعلیم اور درس و تدریس میں اخلاص کے ساتھ انہماک کا نتیجہ تھا کہ :-

"باوجود خدمت میں اس قدر محنت کرنے کے اور باوصف شب بیداری اور ذکر اللہ کے نہ ضعف دماغ کی شکایت رہتی تھی نہ ضعف بصر کا خلل۔ نہ دواؤں کے محتاج تھے نہ مقویات کے خواہاں، معمولی سادہ غذا استعمال فرماتے تھے اور وہ بھی نہایت قلیل" (حیات شیخ الہند ص)

پہلے دور کی یہ ساری برکتیں آج عنقا ہیں۔ اب نہ تو صحت ہی کسی کی ہموار رہتی، اور نہ کوئی ایسا مخلص ہی نظر آتا ہے، علمی انہماک اور ذکر و شغل سے

دلچسپی خال خال نظر آتی ہے، وہ خیر و برکت کا دور تھا، اور یہ زوال و پستی کا زمانہ ہے، ذہن و فکر میں بڑا انقلاب آچکا ہے، خدا مدارس اسلامیہ کے حال کو پھر ماضی میں تبدیل کر دے۔

شیخ الہند کے درس کا حال

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے درس کا حال بھی سنتے چلیے، حضرت میاں اصغر حسین صاحبؒ رقمطراز ہیں:-

"مولانا کا حلقۂ درس نہایت مہذب اور شائستہ ہوتا تھا۔ مدارس کے فراغ یافتہ اور بڑے بڑے ذہین طالب العلم نہایت مؤدب طریقہ سے حاضر خدمت رہتے۔ اور حضرت کمال عظمت و وقار سے درس دیتے ادھر اُدھر کی فضول باتوں کا ذکر تک نہ تھا، دوسروں کی تحقیر اور اپنی تعریف کا نام و نشان نہ تھا، ہنسی مذاق اور تفریح طبع جملے یا ذاتی حالات کا بیان بالکل مفقود تھا، خطاب بالکل عام ہوتا تھا کسی کی خصوصیت نہ تھی، کم سواد طالب علم قرأت کرنے سے خود ڈرتے تھے اور بے موقع سوال کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے، مستعد طالب علم بار بار اور طرح طرح سے اپنے شکوک و شبہات پیش کرتے تھے، اس طرح اکثر حلقۂ درس اہل مجلس مناظرہ بن جاتی تھی، کبھی حضرت کے الزامی جواب سے طالب علم کو ساکت کر دیتے تھے، اور کبھی جامع تقریر شفاء" لمافی الصدور کا کام دیتی تھی، الزامی جواب میں مالکہ تام رکھتا، دو چار دفعہ اس طرح ٹالتے رہتے۔ بہت رد و کد کے بعد تحقیق شروع فرماتے اور اس خوبی اور قوت استدلال سے تقریر فرماتے کہ سائل کو شرح صدر ہو جاتا تھا" (حیات الہند ص۲۲۔۲۳)

موجودہ دور کے اساتذہ غور کے ساتھ اس انداز تدریس کو پڑھیں اور سوچیں کہ اب اس میں کتنی تبدیلی آچکی ہے۔ اثناء درس میں فضول باتوں:

اور قصہ کہانیوں کا رواج کس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس کے بغیر درس گاہ میں رونق ہی پیدا نہیں ہوتی، طلبہ کو ایسے استاذ پسند ہی نہیں رہے جو صرف علمی ہی باتیں کرے، کامیاب استاذ وہی سمجھا جاتا ہے جو سبق کے ساتھ کچھ اِدھر اُدھر کی دلچسپ باتیں بھی سنائے، اپنی تعریف بھی کرے اور دوسرے استاذ پر تنقید و تبصرہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اب نوجوان علماء میں بیشتر افراد ایسے ہی نظر آتے ہیں جو ہوائی قلعوں میں رہتے ہیں اور آسمان پر اڑتے ہیں انھیں علم وفن اور استاذ کے مضمون کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔

پرانی بساط سمٹتی جا رہی ہے اور نئی بساط جو بچھ رہی ہے اس کا آپ خود ہر درس گاہ میں جاکر مشاہدہ کر سکتے ہیں، کہ وہ اوپر سے کتنی زرق برق اور اندر سے کس قدر کھوکھلی ہے۔ نئے اساتذہ بے ربط سوالات سے خوش ہوتے، اور حالات حاضرہ پر پورے جوش وخروش سے تقریر کرنا شروع کر دیتے ہیں اور کتابی اور علمی سوال پر چراغ پا ہو کر سوال کرنے والے پر برسنا شروع کر دیتے ہیں

حلقۂ درس کی کیفیت

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاذ شیخ الہند رحؒ کے متعلق لکھا ہے کہ آپ کا حلقۂ درس دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ :-

"حلقۂ درس دیکھ کر سلف صالحین و اکابر محدثین کے حلقۂ تحدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا، قرآن وحدیث حضرت کی زبان پر تھا اور ائمۂ اربعہ کے مذاہب ازبر۔ اور صحابہ و تابعین، فقہاء و مجتہدین کے اقوال محفوظ تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں نہ منھ میں کف آتا تھا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو جامع الغموض اور بھدی بناتے تھے، بلکہ نہایت سبک اور سہل الفاظ سے بامحاورہ اردو میں اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا کہ دریا اُمنڈا ہوا آرہا ہے، یہ مبالغہ نہیں ہزاروں دیکھنے والے موجود

ہیں، کہ "مسند درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے جو قوت و شوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے۔ نو درہ میں تقریر فرماتے تو مدرسہ کے دروازے تک بے تکلف قابل فہم آواز آتی تھی۔"

(حیات شیخ الہند ص)

نوجوان علماء ان حقائق کا بغور مطالعہ کریں اور اگر کوئی بات دل میں جم جائے تو اس پر عمل پیرا ہونے کی جد و جہد کریں، علم کی کثرت کے باوجود علم کی روشنی بجھتی نظر آرہی ہے، علمی استعداد برائے نام رہ گئی ہے، طلبہ لغویات میں زیادہ مبتلا ہوتے جا رہے ہیں، موجودہ دور نے ان کو مقصد سے بہت دور کر دیا ہے۔ مگر ان کو اس کا احساس تک نہیں ہے، خدا منہ کالا کرے سیاست حاضرہ کا جس نے علماء سے سب کچھ سلب کر لینے کا عزم کر لیا ہے اور ان کے جسم پر مولویانہ لباس کے سوا کچھ باقی رہنا اسے گوارا نہیں ہے، نہ علم وفن سے مناسبت، نہ خدا ترسی نہ دوراندیشی، نہ باہم خلوص و محبت، نہ خیر خواہی، نہ صدق و صفائی، بڑا نازک دور ہے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اور علماء کی سوتی بستی کو بیدار کر دے، اور اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کا ذوق عطا کر دے۔ ع

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل

اب ہزاروں میں دو چار بھی ایسے نوجوان علماء نظر نہیں آتے جن کو حضرت قاسم العلوم نانوتویؒ اور حضرت شیخ الہندؒ سے علمی اور روحانی مناسبت ہو ان کی سوانح سے انھیں دل چسپی ہو، ان کی حیات کا انھوں نے بغور مطالعہ کیا ہو، یا ان کی تصنیفات سے وہ کوئی شغف یا دلچسپی رکھتے ہوں۔

سفر حج پر روانگی کا منظر

حضرت شیخ الہندؒ جب آخری حج کے لئے روانہ ہونے لگے تو آپ کے مکان پر ایک بڑا ہجوم لگ گیا، رات کی ٹرین کے ذریعہ دیوبند سے روانگی تھی۔ اس لئے

"عشار کی نماز کے بعد حضرت مولانا مکان سے رخصت ہوئے اور حضرت مہتم صاحب مدظلہم کے مکان پر جاکر اپنی روحانی والدۂ محترمہ یعنی حضرت استاذ (نانوتوی) رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار اہلیہ محترمہ سے طالب دعا ہوکر آخری رخصت حاصل کی اور ان کی تاکید پر مکرر وعدۂ واپسی فرمایا، اور پھر دارالعلوم میں تشریف لے جاکر وہاں سے عظیم الشان مجمع کے ہمراہ اسٹیشن کو روانہ ہوئے" (حیات شیخ الہند ص۲۹)

اللہ اللہ! پہلے کے لوگوں کا کیا اخلاق تھا، حضرت استاذ بقید حیات نہ تھے۔ حضرت استانی جی کی ہی خدمت میں حاضری کو باعث سعادت جانا اور گھر سے نکل کر سب سے پہلے وہاں حاضری دی۔ دعا حاصل کی۔ پھر آگے قدم بڑھایا۔ اب تو ہمارے اس زمانے کے ہونہار علمار استاذ تک کو نظر میں نہیں لاتے، دارالعلوم کا صدر مدرس، ہزاروں علمار کے استاذ مگر جب تک استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے گھر پر حاضری نہ دے لی، آگے نہ بڑھے۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

بمبئی میں مسلمانوں کی طرف سے

عقیدت کا اظہار

بمبئی کے قیام میں جمعہ آیا تو آپ جامع مسجد میں نماز کے لئے تشریف لے گئے۔ اس کے خطیب کوکن قوم کے ایک شافعی المذہب عالم تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا تو۔

"بعد نماز مصافحہ کے لئے بڑھے اور لوگوں سے کہا کہ ہندوستان کے محدث مولانا محمود حسن صاحب یہی ہیں۔ پھر کیا تھا، مصافحہ اور

ے حضرت حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، تقریباً ۳۵ سال اس عہدہ پر کر دارالعلوم کی خدمت کرتے رہے۔

دست بوسی کے ہجوم سے حضرت کو نکلنا دشوار ہو گیا۔"
(حیات شیخ الہند صد۲)

ایک محدّث ہونے کی حیثیت سے اہل علم میں آپ جس شہرت کے مالک تھے، اس کا اندازہ اس طرح کے واقعات سے بآسانی ہوتا ہے، حضرت شیخ الہندؒ کی شہرت اب تک اسی حیثیت سے ملک اور بیرونِ ملک میں تھی، یہاں کی گورنمنٹ کو بھی آپ پر کوئی شک شبہ نہیں تھا، ورنہ حج میں جاتے ہوئے ہی تلاش وجستجو ہوتی، چنانچہ حضرت میاں اصغر حسین صاحبؒ نے لکھا بھی ہے :-

"حضرت کے طرزِ عمل کے متعلق اس وقت گورنمنٹ کو کوئی اشتباہ نہ تھا، اور آپ کا سفر ایک معمولی مذہبی سفر حج سمجھا گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے حضرت کی روانگی اور بمبئی پہنچنے کے بعد روانگی جہاز تک کوئی غیر معمولی تفتیش وجستجو نہیں ہوئی اور نہ کسی قسم کے خاص سوال وجواب کی نوبت آئی" (حیات شیخ الہند صد۳)

یہ سارا ہنگامہ وہاں سے شروع ہوا جب آپ نے حرمین میں ترکی حکومت کے خلاف والے فتوی پر دستخط کرنے سے گریز فرمایا، اس کے بعد مخالفین عقل ودانش آپ کے پیچھے پڑ گئے، اُدھر شریف مکہ حکومت برطانیہ کے آدمیوں میں ایک کھلونا بن گئے۔ اور اسلامی غیرت وحمیّت کھودی، جس کی طرف علامہ اقبال نے بھی اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔ ؎

کیا خوب امیر فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تو نام ونسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا

حضرت شیخ الہندؒ کو شریف مکہ نے چین سے رہنے نہ دیا اور آپ نے بڑی اذیتیں برداشت کیں، اور بالآخر آپ کو حکومتِ برطانیہ کے

سپرد کردیا گیا۔ جہاں سے اسیر مالٹا بن کر مالٹا روانہ ہوئے۔

مختصر حالات زندگی

دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے شاگرد، جو ۱۲۸۳ھ میں مدرسہ میں داخل ہوئے اور جن کے پہلے استاذ مولانا ملا محمود تھے۔ آپ نے کتاب [illegible]۔ ابتدائی کتابیں مولانا مہتاب علیؒ سے پڑھیں، قدوری وغیرہ پڑھ رہے تھے کہ دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔ حضرت نانوتویؒ سے علم حدیث کی تحصیل فرمائی، ۱۲۹۰ھ میں خود بانیٔ دارالعلوم نے آپ کے سر پر دستارِ فضیلت باندھی۔ ۱۲۹۱ھ میں مدرس چہارم کی حیثیت سے دارالعلوم میں تقرر ہوا، ۱۳۰۸ھ میں منصب صدارت پر فائز کئے گئے، بیعت و خلافت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے تھی۔ آپ کے دور صدارت میں دارالعلوم کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا منصور انصاریؒ، مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا اصغر حسین دیوبندیؒ، علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، مولانا فخر الدین احمدؒ، مولانا اعزاز علیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا سہول احمد بھاگلپوریؒ وغیرہ جیسے نامور علماء آپ کے تلامذہ تھے۔ قرآن پاک کا ترجمہ آپ کا بڑا علمی کارنامہ ہے۔

برطانوی حکومت کے خلاف تحریک شروع کی، اسی سلسلہ میں ۱۳۳۳ھ میں حجاز تشریف لے گئے۔ غالب پاشا اور انور پاشا سے ملے، یہیں شاہ شریف حسین والی مکہ کی مدد سے برطانوی حکومت نے آپ کو گرفتار کرکے مالٹا بھیجدیا۔ آپ کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عزیز گلؒ، حکیم نصرت حسینؒ، اور مولانا وحید احمدؒ بھی گرفتار ہوکر مالٹا پہنچے۔

رمضان ۱۳۳۸ھ میں مالٹا سے رہا ہوکر واپس ہندوستان تشریف لائے،

۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کی صبح میں دہلی میں وفات پائی، دیوبند میں تدفین عمل میں آئی، متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے اسیر مالٹا و حیات شیخ الہند۔

(مشاہیر علماء دارالعلوم دیوبند ۲۴؍۲۰)

تاریخی حقائق

حضرت تھانویؒ کی زندگی کے بعض گوشے

وطن سے واپس آیا، تو سب سے پہلے نئی کتاب جو ہاتھ آئی وہ سیرت اشرف تھی
مجھے اپنی زندگی میں جتنا ذوق اولوالعزم لوگوں کی حیات کے مطالعہ کا ہے۔
شاید اس طرح کی کتابوں میں اور کسی چیز کا نہیں، مختصر یہ کہ کتاب پڑھنا شروع
کردیا، بعض سبق آموز واقعات جو سامنے آتے دل نہیں مانا کہ اسے اپنے ہی
تک محدود رکھوں۔ کیا عجب ان کے مطالعہ سے کسی پر کوئی راہ کھل جائے،
اسی جذبے نے مجبور کیا کہ آپ تک بھی پہنچانے کا شرف حاصل کروں، بندہ
کے لئے فلاح دارین کی دعاء فرمائی جائے۔ ——— محمد ظفیر صدیقی

ادب میں اپنے لئے احتیاط

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ حضرت تھانویؒ اصول وضابطہ کے پابند، تعلیم وتربیت کے ماہر، اور اصلاح امت کے حاذق طبیب تھے، مگر آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی، کہ صرف دوسروں ہی کے معاملے میں آپ سخت نہ تھے، بلکہ اپنی ذات کے لئے بھی ہر قدم پر غایت درجہ احتیاط برتنا ضروری سمجھتے تھے۔ جہاں چھوٹوں کی بے ادبی برداشت نہیں کرتے تھے، وہاں اپنے لئے بھی ادب کا وہی ضابطہ تھا، جو ہونا چاہئے لکھا ہے:۔

"ادب کے معاملہ میں آپ ہم مسلک اور مختلف المشرب بزرگوں میں کوئی امتیاز نہیں فرماتے تھے"۔ (سیرت اشرف صـ۲۴۴)

کیا اب بھی ہم لوگوں میں یہ حوصلہ ہے، کہ کسے باشد، ادب کا معاملہ جب آئے، تو اسے ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے، اب تو اپنے اکابر ہی کا ادب رخصت ہو رہا ہے، بڑے بڑے حضرات کا آج یہ حال ہے کہ وہ اپنے اساتذہ اور پیر تک کو نہیں بخشتے، زندہ مردہ دونوں کی شان میں بیہودہ کلمات زبان سے نکالتے ہوئے ذرہ برابر شرم تک نہیں آتی، اور اس پر طرہ یہ کہ وہ اسے اپنا حق سمجھتے ہیں، ہر کس و مہ پر تنقید کی جائے، خواہ وہ تنقیص کے درجہ کو پہنچ جائے۔

بزرگ کی خدمت میں حاضری کا طریقہ

حضرت تھانوی ؒ نے لکھا ہے کہ جب دوسری بار حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی کی خدمت میں روانہ ہوا تو سوچا:۔

"ہم لوگوں کے اعمال اچھے نہیں اور اکثر بزرگوں کو قلب کی تاریکی کا احساس ہو جاتا ہے، مولانا بھی شاید اسی وجہ سے ڈانٹ ڈپٹ فرمایا کرتے ہوں، اس لئے اپنے قلب کو پاک صاف کر کے حاضر خدمت ہونا چاہیے۔"

(سیرت اشرف ص۲۴۳)

اب یہ خیال تک ہمارے دلوں میں نہیں گذرتا، کہ اپنی بد اعمالی ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، جو خدا کے پاک بندوں کے دلوں میں الجھن پیدا ہوتی ہے قصور کسی بزرگ کا نہیں اپنا ہے، یہ دور بھی عجیب ہے، دنیا کی ساری چیزوں پر نقد و تبصرہ کیا جاتا ہے، لیکن کبھی اپنی ذات پر توجہ نہیں ہوتی، کہ ذرا غور تو کریں، اپنا کیا حال ہے، ایمان کے اجزاء ہمارے اندر کس تعداد میں پائے جاتے ہیں اپنے عیبوں پر کبھی بھی نگاہ نہیں پڑتی، جب بھی پڑتی ہے غیروں کے عیوب پر پھر بھلا بتایا جائے کہ نفس کی اصلاح کیوں کر ہو سکتی ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

اپنی بداعمالی کا خیال اور اصلاح حال کی تیاری

حضرت تھانویؒ کو اسی ادب نے حکیم الامت بنایا، اسی سفر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں، جب یہ خیال آیا کہ شاید ہماری بداعمالی کا اثر حضرت والا پر پڑتا ہے تو رنج ہوتا ہے، اس خیال کا پیدا ہونا تھا کہ :-

"سواری سے اتر پڑے۔ وضو کیا اور استغفار پڑھتے ہوئے پاپیادہ اس طرف چل کھڑے ہوئے۔ حالانکہ گرمی کا موسم تھا، اور دوپہر کا وقت اور آپ روزہ سے بھی تھے۔" (سیرت اشرف ص ؎)

غور کیجئے ہمارے بزرگوں میں، دین کا کس قدر اہتمام تھا، اور اپنی کوتاہیوں پر کیسی نظر تھی۔ پھر عمل کا جذبہ دیکھئے کہ جونہی ایک اچھی بات ذہن میں آئی عمل شروع کر دیا۔ اسی حسن نیت کا اثر تھا، کہ یہ حضرات جہاں جاتے کامیاب ہوکر واپس ہوتے، اور اسی جذبۂ عمل کا نتیجہ تھا کہ یہ اپنے وقت کے آفتاب و ماہتاب بن کر افق دنیا پر چمکے۔ اور تاریک گوشوں کو روشن کیا۔

عورتوں کو احتیاط کی تاکید

حضرت تھانویؒ کو احتیاط کا بڑا خیال تھا، اپنے زمانہ میں مرجع خاص و عام تھے۔ جہاں مرد اپنی روحانی بیماریوں کا علاج تلاش کرتے تھے وہاں عورتیں بھی محروم نہ تھیں، اور اسی ضرورت سے کبھی کبھی عورتوں کو بھی اپنے حالات لکھ کر پیش کرنے کی نوبت آتی تھی، چنانچہ اس سلسلہ میں آپ نے :-

"اس بات کی تاکید کر رکھی تھی کہ اگر کوئی عورت خط لکھے تو شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنے خاوند کے دستخط کرا کر بھیجے، ورنہ اپنے کسی محرم کے دستخط کرائے، شوہر کے ہوتے کسی محرم کے دستخط معتبر نہیں سمجھتے تھے۔"

سوچئے کیا ضابطے تھے اور کتنے نتیجہ خیز، ایک طرف عورتوں میں اس راستہ سے جو آزادی پیدا ہوسکتی تھی دستخط کی قید لگا کر اسے پابند کر دیا، دوسری طرف میاں بیوی کا اختلاف جس کا امکان تھا، اسے ختم کر دیا، اس لئے کہ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے، کہ دونوں کے عقائد میں اختلاف ہو، بیوی جس عقیدہ اور مسلک کی ہو، میاں اس سے مختلف ہوں۔

میاں بیوی میں خوشگوار تعلقات کی اہمیت

چنانچہ حضرت تھانویؒ خود فرمایا کرتے تھے :۔

"میں میاں بیوی میں خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کو، اپنے ساتھ خط وکتابت رکھنے سے زیادہ ضروری سمجھتا ہوں" (سیرت اشرف ص ـــ)

خادم خاص مقرر نہ کرنے کی وجہ

آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی، کہ آپ نے کوئی خادم خاص مقرر نہیں کیا۔ جیسا عموماً پیروں کے یہاں ہوا کرتا ہے، کہ وہ نئے آنے والوں کے حالات سنتا ہے اور آ کر پیش کرتا ہے، ایک دفعہ لوگوں نے گذارش کی کہ کسی کو اس خدمت کے لئے مقرر فرمالیں تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا :۔

"اس کا دماغ خراب ہو جائے گا وہ اپنے آپ کو مقرب سمجھنے لگے گا، اس سے لوگوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچیں گی، ان سے فرمائش کیا کرے گا، اس طرح لوگ اس کو مقرب سمجھ کر حاجات و معروضات کا واسطہ بنائیں گے اور خوشامد میں اس کی خدمت کریں گے، یہ ام المفاسد ہے" (سیرت اشرف ص ـــ)

حکیم الامتؒ کی نگاہ بھی کتنی دوربیں تھی، ذرا ذرا بات کا کتنا لحاظ تھا کسی کام کو شروع کرنے سے پہلے اس کے انجام وعواقب پر کیسی گہری نظر تھی، ہمارے اس دور میں اب لوگ ان چیزوں پر کہاں نگاہ رکھتے ہیں، صرف اپنے آرام کو

دیکھتے ہیں، دوسروں کی تکلیف اور دینی نقصان کا دھیان تک نہیں ہوتا۔
اخیر دور میں جب تکلیف بڑھ گئی اور حدیث سے اس کے جواز کا یقین ہوگیا تو ایک خادم مقرر کیا، مگر اسے سخت تاکید تھی کہ کوئی ہدیہ کسی حال میں قبول نہ کرے، پھر بذریعہ اعلان ملنے والوں کو بھی تاکید کردی کہ کوئی اسے ہدیہ ہرگز نہ دے، جو دینا ضروری سمجھے وہ میرے واسطے سے دے۔

استغنا کا حال اور ایک نواب سے گفتگو

مزاج میں بے حد استغنا رتھا، کبھی کسی کے آگے نہیں جھکے، ہر جگہ ہر موقع پر اپنے اصول کو برقرار رکھا، کسی کی خفگی یا ریاست، وجاہت کی کوئی پرواہ نہیں کی، ہر ایک کو جواب برموقع دیا، ذرہ برابر کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوئے جو ایک عالم کی شان ہونی بھی چاہیئے، حضرت تھانویؒ خود حیدرآباد کے سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"مجھ کو حیدرآباد دکن میں ایک دوست نے مدعو کیا، دیوبند کے بعض احباب خاص اہل علم نے مشورہ دیا کہ وہاں نواب صاحب سے ملاقات ضروری ہے میں نے کسی کو کوئی جواب نہیں دیا، وہاں پہنچ کر سات ہی روز گذرے تھے کہ ایک دن نواز جنگ کا پرچہ آیا، جس میں لکھا تھا کہ عرصہ سے مجھ کو زیارت کا اشتیاق تھا مگر بدقسمتی سے تھانہ بھون کی حاضری نصیب نہ ہوئی، برائے زیارت حاضر ہونا چاہتا ہوں، فلاں فلاں وقت اپنے فرائض منصبی سے فرصت ملتی ہے" (سیرت اشرف صـــ)

نواز جنگ کے پرچہ کا جواب

یہ نواز جنگ صاحب اس وقت حیدرآباد حکومت کے رکن خصوصی ہونے

کے ساتھ نواب کی ناک کے بال سمجھے جاتے تھے، غور سے سنئے کہ حضرت نے ان کو کیا جواب تحریر فرمایا، لکھا:-

"بے حد مسرت ہوئی، آپ کے دل میں دین اور اہل دین کی عزت و عظمت ہے، مگر نیچے کی سطر پڑھ کر افسوس کی بھی کوئی حد نہ رہی کہ اس میں فہم سے کام نہ لیا گیا، جس کے ملنے کو زیارت سے تعبیر کیا گیا ہے اس کو تو اوقاتِ فرصت بتلا کر پابند کیا گیا، اور خود آزاد رہے، یہ کونسی فہم و تہذیب کی بات ہے" (سیرت اشرف ص ـــ)

حضرت کی نکتہ سنجی، پھر خودداری، جرأت اور حق گوئی کی داد جتنی بھی دی جائے کم ہے کہ نواز جنگ صاحب کی کیسی درست گرفت فرمائی، اور ان کی تہذیب و فہم کو ان پر کس طرح برملا ظاہر فرما دیا، سچ ہے عالمانہ وقار اسی کا نام ہے، اور دین اور اہل دین کی عظمت کا احساس یونہی پیدا کیا جا سکتا ہے۔

اہل اللہ سے ملنے کا طریقہ

نواز جنگ صاحب نے اس جواب کو پڑھ کر معافی چاہی اور لکھا کہ حضرت اپنے اوقات تحریر فرمائیں اس میں حاضر ہو جاؤں گا، حضرت تھانویؒ نے اب بھی معاف نہیں فرمایا، پھر لکھا:-

"اب بھی پورے فہم سے کام نہیں لیا گیا، مردہ بدست زندہ کی طرح مہمان میزبان کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اس سفر میں اوقات کا منضبط ہونا غیر اختیاری ہے، آپ ساتھ رہیں جس وقت مجھ کو فارغ دیکھیں ملاقات کریں"

(سیرت اشرف ص ـــ)

آہ اب دینی لوگوں میں یہ استغنا، اور اہل دنیا پر اپنے دینی وقار و فہم کا اظہار کہاں رہا، دنیا کے آگے جھک کر انہوں نے خود کو بھی برباد کیا، اور دین اور اہل دین کی عظمت کو بھی ٹھیس پہنچائی، خوشامد، حرص و آز، دنیا سے

نیچا محبت اور اہل دنیا سے مرعوب ہونا اب ان حضرات کا شیوہ ہوتا جارہا ہے۔

نواز جنگ کا اعتراف

حضرت کی اس عالمانہ شان کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواز جنگ صاحب نے تحریر فرمایا:-

"بدفہمی پر بدفہمی ہوتی چلی جارہی ہے، نہ اب اپنے اوقات کو ظاہر کرتا ہوں. نہ حضرت سے معلوم کرتا ہوں، جس وقت فرصت ہوگی حاضر خدمت ہوکر زیارت سے مشرف ہوجاؤں گا، اگر فرصت نہ ہوئی تو لوٹ آؤں گا" (سیرت اشرف ص)

جواب سے حضرت کو مسرت

جب ان کا یہ جواب آیا تو اب حضرت نے لکھا:-

"اب پورے فہم سے کام لیا گیا ہے، جس سے اس قدر مسرت ہوئی کہ پہلے آپ کا میری زیارت کو جی چاہ رہا تھا، اب میرا آپ کی زیارت کو جی چاہنے لگا. اگر فرصت ہو تو آپ تشریف لے آئیں، ورنہ مجھ کو اجازت فرمایئے. خود حاضر ہوجاؤں گا" (سیرت اشرف ص)

یہ بحث و مباحثہ کیوں گوارا فرمائی، خود فرماتے ہیں:-

"میرا یہ طرز عمل اس لئے تھا کہ یہ دنیا کے جس قدر بڑے لوگ ہیں، اہلِ دین کو بیوقوف سمجھتے ہیں. ان کو یہ دکھلانا تھا کہ اہلِ علم و دین کی یہ شان ہے کہ پہلے تو تنزل سے بچنا مقصود تھا، مگر جب اپنی کوتاہی تسلیم کر چکے تو اب کھینچنا تکبر تھا. اللہ کا شکر ہے کہ دونوں سے محفوظ رکھا" (سیرت اشرف)

یہ تھا خیال اہل علم اور دین کے احترام کا، حضرت مولانا کو اپنا احترام مقصود

نہ تھا۔ نہ اپنی بڑائی، بلکہ اہلِ دین کے متعلق غلط طور پر لوگوں نے اپنے ذہنوں میں جو ایک بات سمجھ رکھی تھی اس کی عملی تردید مقصود تھی، اور دیکھ لیجئے کہ کہیں سے کوئی کمزوری لب ولہجہ میں محسوس نہیں ہوتی، پوری سنجیدگی اور سختی سے جو بات کہنی چاہیئے تھی، کہی۔

اہل علم اور علم دین کا اکرام

کاش ہمارے نوجوان علماء اس واقعہ سے سبق لیتے اور علم دین اور اہل علم کے وقار کو جو صدمہ پہنچ رہا ہے اسے پوری ہمت وجرأت سے ایک دفعہ دور کرنے کی سعی بلیغ فرماتے، مرعوب ہونا ایک عیب ہے جس میں نوجوان علماء مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔

خوب یاد رکھئے کہ احساس کمتری موت کے مرادف ہے، اور یہ خودکشی ہے، اگر عزت وعظمت کی طلب ہے، تو پھر اپنے آپ کو بدلنا ہوگا، خواہ بظاہر آپ کو تھوڑا خسارہ برداشت کرنا پڑے۔

وقار علمی کا لحاظ و پاس

حضرت تھانویؒ یا دوسرے ہمارے اکابر اس لیے مقبول خواص و عام ہوئے کہ جہاں ان کے اعمال اور اخلاق پاکیزہ تھے، وہاں ان میں بلند فکری اور اپنے مقام کا پاس ولحاظ تھا۔

"نواز جنگ، جن کا تذکرہ تھا ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے، مگر اس وقت بھی وہی وقار وسکینت آپ نے اپنے یہاں قائم رکھا، شور ہوا، کہ فلاں صاحب آ رہے ہیں، مگر آپ جس کام میں لگے ہوئے تھے، لگے رہے، ذرا بھی اس میں فرق آنے نہیں دیا، اور نہ کوئی توجہ دی، جب پاس آکر سلام کیا، تو جواب دے کر تپاک سے

آپ ان سے ملے اور اپنی برابر جگہ دے کر بیٹھنے کو فرمایا۔"

(سیرت اشرف صـــ)

نواب حیدر آباد کے تذکرہ پر ارشاد تھانویؒ

انہی نواز جنگ کی آمد کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ وہ آکر نواب دکن کی تعریفیں بیان کر رہے تھے، پھر حضرت تھانویؒ سے فرمایا کہ نواب صاحب سے حضرت کی ملاقات ہو جاتی تو اچھا ہوتا، حضرت والا حکیم الامت کہے جاتے تھے، تو تھے بھی سچ مچ حکیم الامت، آپ خاموش نہیں رہے، نواز جنگ کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

"یہ خواہش آپ کی ہے یا نواب صاحب کی۔

نواز جنگ:۔ (کچھ دیر سکوت کے بعد) میری خواہش ہے۔

حضرت تھانوی:۔ جس وقت آپ نے ملاقات کے مناسب اور نامناسب ہونے پر غور فرمایا ہوگا، اس پر بھی ضرور غور فرمایا ہوگا کہ ملاقات سے نفع کس کا ہے؟۔

نواز جنگ:۔ نفع تو نواب صاحب کا ہی ہے۔

حضرت تھانویؒ:۔ نفع نواب صاحب کا، اور ملاقات کی ترغیب مجھ کو دی جا رہی ہے، طالب کو مطلوب اور مطلوب کو طالب بنایا جا رہا ہے۔

نواز جنگ:۔ خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ دے سکے۔" (سیرت اشرف صـ)

سوچیے ایک آزاد اسٹیٹ میں بیٹھ کر اس کے نواب پر یہ بحث فرما رہے ہیں۔ اور وہ بھی کس سے، سلطنت کے ایک رکن خصوصی سے، اسے کہتے ہیں عالمانہ شان کہ جو بات ضروری سمجھی کہنے میں رو رعایت نہ کی، اور کہی اس انداز میں کہ نواز جنگ کو خاموش ہو جانا پڑا۔

٭ ٭ ٭

دین سے بڑھ کر دنیا نہیں

حضرت تھانویؒ نے نواز جنگ کو خاموش دیکھ کر فرمانے لگے، اور یہی سننے کی بات ہے، کہ کتنی عمدہ بات فرمائی، اور کس بے باکی سے، آپ نے نواز جنگ کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

"میں خود ملاقات کو جاؤں، اس صورت میں مضرت ہی مضرت ہے، نفع کچھ نہیں، اگر ملاقات کو گیا، تو وہ مطلوب اور میں طالب ہوں گا، تو اس صورت میں ان کو مجھ سے کوئی نفع نہیں ہوگا، ہاں ان سے مجھ کو ہو سکتا ہے، اس لئے کہ جو چیز ان کے پاس ہے، وہ مجھے ملے گی، یعنی دنیا، اور وہ بقدر ضرورت بحمد اللہ میرے پاس بھی ہے اور جو میرے پاس ہے، وہ بقدر ضرورت بھی ان کے پاس نہیں یعنی دین۔"

(سیرت اشرف ص ۔)

کس قدر جچی تلی بات فرمائی، سچ کہا تھا ڈاکٹر اقبال مرحوم نے۔ ؎

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

نواب حیدر آباد سے نہ ملنے کی مصلحت

پھر حضرت والا نے نواز جنگ کے سامنے مزید مصلحتیں بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اور اگر میں گیا بھی، اور جو ان کے پاس ہے یعنی دنیا (منصب، وظیفہ وغیرہ) مل بھی گئی، تو اس صورت میں ایک خاص ضرر ہے، اگر قبول کرتا ہوں، تو اپنے مسلک کے خلاف اور اگر قبول نہیں کرتا ہوں، تو آداب شاہی کے خلاف۔ اور چونکہ اس وقت ان کی حدود سلطنت میں ہوں

اس کی پاداش میں جو چاہیں میرے لئے تجویز کر سکتے ہیں۔ پھر یہ امر بھی شانِ سلاطین کے خلاف ہے کہ وہ اپنی رعایا کے مدعو کئے ہوئے شخص سے ملاقات کریں، اس میں کم فہم لوگ ان کی تنگ دلی کی طرف منسوب کریں گے، جس میں ان کی اہانت ہے۔" (سیرت اشرف ص۔)

یہ انداز بیان قابل غور ہے کہ ایک حاکم وقت کے سامنے کس بے باکی سے نواب پر نکتہ چینی فرما رہے ہیں اور نشیب و فراز پر بحث و گفتگو کا کیا عالم ہے، اسے کہتے ہیں عالمانہ سوجھ بوجھ، کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی نہ ٹوٹنے پائے۔

مسلک کا احترام ضروری ہے

پھر اپنے مسلک کا احترام کس قدر ہے اور اسے کس جوش کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں، آج کا جدید تعلیم یافتہ مسلمان اس واقعہ کو سن کر سرپیٹ لے کہ ایک موقع ہاتھ آیا، تو اسے اس طرح ضائع کر دیا، مگر کیسے یقین دلایا جائے کہ علماء کی شان کے مطابق وہی بات تھی جو حضرت والا نے کی، کاش ہمارے نوجوان علماء اس طرح کے واقعات سے عبرت و بصیرت کا سبق حاصل کرتے، اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر اپنے آپ کو بلند کردار ثابت کرتے۔

حضرت تھانوی ہر کام میں اعتدال کو پیش نظر رکھتے: اور یہ ہے کہ یہ دین اسلام ہے بھی اعتدال پسند، خود اس دین میں کوئی افراط و تفریط نہیں، اس لئے اس دین کا سچا پیرو وہی ہے جس کا کوئی کام اعتدال کی راہ سے ہٹ کر نہ ہو۔

بزرگانِ دین کا معتدل مسلک

مولانا دریا آبادی صاحب حضرت تھانوی کے متعلق رقمطراز ہیں:-

"حضرت کے یہاں دنیاوی حکام، رؤسا، عہدہ داروں کے ساتھ معاملت میں بھی خاص اعتدال ملحوظ رکھا جاتا تھا یعنی نہ ان لوگوں کی طرف کرا جیسا کہ بعض مشہور آستانوں اور خانقاہوں میں دستور پڑگیا ہے، اور نہ ان سے اپنے کو کھینچے رکھنا جیسا کہ بعض مشائخ نے تقویٰ و درویشی کا مقتضا سمجھ لیا ہے" (سیرت اشرف صفحہ ۲۵)

اس دور میں ان چیزوں کا کہاں خیال رہا، اب کسی کام میں بھی اعتدال نہیں بلکہ عقائد تک میں اعتدال نہیں، وہی قابل صد ملامت افراط و تفریط جس سے اسلام نے سختی سے روکا ہے، آج حال یہ ہے کہ کسی سے خوش ہوئے تو ایسے پر اتر آئے کہ کوئی فوق الفطرت انسان ہے اور اگر کسی سے خدا نخواستہ خفگی ہوگئی، پھر اس طرح لعنت برسانے لگے، کہ مردود کر دیں تڑپ اٹھیں، گویا یا تو وہ فرشتہ ہے یا پھر شیطان، بیچ کی کوئی راہ نہیں، اور قابل صد افسوس یہ ہے کہ ہمارے موجودہ نوجوان علماء بھی اسی مرض مہلک میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں، ان شاء اللہ ان کو سوچنا چاہیئے کہ اگر یہی جادہ اعتدال پر باقی نہ رہے تو کوئی دوسرا کیسے باقی رہ سکتا ہے۔

تواضع فطرت میں رچی بسی تھی

حضرت تھانوی اپنے وقت کے سب سے بڑے پیر ہونے کے باوجود منکسر المزاج تھے اور اصول کے پختہ، سفر آپ برابر ریل کے تیسرے درجہ میں کیا کرتے تھے، کوئی فہمائش بھی کرتا تو اسے سمجھا دیتے، ایک مرتبہ آپ کے چھوٹے بھائی نے عرض کیا کہ آپ بڑے آدمی سمجھے جاتے ہیں، معمولی آدمی نہیں رہے، کم سے کم سکنڈ کلاس میں سفر کیا کریں، یہ سن کر آپ نے جواب دیا

"میں کیا کروں، یہ میری طبیعت کے خلاف ہے، میں ریل میں گنواروں بھنگیوں اور چماروں کے ساتھ بیٹھتا ہوں، شان کیا چیز ہے، دو دن بعد بھنگی چمار بھی

مٹی ہوں گے، اور ریں بھی ؎ (سیرت اشرف ص۲۵۱)

آج بڑے ہونے کے بعد کون ایسا کر سکتا ہے لوگ معیوب سمجھیں گے۔ اور ان کو خیال ہوگا کہ تھرڈ کلاس میں سفر کریں، لوگ مجھے حقیر سمجھیں گے، مگر جو حضرات صرف بڑائی کی حفاظت کے لئے ایسا کرتے ہیں، ان کو سوچنا چاہئے یہ بڑائی کتنے دن۔ ہاں مجبوری کی وجہ سے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت تھانویؒ کا حال یہ تھا کہ وہ ان چیزوں سے بہت اونچے ہو چکے تھے اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا، عدم رضا، جائز، ناجائز اور شرعی قوانین کا لحاظ کرتے تھے، اس کے بعد اور کوئی دھیان نہ تھا، اور واقعہ میں ایک مسلمان کی زندگی یہی ہونی چاہئے۔

نواب ڈھاکہ کے روپے کی قدر

ایک دفعہ نواب ڈھاکہ نے آپ کے لئے اونچے درجہ کا کرایہ روانہ کیا، مگر آپ نے جو عمل کیا وہ یہ کہ :-

"تیسرے درجہ میں سفر کیا، کیونکہ وہاں اونچے درجے کی نسبت زیادہ آرام معلوم ہوا، اس طرح موصولہ رقم کا کافی حصہ بچ رہا جو آپ نے نواب صاحب کو اس صورت میں واپس کر دی کہ نواب صاحب کی طرف سے ٹین کی چادریں خرید کر مسجد کے وضو خانہ کا سائبان بنوا لیا، اور نواب صاحب کو لکھ دیا کہ بقیہ رقم واپس کرنا آپ کے احترام کے خلاف تھا اور واپس نہ کرنا اپنی وضع کے خلاف تھا، اس لئے ایسا کیا گیا" (سیرت اشرف ص۲۵۲)

دیکھا حضرت حکیم الامۃ کی اصول پسندی، اور پھر مصرف بھی لیا، تو کتنا بہتر، آج اگر اس طرح بچانے والے بچائیں تو قوم و ملک کا لاکھوں روپیہ بچ سکتا ہے، اور اس طرح بیسیوں تعمیری کام انجام پا سکتے ہیں، مگر اس کی کس کو فکر ہے، یہ صحیح ہے کہ آج کل تیسرے درجہ کا لمبا سفر مستقل مصیبت ہے، مگر بڑے لوگ

تو سا ،ے آرام و عافیت کے باوجود تیسرے درجے کا نام نہیں لیتے، آخر ہنود و بڑے بڑے تاجر تھرڈ ہی کلاس میں رات دن سفر کرتے ہی ہیں اگرچہ وہ بخل کی وجہ سے کرتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ کی ایک بڑی خصوصیت معاملات کی صفائی ہے اور ہر معاملہ میں تقویٰ کا پورا لحاظ، اس سلسلہ میں کبھی بھی کوئی مداہنت برداشت نہیں فرماتے تھے۔

دوسروں پر بار ڈالنا پسندیدہ نہیں

ایک دفعہ آپ نے لفافہ پر دو پیسے کا کم ٹکٹ لگایا کہ بیرنگ ہوکر رجسٹری کی شکل اختیار کرلے، مگر مکتوب الیہ پر اتنا بوجھ ڈالنا بھی برداشت نہیں فرمایا، ٹکٹ لفافہ میں رکھ دیا، اور لکھا:-

"میں نے خط کو حفاظت کے لئے دو پیسے کا بیرنگ کر دیا ہے، اور ڈاک والے دو پیسے لیں تو ٹکٹ حاضر ہے، اگر ذہول سے نہ لیں، تو ان ٹکٹوں کو چاک کر دیجئے، تاکہ محصول ہمارے ذمہ بقایا نہ رہے، اگر چاک کرنے کو دل گوارا نہ کرے تو کسی خط میں جو خاص اس غرض کے لئے نہ بھیجا جائے مجھ کو اطلاع کر دی جائے، میں خرید کر چاک کر دوں گا" (سیرت اشرف ص۵۵)

آپ نے اپنی اس تحریر میں جو لب و لہجہ اور تاکید کا پہلو اختیار کیا ہے اسے بار بار پڑھئے اور سوچئے اس چیز کا کس قدر خیال تھا کہ میرے ذمہ بقایا نہ رہ جائے، حکومت کو کسی طرح اس کی واجب الادا رقم پہنچ جائے، اور اس طرح کے ایک دو نہیں بیسیوں واقعات ہیں کہ آپ نے ریل کا ٹکٹ لے کر چاک کر دیا ہے، بلکہ آپ سے وابستہ جتنے لوگ تھے سب کو اس کی تاکید تھی، کہ بغیر ٹکٹ سفر نہ کیا جائے، اگر کبھی اس کی نوبت آئے تو ٹکٹ لے کر

چاک کر دیا جائے، تاکہ واجب الادا رقم حقدار کو پہنچ جائے۔
کاش ان چیزوں کا ہمارے زمانہ کے نوجوان مسلمان خیال کریں اور اس کی اہمیت کو صحیح طور پر محسوس کریں کہ کسی کا کوئی واجب الادا پیسہ ذمہ میں باقی نہ رہ جائے۔

دینی مسائل کی حفاظت کا خیال

اسی طرح لکھا ہے کہ حضرت تھانویؒ کی خدمت میں ایک صاحب ایک مرتبہ گنے کے رس کا گھڑا ہدیۃً لائے، تو آپ نے اس وجہ سے رد کر دیا کہ یہ رہن شدہ زمین میں کاشت کئے ہوئے گنے کا رس ہے، خود تحریر فرماتے ہیں:-

"اگرچہ وہ خاص صورت رہن کی جو یہاں واقع تھی جائز ہے، لیکن میں کس کس سے کہتا پھروں گا کہ یہ وہ رہن ہے جو جائز ہے، سب یہی کہیں گے کہ رہن کی زمین کا رس لے لیتا ہے، لہٰذا رہن رکھنا جائز ہے، اپنا تو دنیا کا فائدہ کر لوں، اور دوسروں کے دین کا نقصان کروں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔" (سیرت اشرف ص۲۵۶)

اللہ اکبر یہ ہے احتیاط، اور سچ ہے ایک ذمہ دار اور دینی پیشوا کو یہی کرنا چاہئے تھا، اللہ تعالیٰ آپ کی قبر کو نور سے بھر دے، آپ بڑا کام کر گئے ان واقعات سے ہمیں سبق لینا چاہئے کہ اہل علم کا کیا فریضہ ہے۔

دنیا سے طبعی بے نیازی اور نواب رامپور کو ہدایت

طبیعت میں دنیا سے بڑی بے نیازی تھی، شرعی معاملات میں کسی کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے، جو حق بات ہوتی، منھ پر کہہ ڈالتے، لکھا ہے کہ

ایک دفعہ نواب رامپور نے قادیانیوں سے مناظرہ کا انتظام کیا، جہاں اور علماء دیوبند شریک ہوئے، آپ بھی تشریف لے گئے، مناظرہ سے فارغ ہوکر جب واپس ہونے لگے تو نواب صاحب نے آپ کی خدمت کچھ زیادہ رقم پیش کرنی چاہی، آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا:-

"ریاست کو بیت المال میں سے زائد از ضرورت صرف کرنے کا شرعاً اختیار حاصل نہیں ہے" (سیرت اشرف ص۱۴۳)

اب یہ خوبیاں اور حق گوئی و بے باکی کی یہ صفت عنقا ہوتی جارہی ہے لوگ مصلحتوں کے نام پر ساری برائیاں آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں اور زبان تک ہلانے کی توفیق نہیں ہوتی، اور حد یہ ہے کہ اہل دین بھی اب اس باب میں چستی کی جگہ سستی کا عملاً ثبوت دے رہے ہیں۔

حضرت تھانویؒ اپنی خودداری، وضع، مسلک کی پابندی اور عالمانہ شان کے نباہنے میں کمال رکھتے تھے، کبھی بھی اس سلسلہ میں ان کے قدموں میں جنبش پیدا نہیں ہوئی، نہ چھوٹوں کی محبت سے اس اصولی زندگی میں فرق آنے دیا، نہ بڑوں کی عظمت نے متاثر کیا، ہمیشہ اسی راہ پر گامزن رہے، جو متعین فرما چکے تھے۔

نواب بھاولپور کے نذرانہ کی واپسی

ایک مرتبہ کسی کام سے بہت سے علماء کرام کو نواب بھاولپور نے مدعو کیا، اس جماعت میں حضرت تھانویؒ بھی شامل تھے، جب وہاں سے واپسی ہونے لگی، تو لکھا ہے کہ:-

"نواب صاحب کی طرف سے سب حضرات کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے بطور خلعت، اور پچیس پچیس روپے بنام دعوت عطا کئے گئے، اس وقت تو حضرت نے احترام نواب کے خیال سے سب کے ساتھ یہ رقم لے لی لیکن

خلوت میں وزیر متعلقہ سے فرمایا "یہ رقم مجھ سے واپس لے لی جائے، کیونکہ یہ بیت المال میں سے دی گئی ہے، جس کا میں مصرف نہیں"۔
(سیرت اشرف ص۱۴۱)

غور کیجئے جو بات کہنی تھی، کتنی صفائی سے فرمائی، شریعت کے باب میں نہ نواب صاحب کی پرواہ کی، نہ وزیر صاحب سے مرعوب ہوئے، نہ حیلہ کیا، نہ بہانہ، بلکہ مسئلہ کی جو صورت تھی وہی سامنے رکھ کر معذرت کر دی۔
آج کا کوئی شخص سنے گا، تو اسے حیرت ہوگی، مگر حکیم الامت کی شان وہی تھی، جس کا آپ نے اظہار فرمایا، غلط عذر سے بات کمزور ہوتی ہے مضبوط نہیں ہوتی، پھر نہ روپئے کی محبت کے آگے جھکے، نہ نواب صاحب کی نوابی کے آگے۔

وزیر کا عذر اور اس کا جواب

وزیر صاحب نے حضرت والا سے عرض بھی کیا:۔
"چونکہ اس رقم کا کاغذات سرکاری میں اندراج ہو چکا ہے، اس لئے اب اس کی واپسی کی کوئی صورت نہیں ہے" (سیرت اشرف ص۱۴۱)

وزیر صاحب سوچ رہے ہوں گے کہ اب مولانا مجبور ہو کر قبول فرمالیں گے مگر ایسا نہیں ہوا، فوراً اسی وقت فرمایا گیا:۔
"خیر، اگر خزانہ میں واپسی نہیں ہو سکتی، تو اس رقم کو مقامی علماء اور طلباء میں صرف کر دیا جائے کیونکہ شرعاً بیت المال کے مصرف کے وہ قریب ہیں"
اور اسی پر بس نہیں کی، بلکہ:۔
"جو کچھ حضرت کو ملا تھا، وہ آپ نے سب کا سب واپس فرما دیا، لیکن نہایت سلیقہ اور طریقہ سے" (سیرت اشرف ص۱۴۲)

دیکھا آپ نے حضرت والا کا انداز بیان، اور اپنی بات منوانے، اور

صحیح مسئلہ پر عمل کرنے کا طریقہ، اسے کہتے ہیں، شریعت پر عمل، کاش یہ جذبہ آج عام ہوتا، اور دنیا یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوتی، کہ علماء کا مقام کس قدر بلند ہے۔

ریاست خیرپور سندھ میں خلعت کی واپسی

اسی طرح کا واقعہ ریاست خیرپور سندھ میں بھی پیش آیا، وہاں بھی خلعت ملی تھی، آپ نے وہاں بھی انکار فرمایا، اور جب کہا گیا کہ نواب صاحب کو ناگوار خاطر ہوگا، تو حضرت نے برجستہ فرمایا:۔

"اگر یہ اندیشہ ہے، تو ان کو معلوم ہی کیوں کرایا جائے، بلکہ جو نقد بہ عنوان خلعت ملا ہے، اس کو مساکین میں تقسیم کر دیا جائے، کیونکہ وہ لوگ اس کے صحیح مصرف ہیں" (سیرت اشرف ص۱۲۵)

اور اس طرح کے بیسیوں مواقع پیش آئے مگر کہیں بھی آپ نے مصلحت کے نام پر کسی غلط چیز کو قبول نہیں فرمایا، خود فرمایا کرتے تھے:۔

"الحمدللہ! مجھے کسی جگہ خلاف شریعت یا خلاف طبیعت کرنے پر مجبور نہیں ہونا پڑا"

بلکہ جہاں جاتے، پہلے طے کر دالیتے تھے کہ مجھے کسی قسم کا ہدیہ نہیں دیا جائے، جب تک یہ شرط قبول نہیں کر لی جاتی، آپ تشریف نہیں لے جاتے تھے۔

اخلاقی دباؤ قبول کرنے سے انکار

حضرت تھانویؒ ہر اس چیز سے پرہیز کرتے، جس سے کسی طرح بھی اخلاقی دباؤ کا اندیشہ ہوتا، سوانح نگار نے لکھا ہے کہ:۔

ایک دفعہ کسی رئیس نواب نے مدرسہ خانقاہ کے لئے دو سو روپے کی رقم بھیجی اور ساتھ ہی تشریف آوری کی دعوت دی، آپ نے اس روپے کو اسی

وقت واپس فرمادیا، اور نواب صاحب کو لکھ بھیجا :۔

"اگر رقم کے ساتھ بلانے کی درخواست نہ ہوتی، تو مدرسہ کے لئے روپیہ لے لیاجاتا، اب اس اقتران سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید مجھ کو متاثر کرنے کے لئے یہ رقم بھیجی گئی ہو، آپ کی یہ غرض نہ سہی، لیکن میرے اوپر طبعی طور پر اس کا یہی اثر ہوگا" (سیرت اشرف ص۱۳۶)

ہمارے اس دور میں اب ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا کس کو لحاظ ہے مگر سوچیئے تو معلوم ہوگا کہ ایک عالم کے لئے یہ اصول زندگی کس قدر ضروری ہے اہل دنیا نے اسی احتیاط کے عام طور پر نہ ہونے کی وجہ سے علماء کے متعلق ایک غلط رائے قائم کرلی ہے، اور نئے تعلیم یافتہ حضرات خواہ مخواہ علماء پر نکتہ چینی کرتے ہیں، حالانکہ علماء عموماً خوددار ہوتے ہیں، یہ الگ چیز ہے کہ اپنی سادگی کی وجہ سے سب میں یہ دوربینی نمایاں نہ ہوتی ہو، گو ضرورت ہے کہ زمانے کے تقاضے سے مجبور ہوکر ہی سہی اس طرح کی احتیاط ضرور برتی جائے تاکہ عوام میں علماء کا وقار قائم ہوسکے۔

حضرت کی خودداری کا ایک واقعہ

اس سے بھی عجیب واقعہ ملاحظہ کیجئے :۔

مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے لئے ایک رئیسہ نے ایک دارالطلبہ تیار کرایا، جب وہ تیار ہوگیا تو اس نے مہتمم کو لکھ بھیجا کہ فلاں تاریخ کو افتتاحی جلسہ کیاجائے اور اس میں اراکین اور سرپرست مدرسہ کو اطلاع دیدی جائے کہ جلسہ ہے، تاریخ متعینہ پر مدرسہ آجائیں، مہتمم صاحب مدرسہ نے اس اطلاع کے ساتھ حضرت تھانوی کو بھی شرکت کی دعوت دی، کہ آپ مدرسہ کے سرپرست تھے۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ آپ نے شرکت سے انکار فرمادیا

اور لکھ بھیجا :-

"ان کو اس حاکمانہ لہجہ میں بلانے کا کوئی حق حاصل نہیں، اس طرح حکم نامہ بھیج کر بلانا خلاف تہذیب ہے، یہ بھی بلانے کا کوئی طریقہ ہے، میں نہیں آؤں گا، کیا وہ کسی رئیس کو ایسے طریقے سے دعوت دے سکتی تھیں"۔

(سیرت اشرف ص۱۴۶)

خیال کیجئے کہ حضرت تھانویؒ کو عالموں کے وقار کا کس قدر پاس تھا اور یہی ہونا بھی چاہئے، جب سے عام طور پر ہمیں اپنی برتری اور خودداری کا احساس باقی نہ رہا، ہم اپنے مقام سے ہٹنے لگے، خاکسار حقیر، فقیر اور لاشیٔ اپنے ناموں کے ساتھ لکھنے کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ ایک شخص ایک عالم کو نائب رسول بھی سمجھے اور اس کے ساتھ برتاؤ بیگاروں جیسا کرے، اور ہم پر اس کا کوئی اثر نہ ہو، ہمارا فریضہ ہے کہ اسے اپنے علم وعمل سے اپنا مقام ذہن نشیں کرانے کی مسلسل سعی کریں۔ بالخصوص سرمایہ داروں کے آگے جھکنا، حرص وآز میں مبتلا ہونا، اور عالمانہ وقار کے خلاف کوئی قدم اٹھانا، سب سے بڑا گناہ ہے، خوب اچھی طرح ذہن نشیں کرلیں کہ عالموں کے وقار کے انحطاط کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ دین کا وقار بھی گھٹتا چلا جاتا ہے، جس کا عوام کو احساس نہیں ہوتا، اور نہ علماء کرام کو۔

اجتماعی نذرانہ پر حضرت تھانوی کا حکم

حضرت تھانویؒ غضب کے ذہین اور بلا کے ذکی تھے، ایک دفعہ آپ ایک جگہ تشریف لے گئے تو اس گاؤں کے چودھری نے چندہ کر کے دوسو روپے نذرانے کے پیش کئے، حضرت کو اس کی مالی حالت دیکھ کر شبہ ہوا، چنانچہ دریافت فرمایا کہ یہ صرف آپ کی طرف سے ہے، یا اور

لوگ بھی اس میں شریک ہیں؟ جواب دیا گیا، کہ دوسرے لوگ بھی شریک ہیں، آپ نے واپس کرتے ہوئے فرمایا:-

"ہدیہ محبت کے لئے ہوتا ہے، جب دینے والے کو میں نہیں جانتا، تو مجھ کو ان کی محبت کیسے ہوگی، اس لئے ہر ایک کو اس کی رقم واپس کردو، پھر جس کو دینا ہوگا، ہر ایک خود آکر اپنے ہاتھ سے دے گا، جس سے مجھے پتہ چلے گا کہ یہ میرا محسن ہے، اور مجھے اس سے محبت ہے"

(سیرت اشرف ص ــــ)

اسے کہتے ہیں عالمانہ سوجھ بوجھ، مسئلہ کی نوعیت بھی کھل گئی، ظلم و زیادتی کا قلع قمع بھی ہو گیا، اور اس عذاب سے بھی بچ گئے جو نازل ہونے والا تھا۔ اس لئے کہ پھر چودھری جی ہدیہ پیش کرنے حاضر نہیں ہوئے۔

اس طرح اپنے آپ کو پیش کرنا، جس سے عوام کی نظر میں عام علماء کا وقار باقی نہ رہے کسی طرح مناسب نہیں ہے، اور سچ پوچھئے تو علماء کی اس بے توجہی کا ہی نتیجہ ہے کہ ان حضرات کا اصل مقام باقی نہیں رہا اور ان کی شخصیت بھی کافی متاثر ہو گئی، کاش اب بھی ان کا احساس خودداری جاگ اٹھتا۔

وعظ میں چندہ کی اپیل سے اجتناب

حضرت تھانوی کے احساس خودداری کا یہ عالم تھا کہ جب مدرسی کے زمانہ میں فیض عام مدرسہ کانپور کے منتظمین نے آپ سے التجا کی کہ آپ اپنے وعظ میں چندہ کی تحریک بھی فرما دیا کریں، تو آپ نے صاف انکار کر دیا۔ لکھا ہے کہ:-

"اسے حضرت تھانویؒ نے غیرت دینی کے خلاف سمجھا کہ مدرس درس دین

بھی دے، وعظ بھی کرے اور اپنی تنخواہ کے لئے چندہ بھی جمع کرے، اس لئے ایسا کرنے سے آپ نے صاف انکار کر دیا" (سیرت اشرف ص۳۵)

واقعہ بھی یہ ہے کہ مدرس کے ذمہ اس طرح کا کام لگانا، اور قبول کرنا دونوں ہی مذموم ہیں، اور کوئی شبہ نہیں اس طریقۂ کار سے علماء کا وقار علمی ختم ہو جاتا ہے، اور ایک حساس کو طبعاً یہی کرنا چاہیئے، جو حضرت والا نے کیا، قوم کو کون سمجھائے کہ مصلحین امت کے فرائض کتنے اہم اور نازک ہیں، اور ان فرائض کی پوری پوری ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے کیا شرائط ہیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے ہمارے ان علماء کو جو اس راستہ پر گامزن ہیں باوجود اس کے کہ وہ مدرسہ کی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہیں مگر کبھی بھی اپنے وعظوں میں چندہ کی اپیل نہیں کرتے، اور کرتے ہیں تو دین کی عظمت اور اپنے شخصی وقار کو باقی رکھ کر۔

پُروقار زندگی پر اعتراض کا انجام

آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ حضرت تھانویؒ کے اس انکار سے جب ارباب مدرسہ میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، اور بات آگے بڑھی، تو:۔

"آپ کو سخت ناگوار گذرا، اور آپ نے استعفاء دیدیا، بعد میں انھوں نے معذرت کی، لیکن حضرت نے اس بناء پر کہ یہ نا قدرے لوگ معلوم ہوتے ہیں، ان سے میرا نباہ مشکل ہوگا، وہاں رہنا منظور نہ فرمایا"

(سیرت اشرف ص۳۵)

اسے کہتے ہیں دینی غیرت وحمیت، اور اللہ تعالیٰ پر اور خود اپنی ذات کا صحیح اعتماد، یہ کیونکر یقین دلایا جائے، کہ لوگ خود اپنے کو گراتے جا رہے ہیں،

کون کہہ سکتا ہے، کہ حضرت والا کی یہ تنقید غلط ہے؟ اگر اساتذہ میں وہی جذباتِ شفقت ہوتے، جو کبھی تھے، تو اس وقت عام دینی مدارس سے علماء کی جو جماعت نکل رہی ہے وہ اس معیار پر نہ ہوتی، بلکہ وہ باذوق، علم دوست، اور صاحبِ فضل و کمال ہوتی، اور دنیا پر اس کا سکہ جما ہوا ہوتا۔

درسی تقریر کا معیار اور انداز

حضرت تھانویؒ خواہ مخواہ لمبی تقریر کو اسباق میں پسند نہیں فرمایا کرتے تھے۔ خود لکھتے ہیں :۔

"میں نے پڑھاتے وقت ضرورت سے زائد کبھی تقریر نہیں کی ہرف حل کتاب پر اکتفا کیا، زوائد سے کبھی طالب علموں کا وقت ضائع نہیں کیا، اور میں اس کی تاکید اپنے ماتحت مدرسین پر رکھتا تھا، بلکہ کبھی کبھی جا کر ان کے پڑھانے کی جانچ بھی کیا کرتا تھا" (سیرت اشرف ص۵۵)

اب یہ زحمت کون برداشت کرتا ہے" بڑے اپنے چھوٹوں" کی تعلیمی نگرانی کا فریضہ ادا کریں۔ عام مدارس سے علمی معیار کو جہاں اور چیزوں نے گرایا، اس کوتاہی کو بھی اس مسئلہ میں بڑا دخل ہے، بڑے اپنے چھوٹوں کی نگرانی کا فرض یکسر فراموش کر گئے، حالانکہ اس سے سب کا فائدہ ہے، خود استاذ کا بھی طلبہ کا بھی، ادارے کا بھی، اور صدر مدرس کا بھی۔

مولانا نگرامی کا شکریہ

اللہ تعالیٰ مولانا محمد انیس صاحب نگرامیؒ کی قبر کو نور سے بھر دے، کہ انھوں نے خاکسار کی ابتدائی مدرسی کے زمانہ میں پوری نگرانی باقی رکھی، بلکہ دو ماہ تک مسلسل پابندی سے" ہدایہ" اور" مشکوٰۃ" کے سبق میں شریک ہوتے

رہے اور پھر کبھی کبھی، اس کا ثمرہ یہ ہوا کہ مطالعہ سے شغف پیدا ہوگیا، اور بغیر مطالعہ درس گاہ میں آنا جرم سمجھنے لگا۔

کاش پھر ایک مرتبہ ارباب درس و تدریس کی دنیا میں یہ احساس زندہ ہوتا، جوان حضرات کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتا۔ اور ان میں یہ یقین تازہ ہو جاتا، کہ یہی مذہبی دنیا میں قوم کے صحیح معمار ہیں، یہ جتنی مضبوط دیوار اٹھائیں گے، اور جس قدر ٹھوس بنیاد بنائیں گے، مذہبی دنیا اسی انداز سے ترقی کرے گی۔

طلبہ پر اساتذہ کے اثرات

اور کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ طلبہ سب سے زیادہ اپنے اساتذہ اور مدرسہ کے ماحول سے ہی متاثر ہونے کے عادی ہیں، اگر ان کے اساتذہ کمالات کے مالک ہوں گے، طلبہ بھی ایسے ہی نکلیں گے، اگر ان کا ماحول علمی ہو کا پاکیزہ اور بلند ہوگا کوئی وجہ نہیں، کہ ان کے طلبہ میں پاکیزگی اور بلندی پیدا نہ ہو۔

پھر طلبہ کو بھی محسوس کرنا چاہئے کہ کل ان کے ہاتھ میں ملک و ملت کی باگ ڈور آنے والی ہے اور استاذ بننے والے ہیں، اس لئے اپنے اندر وہ استعداد پیدا کریں کہ وہ ملک کی سچی خدمت انجام دے سکیں اور اچھے مدرس ثابت ہوں۔

علم اور اساتذہ کا ادب و احترام

علم کی سب سے پہلی شرط اساتذہ کا ادب اور ان علوم کی عزت ہے جسے حاصل کرنے کے لئے طالب علم کتاب کھولتا ہے استاذ کے ادب اور علم کی عزت کے بغیر شاید چند حروف طالب علم کو آجائیں لیکن نور علم اور علم کی برکت جن

چیزوں کا نام ہے وہ تو پاس بھی نہیں پھٹک سکتی، عربی اور دینی مدارس میں یہ خوبی بحمد اللہ اب تک باقی ہے، کہ ان مدارس کے طلبہ میں اساتذہ کے ادب اور علم کی عزت کا جذبہ باقی ہے۔ لیکن نئے طرز کی درس گاہوں میں تو استاذ اپنا مجبور اور دوست سمجھا جاتا ہے جس کا نہ صرف مذاق اڑایا جا سکتا ہے بلکہ بے عزتی کرنے میں بھی کچھ دیر نہیں لگتی، ہم بغیر کسی مبالغہ کے طلباء مدارس عربیہ کی اس سعادت مندی کا اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے علم کی قدر دانی کے ساتھ اپنے اساتذہ کی توقیر و عظمت کا بھی پورا دھیان رکھا اور انھوں نے زندگی میں اپنے اساتذہ کا بڑا مقام اور بڑا درجہ دیا ہے، آج بھی مدارس عربیہ میں جاکر دیکھئے تو طلبہ اپنے اساتذہ کے لئے اپنی آنکھیں فرش راہ کرتے دکھائی دیں گے۔

تکبر و غرور کے شائبہ سے
پاک زندگی

حضرت تھانویؒ کوئی شبہ نہیں اپنے ارادت مندوں کی اصلاح میں سخت تھے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے آپ میں کبر پیدا ہو گیا تھا، حاشا و کلا بایں ہمہ وہی کسر نفسی وہی عجز و انکساری اور وہی احساس عبدیت جو اولیاء کا خاص حصہ ہے، آپ بارہا قسم کھا کر فرمایا کرتے تھے :-

> "میں اپنے کو کسی مسلمان سے، حتی کہ ان مسلمانوں سے بھی جن کو لوگ فساق و فجار سمجھتے ہیں ..... اچھا نہیں سمجھتا، اور آخرت میں درجات حاصل ہونے کا کبھی مجھے وسوسہ بھی نہیں ہوتا، کیونکہ درجات تو بڑے لوگوں کو حاصل ہوں گے" (سیرت اشرف ص۳۵)

اللہ اکبر! یہ تھا خوف و خشیت الٰہی، اور یہ تھا احساس اس مرد مومن کا

جو حکیم الامت اور جامع المجددین کے لقب سے اپنے اور غیروں میں مشہور ومقبول تھا، آہ اب یہ رنگ ہمارے عام مشائخ میں کہاں باقی رہا، آج تو احساس کا فقدان عام ہے، اور ہر شخص اپنی آپ مدح میں رطب اللسان ہے، نہ خوف خدا، نہ مرنے کا سچا یقین، نہ اپنی لغزشوں کا احساس، اور حد یہ ہے کہ کل کیا پیش آنے والا ہے، عام مسلمان اس امر سے بالکل غافل ہیں۔

مسلمانوں کی توقیر اور عظمت

اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے:۔

"غرض کوئی مومن کیسا ہی بد اعمال ہو، میں اس کو حقیر نہیں سمجھتا، بلکہ فوراً یہ مثال پیش نظر ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی حسین اپنے منھ پر کالک لگالے، تو اس کو جاننے والا کالک کو بُرا سمجھے گا، اور اس حسین کو حسین ہی سمجھے گا۔" (سیرت اشرف ص۳۵۶)

آپ نے پڑھا؟ کہ حضرت والا نے مومن کے درجہ کو کس خوبی سے اجاگر کیا، اسے کہتے ہیں بڑائی، اور دین سے انس و محبت، اور سچ ہے انسان میں جب کمالات پیدا ہو جاتے ہیں تو اس کا یہی ثمرہ ہمیشہ دیکھنے میں آتا ہے۔

آج مسلمانوں کو کس طرح سمجھایا جائے، کہ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کے سلسلے میں کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟ کاش ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے شغف ہوتا، اور اپنی خامیوں اور عیوب کے جائزے لینے کا شعور پیدا ہوتا۔

خوف وخشیت الٰہی کا غلبہ

حضرت تھانویؒ اپنے علم وعمل میں جس قدر اونچے تھے وہ کسی سے

بھی مخفی نہیں ہے، مگر آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی، کہ بایں ہمہ خدمات دین اور قبول عام، کبھی کبھی آپ پر خوفِ خدا کا جب غلبہ ہوتا، تو شکستگی کے لہجہ میں فرماتے :۔

"نہ علم کا اعتبار، نہ عمل کا اعتبار، نہ مقام کا اعتبار، نہ حال کا اعتبار، کسی شئی کا اعتبار نہیں، یہاں تک کہ جو سب سے زیادہ ضروری چیز ہے، یعنی ایمان، اس کے بقاء کا بھی کیا اعتبار۔۔۔۔ کیا معلوم کس کے لئے کیا مقدر ہو چکا ہے" (سیرت اشرف ص۳۵۸)

یہ کہنے والے کون ہیں؟ اپنے وقت کے مشہور و مقبول حکیم الامت، غور کیجئے خدا کی سرکار کس قدر بے نیاز ہے، کہ صاحبِ فہم بھی کانپ کانپ رہے ہیں، اور سوچ رہے ہیں، پتہ نہیں، کل ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہو، اور کس منزل سے گذرنا پڑے؟ آگے فرماتے ہیں :۔

"اپنی کیسی ہی اچھی حالت ہو، ناز نہ کرے، اور دوسرے کی کیسی ہی بُری حالت ہو، اس پر ہرگز طعن نہ کرے، کیا خبر، کہ اپنی حالت اس سے بھی بدتر ہو جائے، انسان کس چیز پر ناز کرے جبکہ ہمارا علم و عمل، حال و مقام سب خدا کے قبضے میں ہے" (سیرت اشرف ص۳۵۹)

امت کے لئے لمحہ فکریہ

کتنی دل لگتی بات فرمائی ہے، کاش آج کا مسلمان بھی ان ہی جذبات کا حامل بن جاتا، تو پھر دیکھتا کہ اصلاح کا کام کس آسانی سے انجام پذیر ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ دنیا کس تیزی سے بدل جاتی ہے۔

ایک حکیم الامت کی نظر کتنی دوربیں تھی اور وہ مسلمانوں کے امراض پر کس خوبی سے انگلی رکھا کرتے تھے، جو لوگ اپنے معمولی حالات پر اتراتے ہیں انھیں اس طرح کی چیزوں کا خوب اچھی طرح مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ

ان کی غلط فہمی دور ہو۔

اپنے اعمال و اخلاق کا محاسبہ

حضرت تھانویؒ اخیر وقت تک اپنی اصلاح پر خود نظر رکھتے تھے اور اپنے اعمال کا محاسبہ فرماتے رہتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں :۔

"گو میں اعمال میں بہت کوتاہ ہوں لیکن الحمدللہ اپنی اصلاح سے غافل نہیں، ہمیشہ یہی ادھیڑ بن لگی رہتی ہے کہ فلاں حالت کی یہ اصلاح کرنی چاہیئے، فلاں حالت میں یہ تغیر کرنا چاہیئے، غرض کسی حالت میں قناعت نہیں" (سیرت اشرف ص۳۶۱)

اللہ اکبر! یہ ہے اپنی اصلاح کی دھن ایک مجدد وقت، اور حکیم الامت کو، پھر کیوں نہ سلوک کے درجات طے کر کے خدا کے مقبول بندے ہوتے مگر سوچیے آج ہم میں سے کتنے آدمیوں کا یہ حال ہے، کہ اس کی نظر اپنی اصلاح پر مرکوز رہتی ہو، اور اپنے عیوب تک نگاہ پہنچتی ہو؟

حضرت والا کا احساس اور اپنے عیوب پر نظر

حضرت تھانویؒ جیسا دلی کامل اپنے متعلق کہتا ہے :۔

"مجھ میں تو سراسر عیوب ہی عیوب بھرے پڑے ہیں..... اللہ تعالیٰ نے ستاری کی ہے کہ میرے عیوب کو پوشیدہ رکھا ہے،.....اگر کوئی میری تعریف کرتا ہے، تو اسی وقت دس عیب سامنے آجاتے ہیں"

(سیرت اشرف ص۳۶۱)

پھر ذرا ہم لوگ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچیں، ہم میں کوئی بھی

خوبی نہیں، مگر زندگی اس طرح گذارتے ہیں گویا جنت ہمارے نام لکھ دی گئی ہے، دوسروں کو نصیحت کرنے سے نہیں تھکتے، مگر خود حال یہ ہے کہ آخرت کی فکر سے آزاد ہیں، کاش ہم لوگ سوچتے کہ کل ہمیں بھی رب العزت کا سامنا کرنا ہے اور اپنے اعمال کا حساب و کتاب پیش کرنا ہے۔

حضرت کا اعلان عام حقوق العباد کے سلسلہ میں

حکیم الامت حضرت تھانوی کے یہاں معاملات کی جس قدر صفائی تھی اس کی مثال کمتر ملتی ہے، اپنے مریدوں کو بھی اس کی تاکید کر رکھی تھی اور وابستہ دوسرے لوگوں کو بھی، اور ساتھ ہی اپنی ذات کو بھی۔ حقوق العباد کا معاملہ ذرا سخت ہے بھی، کہ جب تک بندہ خود معاف نہ کردے معاف ہوتا ہی نہیں، اس کی اہمیت ہی کا یہ اثر تھا کہ آپ نے ۱۹۲۶ء میں ایک معذرت نامہ چھپوا کر تقسیم کرایا، اس میں تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ احقر، احقر، ارذل، ارذل، کام کا اکثف، نام کا اشرف، تمام ان حضرات کی خدمت میں، جن کا کوئی حق میرے ذمے ہو، خواہ وہ حق مالی ہو، جس کا احتمال ضعیف و قلیل ہے، اور خواہ وہ حق غیر مالی ہو، جیسے کسی کو ناحق کچھ کہہ لیا ہو، یا انتقام میں حد مساوات سے متجاوز ہو گیا ہو، یا کسی کو ناحق بدنی ایذاء پہنچائی ہو، اور ان سے غیر مالی حقوق کا احتمال قوی اور کثیر ہے، ان سب اہلِ حقوق کی خدمت میں دست بستہ، نہایت لجاجت و سماجت سے درخواست کرتا ہے، کہ ان حقوق کا خواہ مجھ سے عوض لے لیں، بشرطیکہ مدعی کا صدق

میرے دل کو لگ جائے، اور خواہ حسبۃً للہ معاف فرما دیں، میں ان دونوں صورتوں میں ان کا شکرگذار رہوں گا، کہ مجھ کو محاسبہ آخرت سے بری فرمایا، اور معافی کی صورت میں دعا بھی کرتا رہوں گا کہ میرے ساتھ مزید احسان فرمایا، خدا کے واسطے اہل حقوق میری حیات تک خواہ اپنے گذشتہ اور آئندہ حقوق معاف فرما دیں، خواہ شرعی طریق اور شرائط پر اس کا عوض بالمثل لے لیں، اور حیات کے بعد معاف ہی فرما دیں" (سیرت اشرف ص۲۸)

اسے پورے غور سے پڑھئے، اور اندازہ لگائیے، کہ حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ حقوق العباد سے اپنے آپ کو کس طرح پاک و صاف رکھنا چاہتے ہیں، اپنی ساری غلطیوں، زیادتیوں اور بھول چوک کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور یہ گوارا نہیں فرماتے کہ کسی کا کوئی حق مرنے کے بعد باقی رہ جائے، اور آخرت میں اس کی جوابدہی کرنی پڑے یا اس کی وجہ سے کوئی دینی نقصان برداشت کرنا پڑے، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے، بڑا سبق دے گئے، اور اپنے ماننے والوں کے لئے بڑی عمدہ مثال چھوڑ گئے۔

حقوق العباد کا احساس ختم ہوتا جا رہا ہے

لیکن ایمانداری سے بتائیے کہ کیا یہ احساس، اور حقوق العباد کا یہ اہتمام ہم میں بھی رہ گیا؟ ہمیں بھی اس کی فکر بے چین رکھتی ہے، کہ ہم سے کسی کو مالی یا غیر مالی تکلیف نہ پہنچی ہو، اور اگر کوئی زیادتی ہوگئی ہو، تو ہم اسے آرزو و منت سے معاف کرا لیں، اور اس معاف کرانے میں اگر تھوڑی زحمت ہو تو اسے بخوشی برداشت کر لیں۔

آئے دن دوسروں کے حقوق ہم غصب کرتے رہتے ہیں، زور، زبردستی سے غیروں کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں، مردم آزاری عام ہے اس سلسلہ میں

ہم خدا سے نہیں ڈرتے، کہ کل حساب کتاب دینا ہے، اپنے ایک پیسہ کے فائدہ کے لئے دوسروں کا ہزاروں کا نقصان اگر ہوجائے، تو ہمیں اس کی قطعًا پروا نہیں۔

خوب یاد رکھئے حقوق اللہ سے متعلق اگر کوئی جرم ہے، تو خدا اپنے فضل سے مٹا سکتا ہے مگر حقوق العباد اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں کرتے، حدیث میں آیا ہے کہ شہید جب راہِ حق میں جان دیتا ہے تو خون کے پہلے قطرہ کے ساتھ اس کے سارے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں، سوائے حقوق العباد کے، کہ یہ معاف نہیں ہوتا۔

اپنی طرف سے حقوق العباد کی معافی کا اعلان

جس طرح حضرت تھانویؒ دوسروں سے حقوق العباد کے سلسلہ میں لجاجت وسماجت سے معافی کے طالب ہیں، اس سے زیادہ فراخ حوصلگی سے خود بھی سبھوں کی خطا معاف کردینے کا اعلان فرماتے ہیں، اسی معذرت نامہ میں لکھتے ہیں:۔

"بہ امید عفو خداوندی میں اپنے حقوق غیر مالیہ جو کسی کے ذمہ ہوں، بلا استثنا سب کو معاف کرتا ہوں، اور حقوق مالیہ میں غیر مستطیع کو اجازت دیتا ہوں، کہ مجھ سے خاص طور پر گفتگو کرے، انشاءاللہ کوئی سبیل سہل نکال دوں گا، خواہ معافی، خواہ تخفیف۔ خواہ مہلت یا کچھ اور"

(سیرت اشرف صـــ)

یہ انسان کی بڑائی ہے کہ بلا درخواست معافی کا اعلان کردیا جاتا ہے، اور بشارت دیدی جاتی ہے، رہا حقوق مالیہ، تو کھلی بات ہے، اس کی معافی کا طریقہ اظہار کے بعد ہی ہوسکتا ہے، اور آدمی کو دیکھ کر ہی، کہ وہ کس

لائق ہے۔

کینہ وحسد سے دل کی پاکی

ایک ہمارا یہ زمانہ ہے کہ کچھ لوگ جب ناراض ہو جاتے ہیں، تو معافی کو اپنے لئے جرم سمجھتے ہیں اور دل میں کینہ کی زندگی بھر پرورش کرتے ہیں بظاہر دوست کی طرح ملتے ہیں، اور اندر اندر جلتے رہتے ہیں، اس طرح کے لوگوں کو مولانا کے اس عمل سے سبق لینا چاہیئے، اور دل کو کینوں سے پاک وصاف رکھنا چاہیئے۔

مخالفین اور موذیوں کی رعایت

حضرت تھانویؒ کی عالی حوصلگی ہی کا نتیجہ تھا کہ دشمنوں کی گالیاں سنتے رہے مگر کبھی ایک جملہ ان کے خلاف لکھنا تک برداشت نہیں تھا، احمد رضا خاں بریلوی کے ماننے والوں اور خود انھوں نے بہت کچھ مولانا کے خلاف لکھا، اذیتیں دیں، مگر برداشت کرتے رہے، خود لکھتے ہیں:۔

"میں اپنے مخالفین اور موذیوں کے جذبات کی بھی رعایت کرتا ہوں، کہ ان پر نیک نیتی کا بھی احتمال رکھتا ہوں، اور صبر تو ہر حال میں کرتا ہوں، احمد رضا خاں کے جواب میں کبھی ایک سطر بھی نہیں لکھی، کافر، خبیث، ملعون سب کچھ بنتا رہتا ہوں" (سیرت اشرف ص۲۶۵)

اسے کہتے ہیں سنجیدگی اور عالی ظرفی، نفس مسئلہ کی تحقیق تو ضروری ہے مگر کسی کی ذات کو نشانہ طعن وتشنیع بنانا، یہ کوئی اچھا کام نہیں ہے۔

اور ایک ہمارا یہ زمانہ ہے، کہ بیٹا نہ باپ کی برداشت کرتا ہے اور نہ شاگرد استاذ کی، کوئی ایک کہتا ہے تو دس سنتا ہے، تہذیب وشائستگی، متانت وسنجیدگی کا نام ونشان مٹتا جا رہا ہے۔

دوسروں کی تنقید سے فائدہ حاصل کرنا

حضرت تھانویؒ دوسروں کی تنقید وتنقیص سے گھبراتے نہیں تھے، بلکہ فرمایا کرتے تھے کہ ممکن ہے تنقید کرنے والے کی نیت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہو، اور اگر اس کی نیت ناحق رنج دینے کی ہو، تو اس نے اپنی عاقبت خراب کی، ہم کو صبر کا ثواب ملا، اور اسی کے ساتھ فرمایا کرتے :-

"نیز ایسے واقعات سے بعض اوقات اپنی کوتاہیوں پر نظر ہو کر اصلاح کی توفیق ہو جاتی ہے، اور اگر یہ بھی نہ ہو تو، کم از کم معتقدین کی عنایت سے جو عجب و کبر پیدا ہو گیا تھا، یا پیدا ہو سکتا تھا، اس سے ازالہ یا انسداد ہو جاتا ہے" (سیرت اشرف ص۲۶۵)

دیکھ رہے ہیں حکیم الامت کے فہم کا عالم، کتنا اونچا سوچا کرتے تھے، اور دشمنوں کے تیر و نشتر کو اپنے لئے کس طرح کارآمد ثابت کرتے تھے، یہ تھی عالمانہ اور مصلحانہ شان، بُرا ماننے اور بُرا کہنے کا آخر حاصل ہوتا بھی کیا، اس طریق کار میں کتنی بدگمانیوں سے نجات مل گئی، اور کتنی نیکیاں حصے میں آگئیں ۔

دوسروں کی نیتوں پر حملے مناسب نہیں

ایک ہمارا یہ دور ہے، کہ اچھی چیزوں کے بھی لوگ بُرے محمل تلاش کرتے ہیں، اور اپنے بہی خواہ اور دوستوں کی نیتوں پر حملے سے اجتناب نہیں کرتے اور پھر اسے بنیاد بنا کر وہ صلواتیں سناتے ہیں، کہ خدا حافظ، نہ تہذیب وتمدن کا لحاظ ہوتا ہے اور نہ علمی وقار کا ۔

باقی اپنے عیوب پر نظر، تو یہ تو عنقا رہے، یہ بھی عجیب زمانہ ہے کہ ہر شخص اپنے کو

مجموعۂ فضل و کمال سمجھتا ہے، بھول کر بھی نگاہ اپنی ان کوتاہیوں پر نہیں جاتی، جو باعث ذلت و رسوائی ہوا کرتی ہیں۔

وقت کی قدر و قیمت کا حال

حکیم الامت حضرت تھانویؒ اپنے اصول کے بہت پابند تھے، اس میں ذرا بھی ردّ و بدل یا ناغہ پسند نہیں فرماتے تھے جس کام کے لئے جو وقت متعین تھا، اس کی خلاف ورزی کسی حال میں آپ کو گوارا نہ تھی، حد یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے استاذ شیخ الہندؒ آپ کے مہمان ہوتے، آرام و راحت کے جو انتظامات کرنے چاہئیں، سب بڑی مستعدی سے کئے، اس سے ابھی فارغ ہوئے تھے کہ تصنیف کا وقت آگیا ایک طرف استاذ کی محبت و شفقت اور دوسری طرف اپنا دلی جذبۂ ادب و احترام مانع تھا، کہ جدا نہ ہوا جائے، ادھر برسوں کی پابندیٔ اوقات کی عادت مجبور کر رہی تھی کہ کچھ کام کر لیا جائے، کہ بے برکتی نہ ہونے پائے، آخر بصد ادب و احترام درخواست کی :۔

"حضرت میں اس وقت کچھ لکھا کرتا ہوں، اگر حضرت اجازت دیں تو کچھ دیر لکھ کر بعد کو حاضر ہو جاؤں" (سیرت اشرف ص۲۷)

حضرت شیخ الہندؒ اس مداومت کار پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔

"ضرور لکھو، میری وجہ سے اپنا حرج نہ کرو"

گو خود لکھتے ہیں کہ لکھنے میں جی نہیں لگا، مگر جو کچھ ہو سکا کیا، اور پھر جلد ہی حاضر ہو گیا۔

حضرت والا کی اسی پابندیٔ اوقات کا نتیجہ تھا کہ چھوٹی بڑی نو سو کتابیں آپ کے قلم سے نکلیں۔

افسوس ہم لوگوں میں آج یہ جذبہ باقی نہیں رہا، نہ وقت کی قدر رہی اور

نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان حدیثوں کا خیال جن میں آپ نے کام میں مداومت اور ہمیشگی کی تاکید فرمائی ہے۔

اخلاق واعمال اور تربیت پر گہری نظر

حکیم الامت حضرت تھانوی تربیت کا بے حد لحاظ فرمایا کرتے تھے اسی وجہ سے اپنے مریدوں اور عوام میں سخت مزاج مشہور تھے کسی کی ذرا سی بے عنوانی بھی پسند نہیں کرتے تھے، جہاں کسی سے ذرا سی تہذیب کے خلاف کوئی حرکت دیکھی فوراً تنبیہ فرمائی، اور پوری سختی سے نکتہ چینی شروع کردی، اور یہی وجہ تھی، کہ جو کچھ دنوں بھی حضرت اقدس کی خدمت میں رہ چکا ہے مہذب بن گیا۔ خود فرماتے ہیں:۔

"مجھے علم پڑھانے کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں ہے جس قدر تہذیب اخلاق اور دیانت پر نظر ہے۔ کیونکہ پڑھنے لکھنے کا تو ہر جگہ انتظام ہوتا ہے لیکن اخلاق کی طرف کسی کو خیال نہیں!..... جو لوگ میرے ذریعہ سے داخل سلسلہ ہیں، ان کے لئے اوراد و وظائف۔ اور اذکار و اشغال میں اتنا زیادہ اہتمام نہیں کرتا۔ جتنا زیادہ اخلاق کی درستی کا اہتمام کرتا ہوں، کیونکہ اخلاق کا سنوارنا زیادہ ضروری ہے، کوئی ذکر و شغل کرتا ہے: تو اس وقت تک اس کی قدر نہیں ہوتی، جب تک کہ اس کے اعمال درست نہ ہوں"

(سیرت اشرف ص۲۸۵)

حکیم الامت صحیح معنی میں قوم کے مزاج شناس تھے اور سمجھتے تھے کہ کہاں کمزوری زیادہ ہے، اور کس کمزوری کی اصلاح سے آدمی میں آدمیت پیدا ہوگی؟ واقعہ ہے کہ اس دور میں اخلاق واعمال کی درستی ہی ناپید ہے علم اتنا زیادہ ہے، مگر دیانت و امانت کا دور، دور پتہ نہیں، اذکار و اشغال بھی دشوار نہیں، مگر آدمی میں اعمال و اخلاق کی پاکیزگی، بڑوں کا ادب،

چھوٹوں پر شفقت اور نشیب و فراز کا خیال بے حد دشوار ہے، اور یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتوں کی کمی نہیں، مگر پھر بھی انسانیت کے سوتے خشک ہوتے جارہے ہیں، اور شیطنت ننگی ہوکر ناچ رہی ہے، اور کوئی نہیں جو اس سے کہدے، کہ یہ کیا ہورہا ہے ؟

کاش ! ہمارے دور کے ذمہ دار حضرات ان بنیادی چیزوں کی نگرانی رکھتے، اور اس پہلو کو مضبوط کرنے کی بے انتہا سعی کرتے، کہ اس دور میں تربیت کی خامی جو عام ہورہی ہے، اور اخلاق و اعمال کی پاکیزگی جو نزع کے عالم میں ہے اسے سانس لینے کا موقع ملتا اور اس طرح دنیا ایک دفعہ پھر باغ د بہار بنتی نظر آتی ۔

اصول کی پابندی اور سلیقہ پر نظر

حضرت تھانویؒ کے ہر کام میں سلیقہ تھا، اور اصول کی پابندی، اور دوسروں سے بھی اسی کا مطالبہ فرماتے تھے، ذرا، ذرا کا خیال رکھتے، خود فرماتے ہیں :۔

"گھر میں جو چیز اٹھاتا ہوں، بعد فراغت اس کو وہیں جاکر رکھتا ہوں جہاں وہ رکھی تھی، تاکہ جس نے رکھی ہے، وہ پریشان نہ ہو، اور اس کو ڈھونڈھنا نہ پڑے" (سیرت اشرف ص۲۸۸)

غور کیجئے تو دیکھنے میں یہ معمولی بات ہے، لیکن سچ پوچھئے تو بڑا مشکل کام ہے، اس قدر احتیاط کا عام لوگوں کو اب خیال کہاں رہتا ہے، جو چیز جہاں پائی رکھ دی، دوسروں کی پریشانی کا آج کسے کو لحاظ ہے، اپنا آرام تو سب کو مطلوب، لیکن دوسروں کے آرام و عافیت کا پاس عنقا ہے ۔

اپنے چھوٹوں کا پاس و لحاظ اور اس کا فائدہ

حضرت والا اپنے عزیزوں کا بھی لحاظ فرماتے تھے یعنی ان سے

اگر کسی کام کے لئے کہنا ہوتا، تو خود اٹھ کر ان کے پاس جاتے، اپنے پاس بلاتے نہیں، اور اگر کوئی اپنے کام سے حضرت کے پاس آتا۔ تو ضرورت ہونے پر بھی اسے کوئی حکم نہیں دیتے، بلکہ یہ جب اپنا کام کر کے اپنی جگہ پہنچ جاتے، تو خود تشریف لے جاتے اور فرماتے، یہ کام ہونا چاہئے، اور اس کی حکمت خود بیان فرماتے ہیں کہ :-

"مولوی شبیر علی سے بڑھ کر میرا زور کس پر ہوگا، میری اولاد ہیں، بھتیجے ہیں، ..... لیکن میں ان کی بھی اتنی رعایت کرتا ہوں کہ جب کبھی مجھ کو ان سے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ تو ان کو اپنے پاس نہیں بلاتا، کہ نہ معلوم کسی ضروری کام میں مشغول ہوں، بلکہ میں خود ہی اٹھ کر ان کے پاس جاتا ہوں" (سیرت اشرف ص۲۴۸)

اب اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا کس کو خیال ہوتا ہے، لیکن سوچئے یہ قاعدے کتنے عمدہ ہیں، اور زندگی کے انضباط کے لئے کس قدر ضروری، کیا ہمارے اس زمانہ کے نوجوان علماء ان کی اہمیت اپنے دلوں میں محسوس کریں گے۔

بدتہذیبی پر ڈانٹ

اسی طرح لکھا ہے کہ :-

"ایک بار حضرت کے مردانہ کمرے میں چند مہمان حضرت کے ساتھ کھانا کھانے کو پہنچے، وہاں حضرت کے ایک عزیز اپنے بچے کو لئے چارپائی پر لیٹے تھے، حضرت نے ترش رو ہو کر فرمایا، کہ یہ کیا بدتہذیبی ہے، کہ چند بھلے آدمی تو نیچے بیٹھے ہوں اور تم چارپائی پر لیٹے رہو" (سیرت اشرف ص۲۴۹)

اب اس زمانہ میں اس طرح کی چیزوں کی کوئی اہمیت ہی نہ رہی مگر کیونکر یقین دلایا جائے کہ حدیث میں ایک مستقل حصہ "کتاب الآداب" کے نام سے موجود ہے، اور بڑی کارآمد چیزیں اس میں درج ہیں، مگر عمل کے ارادہ سے کون اسے پڑھتا ہے۔

مریدوں کیلئے گراں قدر ھدایات

حضرت تھانویؒ کی نگاہ بہت گہری تھی، اور اس لئے کسی کام کی تہ تک بہت جلد پہنچ جاتے تھے، اپنی خانقاہ میں حضرت کی یہ ہدایت تھی خود لکھتے ہیں :-

"میں نے خانقاہ میں قاعدہ مقرر کر دیا ہے، کہ کسی سے دوستی بڑھاؤ نہ دشمنی پیدا کرو، نہ زیادہ مجلس آرائی کرو، کیونکہ یہ مجلس آرائی فساد کی جڑ ہے، لوگ سمجھتے ہیں، دین میں انتظام نہیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، ترمذی شریف کے باب الشمائل میں ہے "کان لہ عتاد فی کل شئی"، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر امر میں ایک ضابطہ تھا۔"

(سیرت اشرف ص۲۹)

اللہ اکبر! اہل اللہ کی نگاہ کس قدر دوربیں ہوتی ہے، یہ قاعدہ کتنا مفید اور عوام وخواص کے لئے کس قدر کارآمد ہے، بڑے پتہ کی بات فرما گئے، جو لوگ جماعتی زندگی گذارتے ہیں، وہ اس دستور کی پوری تائید کریں گے۔

کاش ارباب مدارس اس قاعدے پر اپنے اپنے طور پر عمل کرتے، تو سیکڑوں فتنے جو آئے دن اٹھتے رہتے ہیں سرے سے ختم ہو جائیں، اور بدباطنوں کو شکوہ کا ہرگز موقع نہ ملے، مجلس آرائی اور ٹولی بندی واقعہ ہے کہ فساد کا منبع ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس کے سمجھنے کی توفیق ارزانی فرمائیں۔

غلط رعایت حاصل کرنے سے انکار

حضرت کے یہاں قصاب دوسروں سے سستا گوشت دیا کرتا تھا

ایک روز بلا کر دریافت کیا، پہلے تو ٹالا، مگر حضرت نے جب جرح شروع کی، تو وہ ٹوٹ گیا اور اقرار کرلیا کہ چونکہ آپ بڑے خاندان سے ہیں، اس لئے رعایت سے دیا کرتا ہوں، پھر حضرت نے فرمایا کہ یہ حرام ہے، جو سب کو دیتے ہو، وہی بھاؤ دیا کرو۔

بات سننے میں معمولی ہے، مگر اندازہ لگایئے، ایک ناجائز تصرف کا کس طرح خیال آیا، اور آپ نے ان سے کس سختی سے ختم کرایا، اب تو کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر میری وجاہت کی وجہ سے رعایت کرتا ہے، تو یہ میرا حق ہے اور حلت وحرمت کا مسئلہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

حکیم الامت کے معمولات
اور ہمارے لئے سبق

حضرت تھانویؒ کے معمولات کی فہرست بھی ملاحظہ فرمائی جائے:۔

"نماز خود پڑھایا کرتے تھے ..... اگر کسی مجبوری کی وجہ سے مسجد آنے میں دیر ہو جاتی، تو اصرار کر کے امام سے نماز پڑھوا دیتے، اور خود وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر بعد میں مقتدیوں میں شامل ہو جاتے، ..... بعد نماز فجر سب سے پہلے خانقاہ میں مقیم طالبین وسالکین کا جو گروہ ذکر وشغل میں مشغول رہتا ان کے کام کی طرف متوجہ ہوتے، یہ لوگ اپنے اپنے باطنی حالات لکھ کر سہ دری میں لگے ہوئے لیٹر بکس میں ڈال دیتے، بعد نماز فجر حضرت خود اپنے ہاتھ سے اسے کھولتے، ایک ایک پرچہ پڑھ کر ہر ایک کے مناسب حال جواب اور ہدایتیں لکھ کر مسجد کے منبر پر رکھوا دیتے، ..... اس سے فارغ ہو کر کلام مجید کی تلاوت فرماتے، اکثر چھوٹی حمائل لے کر سیر وہوا خوری کے لئے آبادی سے باہر نکل جاتے، چاشت سے لے کر دوپہر تک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے مجلس خاص منعقد فرماتے، ..... ۱۱ بجے کے بعد یہ کہہ کر

اجازت چاہتے، ذرا گھر ہو آؤں، اور ڈاک دیکھتے، کھانا کھانے اور تھوڑی دیر سستانے کے لئے زنان خانے میں تشریف لے جاتے ....
سوا دو گھنٹے بعد ظہر کی اذان ہوتی، آپ واپس تشریف لاتے، نماز سے فارغ ہوکر سہ دری میں آبیٹھتے، اسی وقت سے مجلس عام شروع ہوجاتی جو عصر کی اذان تک رہتی، اذان ہوتے ہی برخاست ہوجاتی، نماز عصر سے فارغ ہوکر آپ واپس گھر تشریف لے جاتے، اگر کسی سے کوئی خاص بات کرنی ہوتی، یا کسی کو بیعت کرنا ہوتا، تو اس کے لئے مغرب کے بعد بھی باہر تشریف لاتے۔" (سیرت اشرف

اسے غور سے پڑھئے، اور اندازہ لگایئے، کہ حضرت والا کے نزدیک وقت کی کتنی قیمت تھی، اور اسے کس قدر اہتمام سے نیک کاموں میں خرچ فرماتے تھے، پھر اس میں اپنی، گھر کی، مہمانوں کی، اور سالکین سب کی رعایت ملحوظ ہوتی، عوام و خواص میں کوئی بھی آپ کے فیض سے محروم نہ رہتا، سب بقدر ظرف فیضیاب ہوتے، رات کا حصہ عبادت و ریاضت اور گھر والوں کے لئے مخصوص ہوتا۔

وقت کی قدر و قیمت اور اس کا ثمرہ

جب وقت کی قدر و قیمت تھی، تو برکت بھی خوب ہوئی، کوئی لمحہ ضائع نہ گیا، ہزاروں چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئیں، ہزاروں سالکین کی تربیت ہوئی اور ہزاروں عام و خاص آپ کے ملفوظات سے مستفیض ہوئے۔ اور خدا بھلا کرے ان لوگوں کا جنہوں نے حضرت کی ایک ایک چیز کو قلمبند کر دیا، اور یہیں تک نہیں بلکہ اسے شائع بھی کر دیا، جس سے لاکھوں، کروڑوں مسلمانوں اور دوسرے لوگوں نے استفادہ کیا، اور پھر دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔
آج کس سے کہا جائے، کہ وقت، ایک قیمتی چیز ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ بڑی

نعمت ہے، اس کی قدر ہر ایک پر ضروری ہے لایعنی باتوں میں ضائع کرنے کے بجائے، اسے مفید و کار آمد چیزوں پر صرف کیا جائے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا، پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو، (۱) تندرستی کو بیماری سے پہلے (۲) فراغت کو مشغولی سے پہلے، (۳) جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، (۴) استغناء و دولت کو محتاجی سے پہلے، (۵) اور زندگی کو موت سے پہلے۔

کاش! آج کا انسان بالخصوص مسلمان رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی قدر کرتا، اور اسے اپنی زندگی کا محور بناتا۔

غیرت و خودداری کا غلبہ

یوں تو حضرت تھانویؒ درشت خو اور سخت مزاج مشہور کر دیئے گئے تھے، مگر حقیقت حال یہ نہیں تھی، سب کچھ برداشت کر لیتے مگر اپنی غیرت و خودداری کا خون ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے، خود فرمایا کرتے تھے:-

"میری عادت نہیں کہ خود کسی معاملہ میں دخل دوں، میرے اوپر غیرت کا غلبہ زیادہ ہے، اس لئے خود کسی معاملہ میں دخل دینے کو جی نہیں چاہتا، یہ خیال ہوتا ہے کہ میرا تو کام نہیں، میں کیوں دخل دوں، کسی کو لاکھ دفعہ غرض پڑے، اپنی اصلاح کا طریقہ دریافت کرے، ..... ہاں اگر کسی وقت شفقت کا غلبہ ہوتا ہے، تو میں خود بھی نرمی سے کہہ دیتا ہوں"

(سیرت اشرف)

غور کریں یہ کتنا عمدہ اصول تھا، جب کوئی خود اپنی خامی محسوس کر کے کسی کے پاس مشورہ کے لئے آئے۔ اس وقت جتنی بات مؤثر ہوسکتی ہے بذات خود بے بلائے بولنے سے نہیں ہوتی، یہ الگ بات ہے کہ انسان پر کبھی بہی خواہی کا جذبہ غالب آجائے، تو کہدے گو تجربہ یہی ہے کہ یہ طریقہ کچھ زیادہ

کامیاب نہیں، جو لوگ دوسروں کے معاملات میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑاتے رہتے ہیں ان کو سوچنا چاہئے کہ یہ طریقہ اچھا ہے یا باعزت بن کر زندگی گزارنا۔

اپنی عاجزی کا اعتراف

ایک دفعہ کچھ لوگوں نے ناراض ہو کر کہا کہ ہم مولانا کو مولوی نہیں کہیں گے اور نہ سمجھیں گے، حضرت والا تک جب یہ خبر پہنچی، تو آپ نے بڑی بے نیازی سے فرمایا :۔

"بھلا میں نے کب کہا کہ مجھے مولوی کہو، میں تو بقسم کہتا ہوں کہ میں خود بھی اپنے علم کا قائل نہیں، یہاں تک کہ جب کوئی طالب علم آجاتا ہے تو واللہ مجھے ڈر لگتا ہے، کہ کہیں میری قلعی نہ کھل جائے" (سیرت اشرف ص۔)

یہ تھا جذبہ ایک مجدد وقت عالم کا، اپنے متعلق کم علمی کا جتنا یقین تھا علم کا نہیں تھا، یہ بے نفسی آج کہاں نظر آتی ہے، اب تو لوگ بقلم خود اپنے نام کے ساتھ حضرت استاذ الاساتذہ تک لکھنے سے نہیں شرماتے، اگر کسی نے مولانا کی جگہ مولوی کہدیا تو پیشانی پر بل پڑنے لگتے ہیں علم وعمل سے مولانا نہیں معلوم ہوتے، تو لمبے چوغے ڈال کر عربی رومال لپیٹ کر اپنے کو مولانا ظاہر کرنے کی سعی کی جاتی ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سب ایسے ہی ہیں، مگر ایسوں کی اس دور میں کمی بھی نہیں ۔

اپنے قول پر اصرار نہیں

حضرت تھانویؒ کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ جو زبان سے نکل گیا، خواہ غلط ہو یا صحیح اسے منوانے کی کوشش نہیں کرتے، جونہی کوئی بات دلیل سے اس کے خلاف ثابت ہو جاتی، فوراً مان لیتے، خود فرمایا کرتے تھے :۔

"میرا کبھی یہ قصد نہیں ہوتا کہ کسی کو گفتگو میں مغلوب کر دوں، یا وہ میری

موافقت کرے۔ بلکہ قصد یہ ہوتا ہے کہ خدا کرے، یہ بھی سمجھیں اور میں بھی سمجھوں، اور حق بات معلوم ہو جائے۔" (سیرت اشرف ص۔۔)

اب یہ اخلاص عام طور پر کہاں باقی رہا، اب تو دوسروں کو مغلوب ہی کرنا عموماً مقصد ہوا کرتا ہے، خواہ بات غلط ہی کیوں نہ ہو، مگر اس قوت سے اسے ادا کرنے کی سعی ہوگی، کہ دوسرا مرعوب ہو جائے، خواہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہیں آئے۔

حضرت تھانویؒ کے دل میں جو بات آتی، صاف صاف فرما دیتے تصنع تکلف بالکل نہیں ہوتا تھا۔

عزت نفس پر نظر اور صاف گوئی

ایک دفعہ کسی نے گالیاں لکھ بھیجیں، بعد میں معافی کا خط لکھا اور اپنی اصلاح کی درخواست کی، حضرت تھانویؒ نے اس کا خط پڑھ کر لوگوں سے فرمایا:۔

"اب بہلا پھسلا کر فیض حاصل کرنا چاہتے ہیں، میں انتقام نہیں لیتا، مگر رنج کی بات سے رنج ہوتا ہی ہے، اور ہم لوگوں کی تو حقیقت ہی کیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت وحشیؓ کے ساتھ کیا معاملہ کیا، یہ فرمایا کہ عمر بھر صورت نہ دکھانا، مگر ہم سے کہا جاتا ہے، کہ صاحب معاف کر دینا چاہئے، ہم ہیں کہ گالیاں بھی کھائیں اور چاپلوسی بھی کریں۔"

(سیرت اشرف ص۔۔)

یہ تھی صاف گوئی، اور دل کی آواز، جسے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جوں کا توں زبان سے ادا کیا۔ کوئی بات چھپائی نہیں، دل میں کچھ اور زبان پر کچھ، یہ منافقت ہے، جسے حضرت والا جیسا شخص کب پسند کر سکتا تھا۔

٭ ٭ ٭

یہ دور منافقت کا ہے اس سے بچنا ضروری ہے

اب ہمارے اس دور میں یہ صاف گوئی کہاں باقی رہی، یہ دور منافقت کا دور ہے، جسے دیکھئے کوئی مصلحت کے نام پر، اور کوئی سیاست کے نام پر جھوٹ کے پل باندھ رہا ہے، اور خوش ہو رہا ہے، جو بات دل میں ہے زبان پر لاتے جان نکلتی ہے اور پیٹھ پیچھے بُرا کہتے زبان نہیں تھکتی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس منافقت سے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

حدود اور سائل کے مصالح پر نظر

اس صاف گوئی کا نتیجہ تھا کہ خود فرمایا کرتے تھے کہ:-

"منجملہ میری اور بے مروتیوں کے ایک بے مروتی یہ ہے کہ میں جواب میں سائل کی خواہش کی رعایت نہیں کرتا، بلکہ حدود اور سائل کے مصالح کی رعایت کرتا ہوں" (سیرت اشرف ص ـــ)

کتنی قیمتی بات آپ نے فرمائی، ایسی مروّت ہی کیا جس میں حدود کا لحاظ نہ رہے، منھ دیکھی بات اچھی نہیں ہوتی، اس سے آدمی کا بھی نقصان ہوتا ہے، خواہ اسے احساس ہو، یا نہ ہو۔

ایک ہمارا یہ زمانہ ہے، یہاں لوگ مروّت کے پیچھے اپنا ایمان تک گرو رکھنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، اور جو کچھ نہ کرنا چاہیئے، سب کر ڈالتے ہیں، خواہ اس کی وجہ سے وہ برباد ہی کیوں نہ ہو جائے۔

حضرت تھانویؒ میں مساوات کا جذبہ بھی بطور اتم پایا جاتا تھا، ذہن تو بلا کا تھا ہی۔

❊ ❊ ❊

بیویوں میں عدل ومساوات کا عجیب واقعہ

ایک دن ایسا ہوا کہ کوئی خوبصورت سا کپڑا آگیا، نوکر کو بازار بھیجا، اس جیسا کپڑا تلاش کرلائے، مگر اس بے چارے کو اس میں کامیابی نہ ہوئی، پھر حضرت نے یہ کیا:۔

"وہی کپڑا ملازم سے لے کر اسے دو برابر حصوں میں چیر دیا، اور فرمایا ہر ایک ڈیوڑھی پر ایک ایک ٹکڑا دے دو، اس وقت ایک صاحب سے نہ رہا گیا، اور عرض کیا کہ" یہ تو اب کسی کام کا نہ رہا، اگر فقط مساوات ہی کا خیال تھا، تو دوسرے گھر اس کپڑے کی قیمت بھیجدی جاتی، حضرت نے فرمایا آپ کا خیال صحیح نہیں ہے، اس طرح مساوات قائم نہ رہتی، مساوات ہر نوع میں لازم ہے: تاکہ کسی کے دل میں عدم مساوات کا خفیف سا شائبہ بھی پیدا نہ ہو۔ (سیرت اشرف ص)

اب اس مساوات کا اہتمام کہاں رہا؟ یہ دور افراط وتفریط اور ظلم وجور کا ہے. خواہ عالم ہو، یا غیر عالم، اصول وشرع کو نہیں دیکھتا، جس کی طرف دل جھک گیا. بس اسی طرف چل پڑا، خواہ کسی کو دلی تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔

اب ایسے لوگ کہاں نظر آتے ہیں، پرانے علماء اٹھتے جارہے ہیں، نئے جوان کی جگہ لے رہے ہیں، وہ اخلاص ووفا کی دولت سے محروم. نام ونمود کے مریض اور دیانت وامانت سے کوسوں دور نظر آتے ہیں۔

اتباع سنت اور شریعت پر عمل کا اہتمام

حضرت تھانوی ؒ ایک ایک کام میں سنت کے پیرو تھے، اسلام میں

گھروں میں داخلہ کا مخصوص قانون ہے، جسے اصطلاح میں استیذان کہتے ہیں، اس سلسلہ میں لکھا ہے :-

"حضرت کا اپنے گھروں میں جانے کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ پہلے کنڈی کھٹکھٹاتے پھر کسی کا نام لے کر پکارتے، اور جب تک اندر سے بلایا نہ جاتا، انتظار فرماتے رہتے، اگر کوئی بچہ بلا لیتا، تو اس کے بلانے کو کافی نہ سمجھتے جب تک کوئی بڑا نہ بلاتا، اندر تشریف نہ لے جاتے" (سیرت اشرف ص ـــ)

اب اس قانون پر عام طور پر کہاں عمل رہا، حالانکہ بے حد مفید اور ضروری ہے، ایک تو اتنی زحمت کوئی برداشت نہیں کرتا، اگر بہت ہوا، کنڈی ہلائی آواز آئی اور گھس پڑے، مگر قاعدہ وہی ہے، جس پر حضرت عمل کیا کرتے تھے کاش مسلمان اِن اسلامی قوانین پر عمل کرنے کی پوری سعی کرتے، پھر دیکھتے کیا برکت ہوتی ہے۔

ہر کام میں اعتدال اور اس کی اہمیت

حضرت کے یہاں ہر کام میں اعتدال تھا، لکھا ہے :-

"حضرت کے یہاں دنیاوی حکام، رؤسا، عہدہ داروں کے ساتھ معاملت میں بھی خاص اعتدال ملحوظ رکھا جاتا تھا، یعنی نہ ان لوگوں کی طرف گرنا... اور نہ ان سے اپنے آپ کو بالکل کھینچے رکھنا جیسا کہ بعض غیر محقق نے تقویٰ و درویشی کا مقتضا سمجھ لیا ہے" (سیرت اشرف ص ـــ)

اللہ تعالیٰ حضرت کی قبر کو اپنی بے پناہ رحمتوں سے نوازے، زندگی کے ہر پہلو میں سبق آموز واقعہ موجود ہے، یہ معمول کتنا عمدہ اور برموقع تھا، ایک ہمارا یہ دور ہے کہ افراط و تفریط کے سوا اعتدال کا نام و نشان نہیں، اب رؤسا اور سرمایہ داروں سے کھینچے رہنے کی بات تو تقریباً ختم ہو چکی ہے، مگر ان کی جھکنے اور گرنے کی بات بہت آگے پہنچ چکی ہے، بعض علماء کا دامن بھی

اس افراط و تفریط سے پاک نہیں، وہ مالداروں کی خاطر مدارات میں حدود سے آگے نکل جاتے ہیں ۔

کبر و غرور کے شائبہ سے خوف

حضرت تھانویؒ نے ایک دفعہ فرمایا :-

"جب میں کسی کا ہدیہ رد کرتا ہوں، تو گو وجہ کے ساتھ ہو، لیکن پھر بھی ڈرتا ہوں، کیونکہ غور کرنے سے کسی قدر شک کبر کا ہوتا ہے، جس سے نہایت خوف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں" (سیرت اشرف صـــ)

غور کیجئے اکابر ذرا ذرا سی بات کا کس قدر خیال کیا کرتے تھے، ایک ہم ہیں کہ کھل کر دینی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ذرہ برابر دل میں خوف خدا پیدا نہیں ہوتا، ہر ایک مسلمان کا شیوہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے اعمال و اخلاق کا جائزہ لیتا رہے، اور جہاں اپنی کمزوری یا خامی نظر آئے، فوراً اس کی اصلاح کرے ۔

تواضع و انکساری

ایک دفعہ آپ نے فرمایا :-

"میرے اندر نہ علم ہے، نہ عمل ہے۔ نہ کوئی کمال ہے، لیکن اپنے خلو کا اعتقاد ہے، اللہ تعالیٰ بس اس پر فضل فرمائے گا" (سیرت اشرف صـــ)

کہاں تو وہ بات تھی، اور کہاں یہ ہے کہ کچھ نہ ہونے کے باوجود کمال ہی کمال کا دھوکہ ہے، اپنی بڑائی، اور خود ستائی سے چھٹ نہیں، پھر سوچئے فضلِ الٰہی کی کیا صورت ہوگی ،

کیا اربابِ فضل و کمال اس مسئلہ پر غور فرمائیں گے کہ پڑھا لکھا طبقہ کدھر جا رہا ہے، اور مستقبل میں اس کا کیا انجام ہونے والا ہے ۔

سبھوں کو مصافحہ کی اجازت اور اس کی حکمت

حضرت تھانویؒ عوام و خواص میں جیسے مقبول تھے، ظاہر ہے جہاں کہیں پہنچتے مجمع مصافحہ کے لئے ٹوٹ پڑتا، آپ سب کو اس کی اجازت مرحمت فرمادیتے، اس کی وجہ خود بیان کی، فرمایا :-

"میں مصافحہ کو اپنے لئے ایک بڑی سعادت سمجھتا ہوں، کہ ایک ناکارہ شخص کے اتنے مسلمان محبت کرنے والے ہیں، اور اس نیت سے مصافحہ کی اجازت دیتا ہوں کہ اتنے محبت کرنے والوں میں کوئی تو خدا کا مقبول و مرحوم بندہ ہوگا، جو مجھے تکلیف میں دیکھ کر حق تعالیٰ سے میری سفارش کرے گا" (سیرت اشرف ص ـــ)

سچ ہے بڑوں کی بڑی باتیں، سوچنے کا بھی کیا انداز تھا، اپنی بڑائی ذہن میں نہیں آئی، اپنی مقبولیت و ہر دلعزیزی کا وسوسہ نہیں کھٹکا، اور ذہن میں بات بھی آئی تو یہ کہ خدا کا کوئی مقبول بندہ مجھ پر ترس کھا کر دعا کرنے والا بن جائے، اسے کہتے ہیں خوف خدا کا احساس۔

ایک ہمارا یہ دور ہے کہ خود کو آدمی جنیدؒ و شبلیؒ سمجھنے لگتا ہے، ہر قدم پر اس کو اپنی بڑائی کا دھوکہ ہونے لگتا ہے، اور یہ ذہن نشین رہتا ہے کہ لوگ میرے مصافحہ سے فیضیاب ہو رہے ہیں، میں بڑا ولی کامل، خدا رسیدہ بزرگ ہوں۔ ؏ ببیں تفاوت رہ از کجا تا بکجا۔

اپنے اعمال کا محاسبہ اور کمزوری پر نظر

اور یہی وجہ تھی کہ آپ ہر آن اپنے اعمال کا محاسبہ فرمایا کرتے تھے، اور جہاں ذرا خامی نظر آئی، اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوجایا کرتے تھے ـــ خود

فرمایا کرتے تھے :۔

«گو میں اعمال میں بہت کوتاہ ہوں، لیکن الحمدللہ اپنی اصلاح سے غافل نہیں، ہمیشہ یہی ادھیڑ بن لگی رہتی ہے کہ فلاں حالت کی یہ اصلاح کرنی چاہئے فلاں حالت میں یہ تغیر کرنا چاہئے، غرض کسی حالت پر قناعت نہیں، اور گو میں نجات کو اعمال پر منحصر نہیں سمجھتا، محض فضل پر سمجھتا ہوں، لیکن بندہ کے ذمہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ اس کے اوامر کو بجالائے، اور نواہی سے اجتناب کرے، اس لئے مجھ کو اپنے اعمال کی کوتاہی پر سخت ندامت ہے۔ اور ہمیشہ اپنی اصلاح کی فکر لگی رہتی ہے" (سیرت اشرف ص ۔)

یہ ہے ایک حکیم الامت کا انداز فکر، غور سے پڑھیں کہ اپنی اصلاح کا مسئلہ بڑوں کی نگاہ میں کس قدر اہم ہے، اور ان کو اس سلسلہ میں کتنی فکر ہے پھر اسی کے ساتھ ہم اپنے حالات کا جائزہ لیں، اور گریبان میں منھ ڈال کر سوچیں کہ اس سلسلہ میں ہمارا کیا حال ہے، رات دن لغویات میں مبتلا رہتے اور شریعت کے خلاف امور کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں مگر احساس تک نہیں ہوتا کبھی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ اپنے اعمال و اخلاق کا محاسبہ کریں، اور دیکھیں ہم کہاں اور کدھر جا رہے ہیں، زندگی کے اس طویل سفر میں ہم سے کتنی لغزشیں ہوئیں، کتنی بے عنوانیاں عمل میں آئیں اور کیسے کیسے ناجائز کاموں میں ہم مبتلا ہوئے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ جب تک انسان اپنی اصلاح کی فکر نہیں کرتا ہے اپنے ایک ایک کام کا جائزہ نہیں لیتا، خامیوں اور کمزوریوں کی اصلاح نہیں ہو سکتی ہے۔ آج حال یہ ہے کہ جب کبھی دوسرا توجہ دلاتا ہے تو ہم ضد پر اتر آتے ہیں، اور اپنے گناہوں کے اعتراف سے کتراتے ہیں، حالانکہ یہ سرے سے غلط ہے۔

جب تک اپنے اعمال واخلاق اورعقائد ومعاملات کے اصلاح کی دھن نہیں پیدا ہو جاتی، کوئی کام نہیں چل سکتا، اور نہ صحیح معنی میں اصلاح ہو سکتی ہے، کاش یہ احساس ہمارے اندر جاگ اٹھے۔

ہر کام شروع کرنے کے بعد اس کی تکمیل میں محنت

حضرت تھانویؒ دھن کے بڑے پکے تھے جس کام میں لگ جاتے پھر جب تک اسے انجام تک پہنچا نہ لیتے، چین نہیں آتا، اور اسی کا صدقہ ہے کہ اتنی تالیفات وتصنیفات وجود میں آئیں، لکھا ہے:۔

"جب آپ کوئی کام شروع کر بیٹھتے، تو جب تک اس سے بالکل فارغ نہ ہو جاتے، چین ہی نہ آتا، رات دن، وقت بے وقت اسی کی تکمیل کی دھن میں لگے رہتے، چنانچہ جب کلید مثنوی ختم ہونے کے قریب آئی، تو اس سے فراغت حاصل کرنے کا اس شدت سے تقاضا پیدا ہوا کہ آخر دن اسے جب لکھنے بیٹھے، تو دوسری صبح کر دی، اور رات بھر ایک منٹ نہ سوئے" (سیرت اشرف ص ــ)

اسے کہتے ہیں انہماک اور کام سے دلچسپی، جب لگ گئے تو جان ودل سے لگ گئے، اور جب تک کام انجام تک نہیں پہنچا، آرام واطمینان کا نام نہ لیا، رات رات بھر جاگنا کوئی معمولی بات نہیں، یہ دھن اور لگن کا صدقہ ہے، اگر یہ دھن نہ ہوتی تو آج ہزاروں کتاب کے مصنف آپ شمار نہ ہوتے، اور جس قدر کام آپ نے کیا، ان میں سے کچھ نہ ہوتا۔

علماء وطلبہ میں لگن کی کمی

عام طلبہ اور علماء میں جب سے یہ لگن باقی نہیں رہی، اور آرام طلبی آئی،

معاملہ برعکس ہو گیا، زبانی جمع خرچ کی کمی نہیں، مگر اصلاح اور عمل سے بالکل کورے ہیں، ان کا رات دن چوبیس گھنٹے کا مشغلہ غیبت، چغل خوری اور تنقید و تبصرے کے سوا کچھ نہیں رہا، جس کو دیکھئے، جہاں دیکھئے، بے کار باتوں میں مصروف ہے، مدرس ہے تو مطالعہ میں محنت نہیں کرتا ہے، مصنف ہے تو تحقیق وتلاش کی زحمت برداشت نہیں کرتا ہے، اور طالب علم ہے تو محنت و مشقت سے جی چراتا ہے، اسکیمیں خوب بنائی جائیں گی، پروگرام بہت خوبصورت اور جاذب نظر بیان کئے جائیں گے، لیکن عمل کی دنیا میں صفر کے سوا کچھ نہیں، اگرچہ سارے کے سارے ایسے نہیں ہیں بلکہ بہت سے باذوق اور بے حد محنتی بھی ہیں ۔

یہاں پہنچ کر جی چاہتا ہے ہم اپنے طلبہ کرام کو توجہ دلائیں کہ اپنے اندر آپ لکھنے پڑھنے کی دھن ابھی سے پیدا کرلیں، جو طلبہ محنت نہیں کرتے، وہ آگے چل کر پچتاتے ہیں، اپنی زندگی میں سیکڑوں طلبہ کا تجربہ ہے کہ باتیں بڑی لمبی چوڑی اور چکنی چپڑی کریں گے، مگر جب محنت کا وقت آئے گا حیلے بہانے تراشنے شروع کردیں گے ۔

کیا میں اپنے ان مخصوص احباب سے درخواست کرسکتا ہوں، جو مجھ سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہیں کہ آپ جب کسی علمی کام کا ارادہ کرکے لگ جائیں تو پھر پیچھے نہ ہٹیں، کہ کام کو ادھورا چھوڑنا اچھے آدمیوں کا شعار نہیں، اور ایسا آدمی دنیا میں کچھ نہیں کرسکتا ۔

ہندوستان میں ہر سال سیکڑوں طلبہ درسیات ختم کرتے ہیں، مگر یہ کہاں کھو جاتے ہیں، پتہ تک نہیں ملتا، اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہوسکتی ہے کہ یہ اپنے آپ کو پہچانتے نہیں ہیں، اور مقصد سے غافل ہیں ۔

ہر آن علم میں غور و فکر کا مشغلہ

حضرت تھانوی ؒ نے اپنی زندگی میں تصنیفات کا جو بہترین ذخیرہ

مرتب کردیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی وقت غور و فکر سے خالی نہیں ہوتے تھے، چنانچہ لکھا ہے :۔

"آپ کی عادت تھی کہ اکثر کاغذ پنسل اپنے ساتھ رکھتے تھے، جس وقت کوئی مضمون ذہن میں آتا، اسے فوراً لکھ لیتے، بلکہ بسا اوقات رات کو بھی کاغذ پنسل تکیہ کے نیچے رکھ لیتے، تاکہ اگر رات کو بھی کوئی مضمون ذہن میں آجائے، تو روشنی کر کے اس کے متعلق یادداشت لکھ لی جائے اسی طرح سفر و حضر میں کہیں کوئی بات قابلِ اصلاح دیکھتے، تو اسے نوٹ فرمالیا کرتے" (سیرت اشرف ص۔)

دیکھ رہے ہیں، لکھنے پڑھنے اور اصلاح کا اہتمام کس قدر ہے کہ ایک لمحہ غافل نہیں ہوتے، وقت کے وقت سارا کام کرتے جارہے ہیں اسے کہتے ہیں دھن اور محنت، آپ نے جب ایسی محنت برداشت کی، تو ہزاروں کتابوں کے مصنف بنے، اور زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس میں اصلاح کی ضرورت ہو، اور اس عنوان پر آپ کا کوئی چھوٹا یا بڑا رسالہ موجود نہ ہو۔

ہمارے موجودہ نوجوان علماء خوب غور سے اس سبق آموز واقعہ کا مطالعہ کریں، اور سوچیں کیا یہی اہتمام و انتظام ان میں بھی باقی رہا؟ آہ ہمیں بیہودہ باتوں سے چھٹی کہاں ملتی ہے کہ لکھنے پڑھنے میں اس قدر انہماک کا موقع میسر آسکے، کاش ہمارا وہ طبقہ جو علم و عمل سے کنارہ کش ہوتا جارہا ہے اور لغویات میں مبتلا ہے ایک مرتبہ جاگ اٹھتا۔

کام میں تاخیر پسند نہیں

حضرت تھانویؒ میں یہ بات بھی تھی کہ کام جو سامنے آجاتا، اسے ٹالتے نہیں تھے، وقت کے وقت انجام دیتے، غفلت کی وہاں کوئی گنجائش ہی

نہیں تھی، خود فرمایا کرتے تھے :۔

"جس وقت جو کام پیش آتا ہے، میں اس کو فوراً کر ڈالتا ہوں، دوسرے وقت پر نہیں ٹالتا، گو اس میں اس وقت تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے؛ لیکن بعد فراغ بس بالکل بے فکری ہو جاتی ہے، اور بڑی راحت ہوتی ہے۔ ورنہ ٹالنے سے اکثر کام نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی ہیں، تو جتنی دیر فکر دامنگیر رہتی ہے اتنی دیر کلفت بھی رہتی ہے۔" (سیرت اشرف ص ۔)

جن حضرات کو یہ کرنے کا تجربہ ہے، وہ اندازہ لگا سکتے ہیں، آپ نے کتنی نپی تلی بات کہی۔ اور کس قدر کارآمد، ہمارے دور کے طلبہ اور علماء دونوں ہی آنکھیں کھول کر پڑھیں جن میں غفلت اور کاہلی سرایت کرتی جا رہی ہے اپنا خیال ہے کہ روئے زمین پر شاید کاہلی میں مجموعی اعتبار سے اونچا نمبر اسی طبقہ کا ہوگا، چستی اور جفاکشی کا اس طبقہ میں کال پڑتا جا رہا ہے، ایک منٹ کا کام ان کے یہاں مہینوں میں جا کر انجام پائے گا، الا ماشاء اللہ۔ یوں چست اور جفاکش علماء کی بھی کمی نہیں، مگر ان کی تعداد برائے نام نکلے گی۔

کام کی تکمیل میں انہماک ضروری ہے

یہ بات ذہن نشین کر لی جائے، کہ سستی کے ساتھ کوئی زندگی کی بھاگ دوڑ میں کامیاب نہیں ہو سکتا، اور نہ کوئی میدان سر کر سکتا ہے۔

حضرت تھانویؒ کا دستور تھا کہ :۔

"جب بھی تصنیف کا کام شروع فرماتے، شرح صدر کے لئے دعا مانگتے اور اگر کسی وقت کسی وجہ سے کسی امر میں شرح صدر نہ ہوتا، تو صاف لکھ دیتے، کہ اس سے بہتر بات اگر کہیں مل جائے، تو اسی کو اختیار کیا جائے۔" (سیرت اشرف ص ۔)

مصنفین خوب غور سے اس وقیع طریقہ کو ذہن نشیں کرلیں، کہ تصنیف کی جان ہے، جس مصنف میں یہ خلوص نہیں ہوتا، ضد اور ہٹ سے علمی کام انجام پذیر نہیں ہوسکتا ہے، اور یہی وجہ تھی کہ جو کچھ آپ لکھتے، اس کی پوری تحقیق کر کے لکھتے، اور اس سلسلہ میں کافی محنت اور مشقت برداشت کرتے۔

تحقیق کا اہتمام

لکھا ہے :-

"تصنیف کے دوران میں تحقیق کا اتنا اہتمام فرماتے، .... کہ بہت ہی مختصر سی بات معلوم کرنے کے لئے بعض کتب دوسرے مقامات سے بڑے اہتمام اور خرچ سے منگواتے، اور ان کی مدد سے ذرا سی عبارت لکھ کر فوراً واپس فرماتے" (سیرت اشرف ص)

واقعہ ہے کہ جب تک یہ اہتمام نہ کیا جائے، مصنف کامیاب نہیں ہوسکتا، اندازے سے کوئی بات کتابوں میں لکھ دینا، ذمہ داری کے خلاف چیز ہے، ایسے مصنف کی کتابیں علمی معیار پر پوری نہیں اتر سکتی ہیں۔

حضرت تھانویؒ کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے، کہ جو بات آپ نے لکھی، کافی تحقیق وجستجو کے بعد لکھی ہے، اور آپ کا ایک چھوٹا سا رسالہ بڑی بڑی کتابوں سے بے نیاز کر دیتا ہے، کیا ہمارے طلبہ اور علماء اس واقعہ سے اپنے لئے کوئی سبق حاصل کریں گے..

مختصر حالات زندگی

۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ یوم چہارشنبہ کو بوقت صبح صادق اپنے وطن تھانہ بھون

میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن کیا، فارسی مولانا فتح محمد تھانویؒ سے پڑھی. ۱۲۹۵ھ میں دار العلوم دیوبند آئے. مشکوٰۃ، مختصر اور ملاحسن وغیرہ پڑھی، پھر ۱۳۰۱ھ میں فراغت حاصل کی. قرأت آپ نے قاری محمد عبد اللہ مہاجر مکیؒ سے حاصل کی. فراغت کے بعد کانپور بحیثیت مدرس تشریف لے گئے. پہلے مدرسہ فیض عام میں رہے. تین چار ماہ بعد مدرسہ جامع العلوم میں آ گئے، چودہ سال وہاں درس و تدریس، افتاء اور وعظ کی خدمت انجام دی۔

صفر ۱۳۱۵ھ میں کانپور سے تھانہ بھون آ گئے، اور یہیں کے ہو کر رہ گئے، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت ہوئے اور خلافت پائی. ربیع الاول ۱۳۱۵ھ سے بیعت و ارشاد کی خدمت میں مشغول ہوئے. لاکھوں علماء، صلحاء، مشائخ اور خواص و عوام آپ کے مسترشدین میں داخل ہوئے. ان میں ۸۹ مجاز بیعت ہوئے. اور ۵۹ مجاز صحبت قرار پائے. ایک ہزار سے زیادہ تصانیف اور مواعظ شائع ہوئے. ۱۵ رجب ۱۳۶۲ھ کی شب میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا. تھانہ بھون ایک ذاتی باغ میں حسب وصیت آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے اشرف السوانح، حکیم الامت نقوش و تاثرات۔

(مشاہیر علماء دار العلوم دیوبند ص۴۲-۴۳)

محدث کشمیریؒ کی زندگی کے بعض گوشے

"حیات انور" جب ملی تو میں نے خصوصی طور پر اس کا مطالعہ شروع کیا، اس لئے اور بھی کہ ایک مایۂ ناز مدرس کی زندگی تھی، جو اپنے وقت کا بڑا محدث اور بے نظیر فقیہ گذرا ہے، دورانِ مطالعہ میں بعض واقعات نے قلب و دماغ کو کافی متأثر کیا، سوچا آجکل کے مدرسین کے لئے ان واقعات کا مطالعہ مفید ہوگا، چنانچہ ان پر نشان ڈالتا گیا، آج کی فرصت میں ان ہی میں سے چند حاضر خدمت ہیں، خدا کرے علماء کرام اور دوسرے اہل علم ان کو پڑھیں ——— محمد ظفیر صدیقی

جدید کتابوں کے مطالعہ کا ذوق

حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی علمی زندگی تھی۔ کتب بینی اور مطالعہ کا آپ کو بے حد شوق تھا، لکھا ہے:۔

"بیشتر متقدمین کی کتب زیر مطالعہ ہوتی تھیں، حافظ ابن قیمؒ، حافظ ابن دقیق العید اور اسی قسم کے لوگوں کی کتابیں جو جدید طبع ہو کر آتی تھیں، ان کو بڑے شغف کے ساتھ مطالعہ فرماتے تھے اور جس کتاب کے جدید طبع ہونے کا علم ہوتا، فوراً اس کے حصول کی کوشش فرماتے اور حاصل کر لیتے" (حیات انور ص۳۲۳)

علمی ذوق و شوق کا عالم دیکھئے، متقدمین اور مستند مصنفین کی کتابوں کا ذوق اب کہاں باقی رہا، یہاں حال یہ تھا کہ جہاں معلوم ہوا کہ فلاں اچھی کتاب طبع ہوئی اور بے چینی شروع ہو گئی، اور جب تک حاصل نہ ہوئی اطمینان نہ ہوا، مگر اب ہمارا یہ دور ہے کہ چند گنے چنے حضرات کو چھوڑ کر مطالعہ کا ذوق عام طور پر نا پید ہے، اب

مدرسوں میں متقدمین کی کتابیں کیڑوں کی خوراک بن جاتی ہیں اور ہمارے اساتذۂ کرام کو احساس تک نہیں ہوتا اور کہا جاسکتا ہے کہ عموماً مدرسین ابن القیمؒ اور دقیق العیدؒ کو جانتے بھی نہیں، بڑا ذوق ہوا تو چند اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈال لی اور زیادہ سے زیادہ اردو کی کوئی تصنیف، دعا ہے۔ ؎

پھینکا ہو۔ نہ آہو کو پھر سوئے حرم لے چل ٭ اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

قلمی کتابوں کی طباعت کا دھیان

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں جو کتابیں قلمی تھیں ان کی طباعت کا آپ کو بڑا خیال تھا، آپ کے ایک شاگرد کا بیان ہے :-

"تفسیر مظہری کے طبع کی طرف اکثر لوگوں کو توجہ دلاتے تھے اور بہت تعریف فرمایا کرتے تھے اور تمنا تھی کہ یہ تفسیر کسی طرح طبع ہو کر وجود میں آجائے"

(حیات انور ص۳۴۷)

قلمی شکل میں آپ نے پڑھی ہوگی، مگر کتاب کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ ہر مدرس اور عالم پڑھے۔ اس لئے طباعت کا یہ اشتیاق تھا، مگر اب جبکہ یہ کتاب چھپ چکی ہے اور آپ کے حضرت کے تلمیذ رشید مفتی عتیق الرحمن عثمانی[1] نے چھپوایا، ناشر سے پوچھئے اس کی بکری کا کیا حال ہے۔ علمائے کرام کو خیال تک نہیں ہوا۔ یہ موقع غنیمت ہے۔ اس طرح کی کتابیں بار بار نہیں چھپ کرتیں، آپ زندہ ہوتے تو کتنی خوشی ہوتی کہ دیرینہ تمنا برآئی، مگر آہ ہمارے نوجوان علماء کو احساس تک نہیں۔

مسلسل اڑتالیس گھنٹے میں ایک کتاب کی تصنیف

تبحر علمی اور ذوق کا عالم یہ تھا کہ مولانا کشمیریؒ نے :-

---

[1] آپ کی ولادت ۱۳۱۹ھ میں دیوبند میں ہوئی۔ شروع سے آخر تک تمام تعلیم دیوبند میں ہوئی۔ آپ محدث کشمیریؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ آپ بہت سے دینی وعلمی اداروں کے ممبر رہے۔ ۱۰ شعبان ۱۴۰۴ھ میں وفات پائی۔

"خاتم النبیین ۴۸ گھنٹے کی میعاد میں اس طرح تحریر فرمایا کہ ایک ساعت بھی بستر پر کمر سیدھی نہ فرمائی، اور اس ۴۸ گھنٹے کی مدت میں حسبِ معمول درس بخاری بھی مدرسہ کے اوقات میں جاری رہا اور ایک منٹ نیند نہیں فرمائی" (حیات انور ص۳۴۲)

افسوس ہے کہ اب یہ ذوق وشوق علماء کرام میں نہیں رہا، اس مستعدی سے کام کرنے والا ڈھونڈے سے شاید ہی ملے، اہل علم میں شمار ہونے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ عوام کی طرح اپنے بیش قیمت اوقات بے کار باتوں میں ضائع کر دیتے ہیں اور ان کو احساس تک نہیں ہوتا۔ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں ❊ محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

مفتی کفایت اللہ سے جیل میں ملاقات اور ابن تیمیہ کا تذکرہ

حضرت کشمیریؒ ایک دفعہ ملتان جیل میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب[1] سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے، وہاں بھی علمی تذکرہ چھڑ گیا، اسی موقع سے ترغیب کے پیرایہ میں آپ نے یہ واقعہ سنایا:۔

"حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو حکومت نے جب جیل بھیجا تو آپ سے دریافت کیا کہ شاگردوں میں کون صاحب زیادہ محبوب ہیں، آپ نے حافظ ابن قیمؒ کا نام لیا، ان کو بھی ساتھ ہی نظر بند کر دیا گیا۔ پوچھا کسی چیز کی ضرورت ہے تو کہیئے؟ آپ نے کاغذ قلم اور دوات طلب کی، یہ سارا سامان دیدیا گیا۔ آپ نے لکھ لکھ کر سب کاغذ پُر کر دیئے، اس کے بعد جیل کی دیواروں پر لکھنا شروع کر دیا" (حیات انور ص۳)

یہ علمی ذوق تھا ہمارے بزرگوں اور علماء کرام کا کہ ان کی کوئی مجلس علمی تذکروں سے

---

[1] آپ کی ولادت ۱۲۹۲ھ میں ہوئی۔ ۱۳۱۳ھ میں دار العلوم سے فارغ ہوئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ممتاز تلامذہ میں تھے، اپنے دور میں ہندوستان کے مفتی اعظم مانے جاتے تھے، ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ میں وفات پائی۔

خالی نہ ہوتی، مگر آہ آج عام نوجوان علمار کرام ہیں جو بالکل برعکس واقع ہوئے ہیں ان کی کسی بھی مجلس میں علمی باتیں نہیں، وہی غیبت، عیب جوئی اور واہی تباہی گفتگو، علمار سلف کا یہ واقعہ ہمارے لئے سراپا عبرت ہے کہ ان کا علمی ذوق کتنا بلند اور ان کی زندگی کس قدر کارآمد تھی، کاش ہم اس طرح کے واقعہ سے اپنی زندگی میں کوئی انقلاب محسوس کرتے ۔

استاذ محترم کی خدمت اور ان کا ادب

مولانا محمد انوری لائل پوری کا بیان ہے :-

"حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کے لئے حضرت کے آستانہ پر حاضر ہوا، دیکھا علمار و صلحار کا عظیم اجتماع ہے، گرمی کا وقت ہے، ایک بزرگ چھت کے پنکھے کا رستہ کھینچ رہے ہیں اور نرم نرم مترنم آواز میں فرما رہے ہیں" بھائی بیٹھ جاؤ ... ہوا لگنے دو" وہ بزرگ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ تھے"

(حیات انور ص۳۰۵)

بااین ہمہ فضل و کمال حضرت مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خدمت گذاری اور اپنے استاذ محترم کا یہ ادب کیا اب یہ خوبی باقی رہی، سچ کہا گیا ۔ ؎

تجھے آبار سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی ؛ کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارہ

دہلی کی مدرسی کے زمانہ کا حال

درسیات کی فراغت کے بعد حضرت مولانا کشمیریؒ مدرسہ امینیہ دہلی میں صدارت تدریس پر فائز رہے، اس زمانہ کا ایک واقعہ حضرت رائے پوری بیان فرماتے ہیں :-

لہ

"حضرت شاہ صاحب ڈیڑھ پیسے کی روٹی منگا کر کھایا کرتے تھے، سارا دن درس متعدد علوم وفنون کا دیتے، دوپہر کو شدت گرما میں کتب بینی فرماتے، جبکہ ہر شخص دوپہر کی نیند کے مزے لیتا ہوتا تھا، موسم سرما میں دیکھا گیا ہے کہ بعد نماز عشاء صبح صادق تک مطالعہ فرمارہے ہیں... مغرب سے عشاء تک ذکر و مراقبہ میں مشغول رہتے" (حیات انور ص۲۳۲)

علوم وفنون میں انہماک، دیکھ رہے ہیں کہ نہ دن میں آرام نہ رات کو چین ہے، جب دیکھئے کتب بینی میں مشغول اور پھر کمال یہ کہ ذکر و مراقبہ میں بھی ناغہ نہیں ہے یہ ایک نوجوان عالم کا حال ہے، جو ایک نئے مدرسہ میں مدرس کی حیثیت سے زندگی گذار رہا ہے، بتایئے پھر وہ اپنے وقت کا ابن حجر عسقلانی کیوں نہ ہوتا، اب یہ محنت اور شوق کہاں ہے؟ عام مدرسین کتب بینی کو سرے سے اہمیت ہی نہیں دیتے الٹا سیدھا جو آیا پڑھا دیا، حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اہل علم ہونے کے ساتھ اہل دل بھی تھے۔

خشیت الٰہی کا اثر

حضرت مولانا قاری محمد طیب[۱] صاحب مدظلہ جیسے ذمہ دار کا بیان ہے:-

"درس میں بعض اوقات غایت خشیت سے آنکھوں میں نمی آجاتی، جسے ضبط کرنے کی کوشش کرتے، اشعار و قصائد اور وعظ میں خوف وخشیت کے اشعار تر آنکھوں کے ساتھ پڑھتے جس سے چہرہ مظہر خشیت الٰہی نظر آتا تھا" (حیات انور ص۲۳۲)

مدرس جب اہل دل ہو، اور اس پر خشیت الٰہی کا ایسا نمایاں اثر ہو، پھر طلبہ اس کے درس میں بیٹھ کر فیضیاب نہ ہوں، غیر ممکن ہے، ہمارے اساتذۂ کرام صرف

[۱] آپ کی ولادت ۱۳۱۵ھ میں ہوئی، آپ اپنے زمانہ کے بہترین خطیب و مقرر تھے، آپ کے دور اہتمام میں دار العلوم نے غیر معمولی ترقی کی اور عالمی شہرت حاصل کی، ۶ شوال المکرم ۱۴۰۳ھ میں وفات پائی۔

ظاہری ہی علم کے شہ سوار نہ تھے بلکہ باطنی علوم میں بھی کمال رکھتے تھے، مگر کیسے یقین دلایا جائے کہ اب یہ خوبیاں ناپید ہوتی جا رہی ہیں، اور حد یہ ہے کہ اس کی طرف سے بے حسی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

کتابوں کا ادب واحترام

علم کا حسن ادب جیسا مولانا کشمیریؒ میں تھا، اب دیکھنے میں نہیں آتا، مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ ہی کا بیان ہے کہ:۔

"خود ہی فرمایا کہ میں مطالعہ میں کتاب کو اپنا تابع کبھی نہیں کرتا، بلکہ ہمیشہ خود کتاب کے تابع ہو کر مطالعہ کرتا ہوں"

آگے اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں:۔

"چنانچہ سفر و حضر میں ہم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ لیٹ کر مطالعہ کر رہے ہوں یا کتاب پر کہنی ٹیک کر مطالعہ میں مشغول ہوں؛ بلکہ کتاب کو سامنے رکھ کر مؤدب انداز سے بیٹھتے. گویا کسی شیخ کے آگے بیٹھے ہوئے استفادہ کر رہے ہیں"

کتابوں کے مطالعہ میں وضو کا اہتمام

خود ہی حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔

"میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک دینیات کی کسی کتاب کا مطالعہ بے وضو نہیں کیا" (حیات الانور ص۲۳۲)

اللہ اکبر یہ تھا کتابوں کا ادب و احترام، ہمارے اس زمانہ میں تو یہ حسن ادب عنقا ہے، کاش ہمارے عزیز طلبہ اور محترم علماء کرام اس سے سبق حاصل کرتے اور اپنے فرائض کا احساس کرتے اور غالباً ان ہی چیزوں کے ترک کا نتیجہ ہے کہ علوم و فنون میں وفور کمال ناپید ہوتا جا رہا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

حضرت کشمیریؒ کے حافظہ کا حال

حضرت مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہ بے نظیر حافظہ کے مالک تھے۔ جس چیز کو ایک دفعہ دیکھ لیتے برسوں کے لیے حافظہ کے خزانہ میں وہ محفوظ ہو جاتی مگر پا این ہمہ اہم کتابوں کا بار بار مطالعہ فرماتے اور ہر دفعہ اسی کتاب سے نئی نئی تحقیق فرماتے۔

فتح الباری کا تیرھویں دفعہ مطالعہ

آپ کے ایک شاگرد کا بیان ہے :۔

" ایک دفعہ حضرت محدّث کشمیریؒ نے فرمایا کہ فتح الباری کا جو تیرہ جلدوں کی کتاب ہے، تیرھویں مرتبہ مطالعہ کر رہا ہوں، اور یہ بھی فرمایا کہ میں درس کے لیے کبھی مطالعہ نہیں دیکھتا، مطالعہ کا مستقل سلسلہ ہے! اور درس کا مستقل ۔" (حیات الور صـ۲۰۳)

فرمائیے اب یہ ذوق اور یہ محنت علماء کرام میں باقی رہی ہے ؟ کیا یہ درست نہیں کہ بڑے بڑے نامی گرامی کا علم سنا سنایا ہے تحقیق کی توفیق کہا باقی رہی اب تو ہمارے نوجوان علماء فتح الباری کو صرف نام ہی کی حد تک جانتے ہوں تو جانتے ہوں، شاید ایک جلد بھی کسی نے از اول تا آخر نہ دیکھی ہو، الا ماشاء اللہ۔ تیرہ تیرہ جلدوں کا پڑھ جانا اور وہ بھی ایک دو مرتبہ نہیں، تیرہ تیرہ مرتبہ آجکل ذہن میں بھی نہیں آسکتا، مگر کیسے بتایا جائے کہ محققین کا یہی دستور رہا ہے اور جو لوگ ہیں ان کا یہی دستور ہے اور جب تک یہ ذوق و شوق نہیں پیدا ہوتا علم سے محرومی رہے گی۔

دارالعلوم کی مُدرسی میں مشاہرہ لینے سے انکار

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ فرماتے ہیں :۔

"آپ (یعنی حضرت محدث کشمیریؒ) نے باستقلال اکابر دارالعلوم میں درس شروع فرمادیا، البتہ غلبۂ زہد و قناعت سے مشاہرہ لینے پر راضی نہ ہوئے اور لوجہ اللہ کام شروع کردیا" (حیات انور ص۳۰۲)

واقعہ ہے، عالمانہ شان ہمارے اسلاف کی حد تک ختم ہوگئی، اب یہ شان کہاں دیکھنے میں آتی ہے، اب تو ہم لوگ صرف روپیہ کے نام پر پڑھاتے ہیں، اگر اس سلسلہ میں کوئی بات آپڑے، کام بند کردیں، دارالعلوم کے اصرار پر بھی تنخواہ قبول نہیں کیا: اسی حیات انور سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ دس گیارہ برس یوں ہی بغیر مشاہرہ حسبتاً للہ درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، اس طرح کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسین پہلے زمانہ میں اپنے کو نوکر سمجھ کر کام نہیں کرتے تھے بلکہ دین کا خادم سمجھ کر، گو ضرورتاً تنخواہ بھی لیا کرتے تھے جس کی شرعاً اجازت ہے۔

ایک شاگرد کی شادی میں شرکت اور جفاکشی

مولانا سعید[1] احمد اکبر آبادی مدظلہ اپنی شادی میں شرکت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق فرماتے ہیں:-

"تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہی یکہ رکوایا اور پاپیادہ ہوگئے، چلچلاتی دھوپ پڑرہی ہے، اور لو چل رہی ہے، چاروں طرف سے مٹی کے تودے ہیں کہ فضاء میں گشت لگاتے پھر رہے ہیں اور اسی عالم میں حضرت شاہ صاحبؒ منھ اور کانوں کو رومال لپیٹے ہوئے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ پڑھتے ہوئے قدم بڑھائے اعتماد پور کی آبادی کی طرف چلے جارہے ہیں، آخر خدا خدا کرکے مقام آیا۔"

[1] آپ کی پیدائش ۱۳۲۶ھ میں ہوئی۔ آپ حضرت علامہ کشمیریؒ کے ممتاز تلامذہ میں تھے، آپ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، ۱۴۰۶ھ میں لاہور پاکستان میں وفات پائی۔

یہ ہے اپنے وقت کا بے نظیر محدّث اور فقیہ اور دار العلوم دیوبند کا صدر نشین، موقع آیا تو آگ لگنے والی فضا میں بھی پیدل چلنے سے نہ ہچکچایا، اب ہمارے نوجوان علماء کرام میں یہ جفاکشی کہاں ہے؟ ضرورت ہے کہ موجودہ علماء کرام اپنے شاگردوں میں جفاکشی کے جذبات پیدا کریں جس کی اس دور میں بڑی ضرورت ہے۔

علمی خودداری کا مظاہرہ

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سب کچھ ہونے کے باوجود بڑے خوددار بھی تھے مولانا اکبر آبادی نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ دہلی میں نظام حیدر آباد سے حضرت کی ملاقات ہوئی، اس پر دیوبند کے ایک مشہور اخبار "مہاجر" نے ملاقات کا عنوان "بارگاہ خسروی میں حضرت علامہ کشمیری کی باریابی" یا اسی طرح کا کوئی عنوان تحریر کرنا چاہا، مولانا کو معلوم ہوا:۔

> "تو حد درجہ برہم اور خفا ہوئے، اور فرمایا کہ میں ہر چند ایک مرد بے مایہ وبے بضاعت ہوں لیکن اتنا منکسر المزاج بھی نہیں کہ یہ عنوان گوارا کرلوں کیسی بارگاہ خسروی اور کیسی اس میں باریابی؟ صاف لکھئے "نظام اور انور شاہ کی ملاقات"۔" (حیات انور ص۱۴۷)

اعتدال اسی کا نام ہے، خواہ مخواہ کی منکسر المزاجی مفید نہیں، بلکہ ہر اعتبار سے مضر ہی ہے، حق یہ ہے کہ محدّث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عالمانہ شان یہاں بھی باقی رکھی، اور ہر عالم کو یہی طرز زندگی اختیار کرنی چاہیئے، جو لوگ مالداروں اور حکمراں طبقہ کے مقابلہ میں اس طرح کے عنوان کو پسند کرتے ہیں وہ اس واقعہ سے سبق حاصل کریں۔ ؎

نہیں یہ شان خودداری، چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے، کوئی زیب گلو کرلے

نظام حیدر آباد کی ملاقات سے گریز

ایک دفعہ حضرت شاہ صاحبؒ حیدر آباد تشریف لے گئے۔ نظام کے ایماء سے لوگوں نے چاہا کہ آپ نظام سے ملنے تشریف لے چلیں مگر یہ کہہ کر:۔

"مجھے ملنے میں عذر نہیں لیکن اِس سفر میں نہیں ملوں گا"۔ شاہ صاحب کسی طرح رضامند نہیں ہوئے"۔ (حیات انور ص۱۷۵)

اب یہ عالمانہ شان وشکوہ کہاں باقی رہا اور کس کو احساس ہے کہ ایک عالم کو کس طرح زندگی گذارنی چاہیئے۔

عالمانہ شان کا ترک کرنا گوارہ نہیں فرمایا

لکھا ہے اسی قیام حیدر آباد میں ایک دن سر اکبر حیدری سابق صدر اعظم حیدر آباد کا ٹیلیفون آیا کہ" میں حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ سے ملنا چاہتا ہوں" چنانچہ یہ خبر شاہ صاحب کو پہنچا دی گئی، آپ نے یہ سن کر فرمایا:۔

"میں تو یہیں ہوں، ابھی کہیں جانا نہیں، حیدری صاحب آنا چاہتے ہیں تو آجائیں"

حیدری صاحب نے جب یہ جواب سنا، پھر ٹیلیفون پر کہا،" حاضر ہوتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ جب میں پہنچوں تو مجلس سے لوگوں کو اٹھا دیا جائے"، حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو جب یہ شرط سنائی گئی تو آپ نے فرمایا:۔

"یہ ناممکن ہے کہ میں حیدری صاحب سے باتیں کرنے کے لئے حاضرین مجلس کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤں، یا اُن لوگوں سے کہوں کہ الگ چلے جائیں"

(حیات انور ص۱۷۵)

اِس محدثانہ شان پر قربان جایئے، آپ نے وہی کیا جو کرنا چاہیئے، اور یہ کر کے اپنے ماننے والوں اور شاگردوں کے لئے ایک عمدہ نمونہ چھوڑ گئے، کاش نوجوان

علماء سمجھتے اور اپنے مرتبہ کی بلندی کا یقین پیدا کرتے ۔

سائلوں کی خدمت کا جذبہ

حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ علم وفضل میں جس قدر سربلند تھے اسی تناسب سے رب العزت نے آپ کو مکارمِ اخلاق سے بھی نوازا تھا، مولانا اکبر آبادی نے لکھا ہے :۔

"میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی سائل حضرت الاستاذ کے پاس آیا ہو، اور وہ نامراد گیا ہو، جیب میں اُس وقت جو کچھ ہوتا، روپیہ ہو یا اٹھنی، سائل کے حوالہ کر دیتے، ایسی بات کہنے سے احتراز فرماتے تھے جس سے کسی کی دل آزاری ہو" (حیات انور ص۱۰۱)

جو لوگ کہتے ہیں کہ مولوی بخیل ہوتے ہیں، وہ دیکھیں کہ داد و دہش میں بھی یہ کتنے وسیع الاخلاق ہوتے ہیں، جو سائل کو روپیہ اٹھنی دیتا ہو، اس زمانہ میں جب دو روپے من گیہوں ملتا تھا، وہ دوسرے ضرورت مندوں کی احتیاج کا کس قدر خیال کرتا ہوگا؟۔ اسی ایک واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

آپ کی مجلس غیبت سے پاک تھی

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ صرف بڑے عالم ہی نہ تھے بلکہ عمل میں بھی اپنی آپ مثال تھے، مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ فرماتے ہیں :۔

"مگر حضرت استاذ قدس سرہ کو الحمد للہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے غیبت سے زبان کو ایسا محفوظ کیا تھا کہ کبھی اشارۃً کنایۃً بھی غیبت کی قسم کی کوئی بات سننا یاد نہیں بلکہ یہ یاد ہے کہ حضرتؒ کے سامنے کسی نے غیبت کی قسم کی کوئی بات شروع کی اور حضرت نے فوراً روک دیا" (حیات انور ص۱۵۹)

غیبت کی قسم کی بات سے اپنے آپ کو ہر طرح محفوظ رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے

آج کل یہ مرض وبا کی طرح پھیل پڑا ہے جس سے اچھے اچھے حضرات محفوظ نہیں، علمائے کرام کے لئے بھی اس واقعہ میں بڑا سبق ہے واقعہ بھی یہی ہے کہ اہلِ علم کی مجلس کو ان لایعنی باتوں سے قطعاً پاک ہونا چاہیئے اور ہر مسلمان کو اس بڑے گناہ سے بچنا چاہیئے۔

حضرت کشمیری کا حافظہ اور آپ کی یادداشت کا حال

محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا حافظہ زبان زد عام و خاص ہے، ایک دفعہ آپ نے حافظہ کے انحطاط پر تاسف کے لہجہ میں فرمایا:-

"پہلے میرا یہ حال تھا کہ اگر آج ایک مضمون متعدد کتابوں میں دیکھوں اور مجھے ان کتابوں کی عبارتیں نقل کرنی ہوں لیکن کسی وجہ سے آج نقل نہ کرسکوں اور کل بھی موقع نہ ملے تو پرسوں تک بھی اُس پر قدرت رہتی تھی کہ ہر کتاب کی اصل عبارت صفحہ کے حوالہ کے ساتھ دوبارہ کتاب دیکھے بغیر نقل کرسکتا، اب ... صبح کی دیکھی عبارتیں شام تک نقل کرسکتا ہوں" (حیات انور ص۱۳۷)

یہ اللہ تعالیٰ کی خاص دین تھی، جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتی یہ تو اصل عبارت نقل کرنے کی بات تھی مگر مباحث یاد رکھنے کا جہاں تک تعلق ہے، اس کے متعلق حضرت مولانا مدنی[1] مدظلہ کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیں:-

"مجھ سے حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے جب میں کسی کتاب کا سرسری نظر سے مطالعہ کرتا ہوں، اور اس کے مباحث کو محفوظ رکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا، پھر بھی پندرہ سال تک اس کے مضامین محفوظ رہ جاتے ہیں"

(حیات انور ص۱۲)

اللہ اکبر بغیر ارادہ اور سرسری دیکھی ہوئی چیز بھی جب پندرہ پندرہ سال تک

[1] آپ کی ولادت ۱۲۹۵ھ میں ہوئی، حضرت شیخ الہندؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، سترہ سال تک مسجد نبوی میں درس حدیث دیا، ملک کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ میں وفات پائی۔

محفوظ رہتی ہو تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر جو چیز گہری نظر سے دیکھی جاتی ہوگی اور اس کے محفوظ رکھنے کا ارادہ رکھا جاتا ہوگا وہ کب تک یاد رہتی ہوگی، یہ قدرت کا خاص عطیہ تھا۔

بالاستیعاب بخاری شریف کا مطالعہ

بخاری شریف کے متعلق مولانا محمد منظور صاحب مدظلہ کا بیان ہے کہ حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:۔

"میں نے غور و فکر کے ساتھ صحیح بخاری کے صرف متن کا تیرہ دفعہ بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے شروح یا حواشی کا جو مطالعہ کیا ہے، وہ اس کے علاوہ ہے"

(حیات انور ص۱۳۲)

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بخاری شریف آپ کو کتنی مستحضر رہی ہوگی اور آپ کو اس کتاب جلیل پر کیسا عبور حاصل رہا ہوگا اور پھر ان کے نکات پر کیسی دقیق نظر ہوگی، ہمارے وہ علماء کرام جو محنت سے جی چراتے ہیں وہ سوچیں کہ جو عالم ضرب المثل حافظ کا مالک تھا اس کے مطالعہ کا جب یہ حال تھا تو ہم کمزور حافظہ والوں کو کتنی محنت کی ضرورت ہے۔

تلاوت قرآن میں انہماک کا حال

قرآن پاک کے باب میں حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ فرمایا:۔

"میں رمضان المبارک میں قرآن مجید شروع کرتا ہوں، اور تدبر و تفکر کے ساتھ اس کو پورا کرنا چاہتا ہوں، لیکن کبھی پورا نہیں ہوتا، جب دیکھتا ہوں کہ آج رمضان ختم ہونے والا ہے تو پھر اپنے خاص طرز کو چھوڑ کر جو کچھ باقی ہوتا ہے اس دن ختم کر کے دور پورا کرلیتا ہوں"(حیات انور ص۱۳۳)

آہ اب تو ذوق و شوق کے ساتھ قرآن پڑھنے کا احساس بھی کم ہی لوگوں کو ہوتا ہوگا، غور و فکر تو دور کی بات ہے، بلکہ اگر کہا جائے کہ کتنے دیندار قسم کے مسلمان رمضان میں قرآن پاک کو چھوتے بھی نہیں تو غالباً کوئی تعجب انگیز بات نہ ہوگی، البتہ نماز میں پڑھ لیتے ہیں، کم و بیش یہی حال ہمارے نئے علماء کرام کا ہے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق

حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو رب العٰلمین اور رحمۃ للعٰلمین کے ساتھ خاص قلبی تعلق تھا جس کو وہ عموماً چھپانے کی سعی فرماتے۔

حضرت مولانا گیلانی مدظلہ نے اپنا چشم دید واقعہ بیان کیا ہے:-

"رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پر وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی قوت کھو چکے تھے، ذکر مبارک آتا تو آواز بھرا جاتی، اور خاص حال میں طلبہ سے فرماتے، کہ جاؤ انہی کے دین کی خدمت کو زندگی کا نصب العین بنا لینا" (حیات انور ص۱۳۳)

اللہ اللہ یہ تھا تعلق رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے، کاش ہمارے زمانہ کے علماء کرام سمجھتے اصل زندگی اسی کا نام ہے جس میں سوز و گداز نہیں، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ والہانہ تعلق نہیں، وہ زندگی ہی کیا کتابوں کے عالم تو بڑے بڑے نامور غیر مسلم بھی ہوتے ہیں، مسلمان اور پھر عالم جو ہو اُس کو تو علم سے زیادہ عمل کا لحاظ چاہیے اور دین سے شغف۔

پچاس ہزار اشعار زبانی یاد تھے

حضرت مولانا گیلانی[1] مدظلہ فرماتے ہیں:-

---

[1] آپ کی پیدائش ۱۳۱۰ھ میں ہوئی۔ ۱۳۳۲ھ میں دار العلوم سے فارغ ہوئے، چند سال معاون مدیر کی حیثیت سے رسالہ القاسم اور الرشید میں کام کرتے رہے، بہت سی علمی کتابیں آپ کے قلم کی رہین منت ہیں، ۱۳۷۵ھ میں وفات ہوئی۔

"میرا اندازہ تھا کہ مجموعی طور پر نصف لاکھ یعنی چالیس پچاس ہزار سے کم تعداد ان عربی اشعار کی نہ ہوگی، جو شاہ صاحب کو زبانی یاد تھے، جنھیں جس وقت جی چاہتا، وہ سنا سکتے تھے۔" (حیات انور ص۲۰۷)

آج کل کے جو لوگ اردو، فارسی کے چند سو اشعار کی یاد پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے وہ آنکھیں کھول کر پڑھیں، اور وہ علماء کرام بھی اس واقعہ کو خصوصی طور پر پڑھیں جن کو ادب عربی سے کوئی ذوق ہی نہیں بلکہ اسے ایک لایعنی چیز سمجھتے ہیں، اب تو کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ نصاب سے عربی ادب کی کل کتابیں نکال ڈالی جائیں، صرف قرآنی ادب کی دو ایک نئی کتابیں بڑھا دی جائیں اور بس، اور غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ نئے فارغ شدہ عام علماء کرام عربی کتاب کے مطالعہ پر قدرت نہیں رکھتے۔

محدث کشمیری کے درس حدیث کی شان

حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا درس بڑا تحقیقی ہوا کرتا تھا، سامنے کتابوں کا انبار رہتا، آپ تقریر کرتے جاتے اور طلبہ کو کتابیں کھول کھول کر دکھاتے جاتے، دیکھو جو میں کہتا ہوں اسے فلاں نے اس طرح لکھا ہے، اور فلاں نے یوں بیان کیا ہے، جس سے طلبہ میں تحقیق کا بڑا اچھا خاصا ذوق پڑھنے کے زمانہ ہی سے پیدا ہونے لگتا۔

حضرت مولانا گیلانی مدظلہ نے لکھا ہے:-

"صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ایک دفعہ صحیح مسلم کے درس میں آکر شریک ہوئے، واپس ہو کر میں خود ان سے سنا، کہتے تھے کہ آج تو آکسفورڈ اور کیمبرج کے لیکچر ہال کا منظر میرے سامنے آگیا تھا، یورپ کی ان یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کو جیسے پڑھاتے ہوئے میں نے دیکھا ہے آج ہندوستان میں میری آنکھوں نے اسی تماشے کو دیکھا ہے۔" (حیات انور ص۲۱۶)

عربی مدرسوں میں اپنے طرز کا درس اوّل و آخر غالباً حضرت شاہ صاحبؒ ہی پر ختم ہو گیا۔ گو اب بھی مدرسوں میں اساتذہ بہت تحقیقی تقریر فرماتے ہیں، اور کتابوں کے نام بھی لیتے ہیں، مگر کھول کر دکھانا یہ رواج اب نظر نہیں آتا۔ اور نوجوان علماء تو کتابوں کے دیکھنے کی زحمت ہی برداشت نہیں کرتے، نوٹ یا نوٹ کی سی جو کتابیں چھپ گئی ہیں انہی پر ان کا سارا دار و مدار ہوتا ہے۔

حضرت کشمیری حکیم الامت کی نظر میں

حضرت حکیم الامت تھانویؒ حضرت شاہ صاحبؒ کی ان ہی خصوصیتوں کے پیش نظر فرماتے تھے:-

"میرے نزدیک حقانیت اسلام کی دلیلوں میں سے ایک دلیل حضرت مولانا انور شاہ صاحب کا امتِ مسلمہ میں وجود بھی ہے، اگر دین اسلام میں کسی قسم کی کجی یا خرابی ہوتی تو آپ دین اسلام سے کنارہ کش ہو جاتے۔"

(حیات انور صفحہ ۲)

اللہ اللہ حکیم الامت تھانویؒ جیسے ذہین اور ذی علم کی شہادت جس کے حق میں اتنی اہم ہو، اس کے دل و دماغ کی صلاحیتوں کا کیا کہنا معلوم ہوتا ہے آپ کو قدرت نے بے نظیر عقل و فہم سے نوازا تھا اور کوئی بات بے دلیل آپ نہیں مانتے تھے۔

محدث کشمیری کی وفات پر علامہ عثمانی کا تاثر

حضرت مولانا شبیر احمد[1] عثمانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت محدث کشمیری کو اپنے وقت کا

---

[1] آپ کی ولادت ۱۳۰۵ھ میں ہوئی۔ آپ حضرت شیخ الہندؒ کے ممتاز تلامذہ میں تھے۔ ۱۳۵۴ھ سے لے کر ۱۳۶۲ھ تک دار العلوم کے صدر مہتمم بھی رہے، حضرت تھانویؒ سے بیعت تھے۔ اور انہی سے خلافت بھی حاصل تھی، بہت سی علمی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، ۲۱ صفر ۱۳۶۹ھ میں وفات پائی۔

امام حدیث یقین کرتے تھے۔ حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پر آبدیدہ ہو کر فرمایا تھا:۔

"میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجر، شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا انتقال آج ہو رہا ہے" (حیات انور ص ۱۹)

اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عمل کی دولت سے بھی آپ کو سرفراز فرمایا تھا۔

حدیث سے شغف اور دنیا سے بیزاری

آپ نے دارالعلوم دیوبند کے مقابلہ میں بڑی بڑی تنخواہوں کو ٹھکرا دیا اور زندگی بھر دیوبند یا ڈابھیل میں بخاری اور ترمذی وغیرہ کے درس میں لگے رہے، لکھا ہے:۔

"آپ کو ڈھاکہ یونیورسٹی اور مدرسہ عالیہ کلکتہ سے بار بار طلب کیا گیا، بڑی بڑی تنخواہیں پیش کی گئیں، لیکن آپ نے کبھی بڑی تنخواہ کو ترجیح نہیں دی اور ہمیشہ دیوبند و ڈابھیل کے خشک خطوں کو پسند فرمایا" (حیات انور ص ۱۶)

جو علم کا شیدا ہوتا ہے، اس کی نگاہ تنخواہ پر نہیں ہوتی بلکہ وہ دیکھتا ہے کہ میری ذات سے مخلوق کو زیادہ فائدہ کہاں سے پہنچ سکتا ہے اور علم کی خدمت کہاں سے اچھی ادا ہو گی، مگر اب یہ باتیں ہماری جماعت سے آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہیں۔

تبحر علمی اور وسعت معلومات

شیخ الاسلام مولانا مدنی مدظلہ نے فرمایا تھا:۔

"میں نے ہندوستان، حجاز، عراق، شام وغیرہ کے علماء اور فضلاء سے ملاقات کی اور مسائل علمیہ میں ان سے گفتگو کی، لیکن تبحر علمی اور وسعت

معلومات، جامعیت اور علوم عقلیہ ونقلیہ کے احاطہ میں شاہ صاحب کا کوئی نظیر نہیں پایا؛" (حیات انور صلا)

سچ یہ ہے کہ اب تو ہمارے علماء کی جماعت میں چند بوڑھے علماء رہ گئے ہیں، اگر یہ چل بسے تو پھر ہندوستان میں علم کا چراغ ہی گل ہو جائے گا۔ خدا ایسا دن نہ لائے۔

لوگوں میں احساس نہیں کہ نوجوان علماء میں زندگی کی روح دوڑائی جائے اور ان کو تحقیق اور وسعت معلومات کی شاہراہ پر ڈال دیا جائے دوسرے ملکوں سے ہمیشہ ہمارا ملک دینی علوم میں بڑھا ہوا رہا ہے، آئندہ یہ عزت رب العزت کے ہاتھ ہے۔

مطالعہ میں انہماک اور پابندی

حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اور آپ کبھی بھی اس سے غافل نہیں رہے کہ علوم وفنون کا سارا ذخیرہ کتابوں میں محفوظ ہے، لہذا جتنی بھی اہم کتابیں تھیں ان میں سے کسی سے غفلت نہ برتی، اور کثرت مطالعہ ہی کا نتیجہ تھا کہ یہ میدان آپ کے لئے بڑا سہل ہو گیا تھا، بڑی سے بڑی کتابوں کے دیکھنے میں آپ کو کوئی دقت پیش نہ آتی تھی، لکھا ہے کہ:-

"سرعت مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ "مسند احمد" (مطبوعہ مصر) کے روزانہ دوسو صفحات کا مطالعہ فرمایا، اس طرح کہ پوری دقت نظر اور کامل غور و خوض اور فکر کے ساتھ اس کی پیچیدگی اور مشکلات کو حل کرتے جاتے تھے؛"

مصری کتابوں کا مطالعہ اس سرعت کے ساتھ۔ بتاتا ہے کہ قدرت نے آپ کو بے نظیر صلاحیت سے نوازا تھا، تدریس کے فرائض کے ساتھ ساتھ مطالعہ کا یہ اہتمام شاہد ہے کہ رب العلمین کی عطا کردہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ آپ نے محنت بھی کافی کی تھی۔ آہ اب تو ہمارے علماء کرام نے محنت

کے فوائد کو فراموش کر دیا ہے، اور دنیا کے سارے کاموں کے لئے وقت ملتا ہے مگر کتب بینی کی توفیق نہیں ہوتی۔

فتح القدیر کا مطالعہ اور اس کی تلخیص

مولانا محمد یوسف بنوری[1] نے لکھا ہے:-

"حضرت شاہ صاحب نے ۱۳۲۱ھ میں "فتح القدیر" لابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ کا مع تکملہ بیس دن کے اندر مطالعہ فرمایا، اور اس طرح کہ کتاب الحج تک اس کی تلخیص فرمائی، اور ابن ہمام نے فتح القدیر میں صاحبِ ہدایہ پر جو اعتراضات کئے ہیں، اپنے خلاصہ میں ان کے مکمل جوابات بھی قلم بند فرمائے۔"

(حیات انور ص۱۲)

سرعت مطالعہ کی بات جانے دیجئے۔ ہمیں غور یہ کرنا ہے کہ کیا اب علماء کرام ان کتابوں کا بالاستیعاب اس طرح مطالعہ کرتے ہیں؟ اپنا خیال ہے بالاستیعاب مطالعہ کا یہ ذوق تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ ممکن کسی خاص بحث کے دیکھنے کے لئے متعدد کتابیں کوئی کھولے مگر بسم اللہ سے تمت تک پڑھنا محال ہے، اب تو دیکھتے ہیں کہ علماء مدرسوں میں پوری کتاب پڑھانے کا رواج بھی اٹھاتے چلے جا رہے ہیں، جس کا انجام یہ ہو رہا ہے کہ بعض ابواب پر کبھی بھی نظر نہیں جاتی۔

کتاب پوری پڑھنے کا اہتمام

حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ہی کا واقعہ لکھا ہے:-

[1] لہ

"بلکہ آپ کو یہ کمال حاصل تھا کہ فن کی کوئی کتاب ملی اور اس کو شروع سے آخر تک ضرور ایک بار مطالعہ فرمایا" (حیات انور صلا)

غور سے دیکھئے یہ ایسا ادھورا مطالعہ نہ تھا، جیسا کہ آجکل ہمارے بعض اہل علم کا طریقہ ہے کہ اِدھر اُدھر سے اُلٹ پلٹ کر دیکھ لیا اور بس : اس مطالعہ سے ٹھوس علمیت پیدا نہیں ہوتی ، علمی کمال کے لئے کتب بینی لازمی ہے ۔

حضرت محدّث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ان ہی فضل و کمال کا یہ اثر تھا کہ مصر و شام اور دوسرے ملکوں میں آپ کے تبحر علمی کا سکہ چلتا تھا ، علامہ رشید رضا مصری، موسیٰ جار اللہ روسی اور دوسرے غیر ملکی علماء آپ سے بے حد متاثر تھے ۔ اور آج ہندوستان و پاکستان کے تقریباً وہ تمام مشہور و معروف علماء کرام جو نمایاں نظر آتے ہیں حضرت محدّث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ہی کے فضل و کمال کے چھینٹے ہیں ۔

مختصر حالات زندگی

کشمیر وطن تھا ، ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ کو ولادت ہوئی ، ۴ سال کی عمر میں اپنے والد مولانا سید معظم صاحب سے قرآن شریف شروع کیا ، فارسی وغیرہ ایک ڈیڑھ سال میں ختم کر لی ، تین سال ہزارہ کے مدارس میں رہے ، ۱۳۱۰ھ میں دیوبند آئے ، ۱۳۱۴ھ میں فراغت حاصل کی ، بعد فراغت حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر سند حدیث اور باطنی فیوض سے مالا مال ہوئے اور خلافت پائی ، مدرسہ امینیہ دہلی میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے لگے ، ۱۳۲۰ھ میں کشمیر واپس ہوئے ، وہاں ایک مدرسہ فیض عام کے نام سے قائم فرمایا ۱۳۲۳ھ میں حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا ، کچھ دنوں وہاں رہ کر مختلف کتب خانوں سے استفادہ کیا ۔

۱۳۱۱ھ میں دیوبند تشریف لائے، اساتذہ نے یہاں روک لیا، درس کی خدمت پر مامور کیا، مدت تک دارالعلوم سے کوئی حق المحنت قبول نہیں کیا مہتمم دارالعلوم حافظ محمد احمد صاحبؒ کے مہمان رہے، ۱۳۳۳ھ میں جب شیخ الہندؒ حجاز روانہ ہوئے تو اپنا جانشیں شاہ صاحبؒ کو منتخب فرمایا، ۱۲ سال تک مسند صدارت پر رونق افروز رہے، ۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم دیوبند سے علیحدہ ہوکر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے، ۱۳۵۱ھ تک وہاں درس حدیث دیتے رہے، حضرت شاہ صاحبؒ کا حافظہ مشہور تھا، آپ کو چلتا پھرتا کتب خانہ کہا جاتا تھا، اس دور کے تمام علماء نے آپ کی عظمت کا اعتراف کیا، علامہ اقبال آپ سے بہت متأثر تھے، اور استفادہ کیا کرتے تھے، دیوبند ہی کے ہوکر رہ گئے تھے، چنانچہ یہیں ۳ صفر ۱۳۵۲ھ میں دنیا کو الوداع کہا، آپ کی بہت قیمتی تصانیف ہیں، اور بڑے ذی علم تلامذہ چھوڑے، قادیانیت کے خلاف مناظرے کئے، اور کتابیں لکھیں، فیض الباری، الانوار المحمود، معارف السنن انوار الباری، یہ سب آپ کی درسی تقریروں کا بیش قیمت مجموعہ ہے، جنہیں آپ کے تلامذہ نے مرتب کرکے شائع کیا، اکفار الملحدین، خاتم النبیین، کشف الستر وغیرہ آپ کی تصانیف ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے حیات انور، نقش دوام، اور نفحۃ العنبر۔ (مشاہیر علماء دارالعلوم دیوبند ص۵۳-۵۰)

تاریخی حقائق

حضرت شیخ الاسلام کی زندگی کے بعض گوشے

حضرت شیخ الاسلام حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا مطالعہ اگر "تعمیر سیرت" کے لئے ہم کریں تو بلا کسی مبالغہ کے اپنا خیال ہے کہ بہت سے نشیب و فراز اور افراط و تفریط میں اعتدال و توازن پیدا کر سکتے ہیں اور اپنی زندگی کے مختلف پہلو کو سنوار سکتے ہیں اس عنوان کے تحت آپ کی خدمت میں خود حضرت اقدسؒ ہی کی تحریر سے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی جائے گی، اس کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ ہوگا کہ پڑھنے والے اسے اسی نقطۂ نگاہ سے پڑھیں اور سبق حاصل کریں، اگر کوئی مفید بات مل جائے تو خاکسار کے لئے فلاح دارین کی دعا کریں اور بس۔ طالب دعا ظفر صدیقی

تواضع و انکساری

انسان مٹ کر ہی پھیلتا ہے اور پامال ہو کر ہی اجاگر ہوتا ہے اسلامی تعلیم بھی یہی ہے کہ انسان انسان بن کر زندگی کے دن گذارے اور عاجزی و انکساری اس کی سرشت میں ہو، حدیث ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، رب العالمین اسے دین و دنیا دونوں میں بلند کرتا ہے۔

لیکن کون نہیں جانتا ہے کہ ہمارا یہ دور خودستائی، خودنمائی کا ہے مگر اسی دور میں شیخ الاسلامؒ کا حال یہ ہے کہ آپ تواضع وانکساری اور خداترسی وفرض شناسی کی انتہائی سرحد پر کھڑے دنیا کو اپنے عمل سے انسانیت پر گامزن رہنے کی تلقین فرما رہے ہیں۔

ایک مشہور انشاپرداز فلسفی اور قدیم وجدید علوم کا سنگم، مہینوں کے غور وفکر کے بعد خدمت اقدس میں حاضری کا ارادہ کرتا ہے اور اصلاح نفس کی تمنا ظاہر کرتا ہے تو بجائے اس کے کہ آپ اس کو اپنی پیری اور پیشوائی جتاتے، لکھتے ہیں اور اسے پورے تیقن کے ساتھ بتاتے ہیں کہ یہاں کچھ نہیں ہے، انداز تحریر ملاحظہ فرمایئے:۔

"مجھ کو نہایت تعجب ہے کہ آپ جیسا تجربہ کار..... صاحب علم وشعور ایسی غلطی میں پڑے۔ میرے محترم! اصلاح نفس کے لئے کسی سگ دنیا، نفس پرست، ناکارہ ونالائق کے پاس جانا کیا معنیٰ رکھتا ہے، پیاسا دریا کا قصد بیشک کرتا ہے، مگر آتش کا قصد نہیں کرتا، در د دیوار سنگ وکہسار کی طرف نظر نہیں اٹھاتا۔"

اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پوری ہمدردی سے اس رہبری کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں حلفیہ کہتا ہوں اور میں سچا ہوں کہ میں اپنی سیاہ روئی اور سیہ کاری سے خود شرمندہ اور نادم ہوں، اور بسا اوقات روتا ہوں، میری واقعی حالت اشخاص انسانیہ سے بدتر ہونا تو درکنار، ارذلِ حیوانات سے بھی بدتر ہوں۔" (مکتوبات شیخ الاسلام ص۲۱۲ ج۱)

یہ ہے احساس اپنی ذات کے متعلق ایک شیخ وقت کا، جو ہزاروں کا استاذ، اور لاکھوں کا مرشد ہے، اور جس کا زہد واتقا، دوست ودشمن دونوں میں مسلم ہے، تنقیدی نگاہ ڈالئے اور ایمانداری سے جائزہ لیجئے کہیں

خود ستائی یا خود نمائی کا شائبہ بھی نظر آتا ہے۔

کہاں ہیں وہ عالمانِ دین اور مرشدانِ قوم جو اپنے فضائل و مناقب بیان کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔

شیخ الاسلامؒ کی سیرت کا یہ شاندار باب مطالعہ کریں، اور نام و نمود، ریا و سمعہ اور شہرت و جاہ طلبی اور جھوٹے فخر و مباہات کی وادی سے نکل کر دلوں کا جائزہ لیں، اعمال کا احتساب کریں، اور پھر یقین پیدا کریں کہ بڑائی تواضع و انکساری میں ہے، کبر و غرور میں نہیں۔

اپنے عیوب و نقائص پر نظر

ہندوستان میں جہاں بہت سارے مسائل سامنے آئے اور ابھرے ان میں ایک اہم مسئلہ قیامِ امارت کا تھا، اس سلسلہ میں ایک عقیدت مند نے تجویز کے طور پر آپ کے نام کی اشاعت کے سلسلہ میں مشورہ طلب کیا، اس خط نے آپ پر بے حد اثر کیا۔ اور تعریف پر از حد رنج ہوا، اور پھر قدرتی طور پر آپ کا جوہر نکھر آیا، اپنے اس عقیدت مند کو جہاں اور باتیں لکھیں، وہاں اپنی ذات کے متعلق تحریر فرمایا:۔

"نہایت ادب اور پر زور التجا کے ساتھ عرض رساں ہوں کہ مہربانی فرما کر اس قسم کی تحریر کبھی بھی اوراق میں آنے نہ دیجئے، بلکہ زبانی تذکرہ تک سے بھی قطعی پرہیز کیجئے۔ مجھے تو آپ سے یہ بھی شکایت ہے کہ آپ میری تعریف ..... دوسروں کے سامنے کیا کرتے ہیں، میری دلی خواہش ہے ...... اس سے آپ کلی پرہیز فرمائیں"

اس تمہید و ممانعت کے بعد اپنے حالات لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"اگر آپ میرے واقعی عیوب ظاہر نہیں فرماتے یا خداوندی ستر کی وجہ سے واقع میں آپ کو اطلاع نہیں ہے، تو ان غیر واقعی مدائح کو تو زبان پر

نہ لایا کریں، اگر آپ کسی غلطی میں مبتلا ہوگئے ہیں تو دوسروں کو تو ایسے ناخوش گوار گڑھے میں نہ ڈھکیلیں"

غور فرمائیں کس دل سوزی سے اپنے عقیدت مند کو سمجھا رہے ہیں، کہ مجھ میں کوئی خوبی نہیں، کوئی کمال نہیں، اللہ اکبر یہ ہے ایک خدا رسیدہ بزرگ کا ظرف، دوسروں سے زیادہ اپنی ذات پر نظر، سارے کمالات و فضائل کے باوجود صرف عیوب و نقائص پر نگاہ:۔

"واللہ، ثم باللہ، ثم تاللہ میں اس قدر نالائق و ناہنجار، گنہگار، دنیا پرست سگ دنیا اور بدکردار ہوں کہ اگر محض اپنے فضل و کرم سے اس غفار الذنوب ستار العیوب نے کام نہ لیا، تو اشد الناس عذابًا اور اخسر الخاسرین میں ہوگا فلہ الحمد علی حلمہ وعلیٰ عفوہ بعد قدرتہ"

حق ہے اگر رب العالمین نے ایسے مرد خدا کو "شیخ العرب والعجم" بنایا، انسان ہو کر اپنی بے کسی، عاجزی اور گناہ کا ایسا استحضار و اظہار، پھر رحمت خداوندی کو اس پر پیار کیوں نہ آئے۔

سوچیں اور بار بار سوچیں کہ جس کا طریقۂ فکر یہ ہوگا، جو اوپر آپ نے ملاحظہ فرمایا، کیا ایسے شخص سے قصدًا کسی ایسے کام کا ارتکاب ممکن بھی ہے، جو منشار خداوندی کے خلاف ہو؟

شہرت وعہدہ سے گریز

حضرت اقدسؒ نے یہ سب لکھ کر تحریر فرمایا:۔

"میں آپ سے پھر خدا اور رسول (علیہ السلام) کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ اس قسم کے خطوط اور تحریروں کو اپنے یا اور کسی اخبار میں جگہ نہ دیں، امارت کے لئے بہت اہل اور لائق اشخاص موجود ہیں"

دیکھ رہے ہیں کہ ایک قطب وقت کس شدت سے اقتدار و عہدے

گریز اور پروپیگنڈے سے متنفر ہے، اسے ایک لمحہ کے لئے اپنی تعریف و توصیف برداشت نہیں۔

سوچیے کہ جس کے دل میں اپنے متعلق یہ جذبات و خیالات پرورش پا رہے تھے اور بغیر کسی تصنع اور تکلف کے، اس کی بڑائی میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے اور اس کے مراتب کا کون انکار کرسکتا ہے۔

دوسروں کی اہلیت کا اعتراف

حضرت شیخ الاسلامؒ ایک طرف اپنے کو چھپاتے تھے، دوسری طرف اپنے احباب کو ابھارنے کی سعی کرتے تھے، اور ان کی اہلیت کا علی الاعلان اعتراف فرماتے تھے اور دوسروں سے ان کی بڑائی منوانے کی کوشش کیا کرتے تھے، اسی امارت والے مسئلہ میں صرف یہ کہہ کر خاموش نہیں ہوگئے کہ "امارت کے لئے بہت اہل اور لائق اشخاص موجود ہیں" بلکہ اسی کے ساتھ یہ صراحت بھی فرمائی:-

"مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا انور شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب وغیرہ۔ میں ان حضرات کے دست مبارک پر بیعت امارت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اور انشاء اللہ حتی المقدور اطاعت کروں گا۔"

(مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ ص ۱۲۹، ۱۳۰)

یہ ہے ایک شیخ وقت کا حوصلہ، اپنے ساتھیوں کو اس طرح آگے بڑھانے کی جدوجہد فرما رہے ہیں، وہ لوگ جو خود ہی کو سب سے بڑھ کر سمجھنے کے مرض میں مبتلا ہیں بار بار پڑھیں اور سوچیں کہ جب آدمی میں بڑائی آجاتی ہے تو خود کس قدر ادنیٰ بن جاتا ہے اور دوسروں کو کس بلندی پر دیکھتا ہے۔

وہ لوگ درحقیقت چھوٹے ہوتے ہیں، جو دوسروں کو حقیر، کم علم، بے مایہ

اور ہیچ سمجھتے ہیں اور اپنی ذات کو عام لوگوں سے برتر منوانے کی کوشش کرتے ہیں، کاش عالمان دین کا نوجوان طبقہ اس نکتہ کو یقین کے ساتھ سمجھ لیتا، اور پھر ایک دوسرے کو آگے بڑھانے کی سعی بلیغ کرتا اور اپنی ذات سے بے پرواہ بن جاتا۔

اپنے آپ کو ننگ اسلاف لکھنے کی وجہ

"ننگ اسلاف" لکھنے کی بھی تشریح کی ہے، اور تواضع و انکساری کی آخری سرحد پر جا کھڑے ہوئے ہیں، لکھتے ہیں:-

"میرا اپنے آپ کو "ننگ اسلاف" کہنا اور لکھنا واقعیت کی بنا پر ہے کسر نفسی کی بنا پر نہیں، خدا کا شکر ہے، اس نے میری برائیوں پر پردہ ڈال رکھا ہے ورنہ لوگ مجھ سے اس سے زیادہ نفرت کرتے جتنی سور اور کتے سے کرتے ہیں" (مکتوبات شیخ الاسلام صہ ۱۱۲)

اللہ اکبر یہ ہے کسر نفسی اور تواضع کی انتہا، جو خود کو "ننگ اسلاف" کہا کرتا تھا، درحقیقت وہ ہماری نظروں میں نمونہ اسلاف تھا جس کی ظاہری و باطنی دونوں زندگی قابل رشک تھی اور اس لائق کہ اسے اپنی حیات کا نشان راہ بنایا جائے۔

ایک طرف مرکز علوم دارالعلوم دیوبند کے صدر نشین اور محدث جلیل تھے تو دوسری طرف جمعیۃ العلماء ہند کی مسند صدارت کی زینت اور کمانڈر انچیف بھی، اسی طرح ہزاروں علماء کے استاذ ہونے کے ساتھ لاکھوں مسلمانوں کے مرشد کامل بھی۔

کبھی اپنی برتری محسوس نہیں کی

حضرت الاستاذ شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمن اعظمی مدظلہ تحریر

فرماتے ہیں :-

"میں حضرت کے کمال بے نفسی سے بے حد متاثر تھا، علم و عرفان اور صلاح و تقویٰ میں جو اونچے سے اونچا پایہ آپ کا تھا اور شہرت و مقبولیت کا جو بلند ترین مقام آپ کو حاصل تھا ہر کس و ناکس کو معلوم ہے مگر اس کے باوجود کبھی محسوس نہیں ہوا کہ آپ ذرہ برابر بھی کوئی برتری اپنے اندر محسوس کرتے ہوں۔" (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص۲۳)

منھ پر تعریف کی جلسۂ عام میں شدید مذمت

ایک جلسہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اقبال سہیل صاحب کی مدحیہ نظم اور میرے کلمات تعظیم سن کر خاموش رہ جانا کیا گوارا کر سکتے تھے، کرسی پر بیٹھنے کے ساتھ خطبہ مسنونہ کے بعد سب سے پہلے منھ پر تعریف کرنے کی خوب خوب مذمت بیان کی، اور اس باب میں جو حدیث وارد ہوئی ہے پڑھ کر سنائی، اور اس کی تشریح فرمائی۔"

(ایضاً ص۲۳)

یہ ان علمار کرام کی شہادت ہے جنہیں بجا طور پر اساطین امت ہونے کا درجہ حاصل ہے، فضل و کمال میں بھی اور علم و عمل میں بھی، ان شہادتوں سے کیا معلوم ہوتا ہے؟ کاش ہمارے نوجوان علمار اسے دھیان سے پڑھیں اور اپنے اندر یہی جذبات و داعیات دین پیدا کریں۔

اہل علم کی بڑائی کو اجاگر کرنیکا جذبہ

مولانا عثمان غنی مدظلہ سابق مفتی امارت شرعیہ بہار لکھتے ہیں :-

"حضرت میں جو تواضع و انکسار تھا وہ ہر موقعہ پر ظاہر ہوتا تھا، ایک گفتگو میں مولانا محمد سہول صاحب (سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) نے فرمایا کہ "آپ

توشیخ الہند کے جانشیں ہیں،، حضرت نے فرمایا کہ معلوم نہیں کیوں آپ لوگ مجھ کو حضرت شیخ الہند کا جانشیں کہتے ہیں، مجھ سے ہر حیثیت سے بڑے شاہ صاحب (حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) اور مفتی صاحب (مفتی اعظم ہند حضرت علامہ محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ) ہیں ان کو جانشیں کہنا چاہیئے، حضرت مولانا محمد سہول صاحب نے فرمایا کہ زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھنا چاہیئے، مسلمان آپ کو شیخ الہند کا جانشیں کہتے ہیں، اس لئے آپ جانشیں ہیں ؎

(الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص۳۰)

پڑھیئے اور بار بار پڑھیئے اور غور کیجئے کہ حضرت والا کے جذبات کس قدر پاکیزہ تھے اور اپنی بڑائی کے تذکرے سے بھی کس حد تک گریزاں رہتے تھے، کسی منزل میں اپنے ہونہار اور ذی علم ساتھیوں کی بڑائی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، آج یہ جذبات کہاں باقی رہے کہ ایک ساتھی اپنے ساتھی کے فضل وکمال کی مختلف پیرائے میں تبلیغ کرے، خود بھی اعتراف کرے اور دوسروں کو بھی معترف بنانے کی سعی اور اپنی بڑائی اور پیشوائی پر قطعاً نظر نہ رکھے۔

اپنی تعظیم سے نفرت

شیخ الاسلامؒ اپنے لئے یہ بھی برداشت نہیں کرتے تھے کہ کوئی ان کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو، اور اگر کوئی خلاف ورزی کرتا تو سخت برہم ہوتے اور زجر وتوبیخ سے کام لیتے، چنانچہ مولانا القاضی زین العابدین سجاد صاحب میرٹھی مدظلہ استاد جامعہ ملیہ دہلی لکھتے ہیں :-

"برابر کے درجہ میں چائے کا انتظام تھا، اور مہمانان خصوصی حضرت کے برآمد ہونے کے منتظر تھے، یکایک کمرہ کا دروازہ کھلا اور حضرت تشریف

لاتے . . . دستور یہ تھا کہ آپ کی تشریف آوری پر کسی شخص کو تعظیماً کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی مگر بعض نئے زائرین جنہیں یہ دستور معلوم نہ تھا کھڑے ہو گئے، ان کے ساتھ میں بھی کھڑا ہو گیا. حضرت اپنی جگہ رک گئے جب تک سب کھڑے ہونے والے بیٹھ نہ گئے آگے قدم نہ بڑھایا . . . (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص۳۰)

مولانا مدظلہ نے اس کے بعد یہ بھی نقل لیا ہے کہ حضرت والا نے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

"آپ بھی کھڑے ہو گئے. کیا آپ نے یہ حدیث نہیں پڑھی جس میں ارشاد نبوی ہے لاتقوموا کما تقوم الاعاجم یعظم بعضہا بعضاً" (ایضاً)

اللہ اکبر یہ ابتداء فروتنی کا احساس اور حدیث نبوی پر عمل کا جذبہ صادق کبھی بھی تو آپ نے اپنے لئے کوئی بڑائی پسند نہیں کی، مگر اللہ تعالیٰ نے کیسا نوازا دنیا جانتی ہے کہ آپ جس مجلس میں پہنچ گئے سب پر چھا گئے ۔

اساتذہ اور شیوخ کا احترام

ایک طرف اپنی تعظیم کو بے حد ناپسند کرتے تھے دوسری طرف اپنے اساتذہ و اکابر کے جان نثار تھے. ادب و احترام کا کوئی جائز گوشہ ایسا نہ تھا جسے آپ نہ بجا لاتے ہوں حکیم الاسلام حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :-

"آپ اپنے اساتذہ اور شیوخ کے ابتدا ہی سے معتمد علیہ اور مرکز توجہ رہے اور بلا استثناء ان کے تمام اکابر اور شیوخ انھیں اطمینان و اعتماد، اور امید بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے، اس لئے آپ مختلف اساتذہ و شیوخ کی علمی و عملی یادگار تھے، قرآن و حدیث. فقہ و تفسیر، ادب و خطابت منطق و فلسفہ کی مہارت و حذاقت آپ کے قول و عمل سے نمایاں رہتی تھی"

(ایضاً ص۱۲۷، ۱۲۳)

یہ اس شخصیت کی شہادت ہے جو بلا مبالغہ ہندوستان و پاکستان کا آج سب سے بڑا مخلص عالم اور حکیم الاسلام ہے جس نے کم و بیش نصف صدی تک قریب سے رہ کر حضرت اقدسؒ کا مطالعہ کیا ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ حضرت نے اسارت مالٹا کی تکلیف اس لئے برداشت کی کہ اپنے محبوب استاذ حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت کی سعادت حصہ میں آسکے اس کی تفصیل "اسیر مالٹا" نامی کتاب میں پڑھی جا سکتی ہے۔

اپنے اساتذہ اور شیوخ کے جاں نثار تو تھے ہی آپ کا کمال یہ تھا کہ اپنے اساتذہ اور شیوخ کے متعلقین اور صاحبزادوں کی تعظیم اور ادب و احترام میں بھی زندگی بھر کبھی فرق نہیں آنے دیا۔

بیعت کرنے سے احتراز

شیخ الاسلامؒ ابتدا میں بیعت کرنے سے بے حد گریزاں رہتے تھے، اور آخر میں بھی بے انتہا ٹالتے اور منع فرماتے، جب کوئی صورت بچنے کی نہ ہوتی تو کہیں جا کر بیعت فرماتے، دراصل یہ بھی انکساری اور تواضع ہی کا اثر تھا، مولانا احمد حسین لاہرپوری لکھتے ہیں :۔

> "ایک دن خدمت میں حاضری دینے کے بعد میں نے حلقۂ غلامی میں شمول کی درخواست کی، یہ وہ زمانہ تھا کہ بیعت شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی، نہایت انکساری سے معذرت فرمائی اپنی عدم صلاحیت پر ایک طویل تقریر فرمائی اور حضرت مولانا تھانوی اور دیگر حضرات کی طرف رجوع کرنے کو فرمایا لیکن میرا اصرار بڑھتا رہا، عاجز آکر نماز استخارہ پڑھنے کی ھدایت فرمائی تین یوم بعد پھر حاضری دی تو صاف انکار کر دیا" (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص۱۳۲)

یہ حال تھا ایک شیخ وقت اور پیر طریقت کا، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اسے کہتے ہیں ذمہ داری کا احساس اور اپنی خاکساری کا استحضار کہ قلب جلد

ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا کہ تو بھی کوئی حیثیت رکھتا ہے اور اتنے اہم کام انجام دے سکتا ہے۔

شیخ الاسلام کا مقام اتباع سنت میں

مولانا لاہوری نے لکھا ہے کہ جب پیر حسب الحکم پیر غلام مجدد صاحب سندھی کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اپنے خیالات کا اظہار کیا تو پیر صاحب نے قرآن مجید بند کر دیا جس کے پڑھنے کا اکثر اوقات معمول تھا اور فرمایا:۔

"میرے ہاتھ میں قرآن مجید ہے، میں بہ حلف کہتا ہوں کہ جیل میں میں نے جو حالات مولانا مدنی کے بچشم خود دیکھے ہیں، ان کی بنا پر میری رائے ہے کہ اس وقت روئے زمین پر مولانا صاحب کا ثانی بزرگی اور اتباع شریعت کے لحاظ سے نہیں ہے، آپ ہرگز مولانا صاحب کا دامن نہ چھوڑیئے، اگر مولانا صاحب نہ ہوتے تو میں آپ کو مرید کر لیتا" (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص۱۲)

آپ کی بزرگی میں کیا کسی کو ایسے صالح اور بزرگ کی گواہی کے بعد بھی کوئی شبہ ہو سکتا ہے جو قرآن ہاتھ میں لے کر کہہ رہا تھا کہ میری رائے میں روئے زمین پر بزرگی میں مولانا مدنیؒ کا کوئی ثانی نہیں۔

بیعت کرنے پر کیسے راضی ہوئے

یہاں یہ بات بھی بتا دینی کی ہے کہ ابتداءً آپ نے بیعت کرنا کیسے شروع کیا، مولانا لاہوری لکھتے ہیں :۔

"ایک بار حضرت حکیم مسعود احمد صاحب صاحبزادۂ حضرت قطب عالم مولانا گنگوہیؒ قدس سرہ سے ملنے گنگوہ تشریف لے گئے، حکیم صاحب نے فرمایا کہ آخر آپ بیعت کیوں نہیں فرماتے، فرمایا میں اس کا مطلق اہل نہیں ہوں،

اس پر حکیم صاحب بہت برہم ہوئے، اور فرمایا آپ میرے والد مرحوم پر تہمت لگاتے ہیں کہ انھوں نے ایک نا اہل کو مجاز فرما کر اجازت بیعت دی، حضرت دیر تک بیٹھے روتے رہے، پھر حکیم صاحب کے ایما پر حضرت قطب عالم گنگوہیؒ کی قبر مبارک پر کچھ دیر مراقب رہے، اس کے بعد بیعت کا عام سلسلہ جاری ہوگیا" (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص۱۲)

اندازہ لگائیے حضرت والا کی طبیعت میں کس قدر تواضع تھی، اور ساری صلاحیتوں کے باوجود کتنی منتوں کے بعد کہیں جاکر بیعت کرنے کے لئے آمادہ ہوئے اس واقعہ سے معلوم ہوا بیعت کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا، محض اپنے مرشد کی اجازت کی لاج اور تبلیغ دین کا جذبہ تھا جس نے اس کام کے لئے آپ کو آمادہ کیا۔

رجوع عام کا حال

اور پھر تو یہ حال ہوگیا کہ آپ کے لاکھوں مرید تھے، اور ایک ایک دن میں ہزاروں کی تعداد مخلوق خدا بیعت ہوتی تھی، جس کی مثال اس دور میں کہیں نہیں ملتی، چنانچہ لکھا ہے :-

"اس قدر مرجع خلائق ہوئے کہ گذشتہ سال (۱۹۵۶ء) بانس کنڈی آسام میں چھ چھ ہزار اشخاص بیک وقت داخل سلسلہ ہوئے" (ایضاً ص۱۲)

غور کریں جس کے دست مبارک پر بیک وقت چھ چھ ہزار اشخاص نے بیعت کی ہو، اس کے قبول عام کا کیا حال ہوگا، ایک طرف عوام و خواص میں قبولیت کا یہ عالم، دوسری طرف خاکساری و انکساری کا وہ حال جو آپ پڑھتے آرہے ہیں۔

کیا ان واقعات میں ہمارے لئے کوئی سبق نہیں ہے؟ اور اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر کیا ہمیں اس راہ عمل پر چلنا ہے مگر ہزار کا چاہئے جس پر چل کر آپ نے

دین و دنیا دونوں کی دولت حاصل کی، کاش عالمان دین کا وہ قافلہ جو تنگ دلی و کم حوصلگی کا شکار ہوتا جا رہا ہے اور اپنی منزل مقصود سے بہت دور جا پڑا ہے سوچتا اور اسلاف کی سی بے غرضی اپنے اندر پیدا کرتا، تاکہ ان کا کھویا ہوا وقار پھر ان کے قدموں سے آلگتا۔

بے تکلفی وسادگی

حضرت شیخ الاسلامؒ اپنے سارے فضل وکمال کے باوجود بے تکلف واقع ہوئے تھے، بعض لوگوں میں اپنی بڑائی کا جو غلط قسم کا زہر سرایت کئے ہوتا ہے، حضرت اقدس اس سے بالکل پاک وصاف تھے، یہی وجہ تھی کہ ہر چھوٹے بڑے سے یکساں خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور جو جہاں تبلیغ حق کے لئے بلاتا تھا تشریف لے جاتے تھے، طبیعت میں تواضع تھی اس وجہ سے کسی سے کبھی آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی، چنانچہ لکھا ہے:۔

"بعض اوقات دور دراز دیہاتوں میں بیل گاڑی میں لے جاتے تھے اور حضرت بے تامل اس میں سفر کرتے تھے، دعوت حق کے لئے آپ نے پورے ہندوستان کا دورہ فرمایا جس سے لاکھوں آدمیوں نے فائدہ اٹھایا"

(الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ۱۳)

اب یہ سادگی ہمارے علماء سے اٹھتی جارہی ہے کہیں جانے سے پہلے سواریوں کا مسئلہ طے کرایا جاتا ہے، ہمارے تیئے کوئی بات بھی کرنے کو تیار نہیں ہوتا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں تبلیغ حق کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہاں کوئی بھی نہیں پہنچتا، حالانکہ انھیں سوچنا چاہئے کہ تبلیغ دین کیلئے صعوبتوں کا برداشت کرنا سنت طریقہ ہے۔

حضرت شیخ الاسلام اپنی سادگی کی وجہ سے گمنام سے گمنام دیہات میں پہنچ جاتے تھے اور کلمات خیر کی تبلیغ فرمایا کرتے تھے، راستہ کی صعوبتوں اور

مشکلات کی کبھی کوئی پرواہ نہیں کی۔

حساب کتاب کی صفائی

حضرت جہاں گئے حساب وکتاب بالکل پاک وصاف رکھا نذرانہ کے نام سے عوام کی کوئی رقم ہرگز قبول نہیں کرتے تھے، اخراجات سفر کے لئے جو رقم بھیجی جاتی تھی اس کا حساب داخل فرماتے تھے، اور جو بچ جاتا واپس فرماتے تھے، چنانچہ مولانا عثمان غنی صاحب سابق مفتی امارت شرعیہ لکھتے ہیں:۔

"پہلی بار باڑھ (ضلع پٹنہ) تشریف لائے تو مئی آرڈر سے کرایہ ریل کے لئے کچھ روپیہ بھیجے تھے، جلسہ کے بعد جب واپسی کا وقت آیا تو لوگوں نے ایک بڑی رقم پیش کی، حضرت نے فرمایا ٹھہریئے، لوگوں نے سمجھا کہ حضرت نے اس رقم کو کم سمجھ کر ایسا فرمایا ہے، تو اس میں اضافہ کرکے دینے والے نے ہاتھ میں لیا، اتنے میں حضرت نے بکس سے کچھ روپئے اور حساب نکال کر دیا اور فرمایا کہ آپ نے جو روپئے بھیجے تھے اس کے خرچ کا حساب ہے اور یہ روپئے بچ گئے ہیں، لوگوں نے اصرار شروع کیا کہ حضرت حساب اور بچی ہوئی رقم کو رہنے دیں اور جو رقم دی جارہی ہے اس کو قبول فرمائیں لیکن حضرت نے انکار فرمادیا، حضرت کا یہ طریقہ تھا جو رقم سفر میں خرچ ہوتی تھی اتنی ہی لیتے تھے اور باقی واپس فرمادیتے تھے"

(الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص)

سچ پوچھئے تو یہی طریقہ ہمارے اسلاف کا تھا اور اسی کا ثمرہ تھا کہ دین کی آواز دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچی اور کوئی طاقت اسے روک نہیں سکی، اکابر میں اخلاص وایثار تھا، معاملات کی صفائی تھی اور حرص وآز سے ان کا دامن یکسر پاک تھا۔

پھر خودداری اور عزت نفس کا ہر آن احساس تھا، نہ کسی کا احسان قبول

نہیں کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ یہ بیباک صاف گو اور نڈر رہوا کرتے تھے، جو بات کہنی ہوتی تھی برملا کہتے۔

عزیمت اور استقلال

شیخ الاسلامؒ ایک باعزیمت انسان تھے، حق گوئی آپ کا خاص شیوہ تھا، غور و فکر کے بعد جب یہ طے کر لیتے تھے، کہ یہ کام کتاب و سنت کے مطابق ہے، اس کا کیا جانا ضروری ہے، اور یہ فریضہ مجھ پر عائد ہوتا ہے، چنانچہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :-

"اگر میں حق پر ہوں، اور مخلصانہ مذہبی اور اسلامی خدمات کر رہا ہوں۔ تو غیروں اور اپنوں سے کچھ بھی اذیتیں پیش آئیں یا آرہی ہیں ان کے لئے اسلاف کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے احوال اور اعمال مشعل راہ ہیں جو جو مصائب انبیاء کرام اور اولیائے عظام اور مقدس علماء کو پیش آئی ہیں۔ ان کے سامنے ہمارے مصائب تو وہ بھی نسبت نہیں رکھتے، جو ذرہ کو پہاڑ سے ہے" (مکتوبات شیخ الاسلام ج۲ ص۲۴۴)

دیکھ رہے ہیں عزیمت کا حال اور پھر نظر کہاں ہے نام و نمود پر؟ سیاسی موقف اور داد و تحسین پر؟ یا کسی دنیاوی عزت و لالچ پر؟ ہرگز نہیں بالکل نہیں، بلکہ انبیاء کرام کا اسوہ ہے، اولیاء عظام کی صاف ستھری زندگی ہے اور مقدس علماء کی تاریخی جدوجہد ہے جہاں جاکر آپ کی نگاہ رکتی ہے۔

جرأت و ہمت

ایک مرتبہ شاہجہاں پور میں حضرت اقدس کی تقریر سے مخالفین میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ کہنے لگے اب اگر آنا ہو تو کفن لے کر آنا، حضرت کب حق کے کہنے میں دب سکتے تھے فوراً فرمایا دوسرے دن جمعہ کو اسی جگہ تقریر ہو گی، یہ کہہ کر واپس

تشریف لے آئے، دوسرے جمعہ کو سب کام کو چھوڑ کر سید سے شاہجہانپور پہنچے، اس شان سے کہ بغل میں کپڑے کی ایک گٹھری دبی ہوئی ہے، جلسہ گاہ میں تشریف لے گئے گٹھری کھول کر مجمع کو دکھائی کہ حسب الحکم میں کفن لے کر آیا ہوں، اور پھر تقریر شروع کی، اور گذشتہ سے زیادہ زوردار تقریر فرمائی۔

ہمت وجرأت کا نتیجہ

یہ تقریر بیکار نہیں گئی بلکہ لکھا ہے:۔

"اعلاء کلمۃ اللہ میں اس ہمت وجرأت کا یہ اثر ہوا کہ مخالفین کی اکثریت بدعت سے تائب، معافی کی خواستگار، اور داخل سلسلہ ہوئی"

(الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص۳۹)

آپ نے غور کیا کہ یہ جرأت وہمت کہاں سے آئی؟ اسی دینی تعلق اور اسلامی محبت نے آپ میں پہاڑ کی سی مضبوطی پیدا کردی تھی جو آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا، اگر اخلاص وللہیت دل میں جاگزیں نہ ہوتی، تو مخالفین کی مخالفت اور ان کی دھمکی سے سہم جاتے اور ہمت جواب دے جاتی۔

برسر اجلاس اعلان حق

کراچی کا مشہور مقدمہ جس میں علمبرداران حریت مصائب سے دوچار ہوئے، اور انگریزی مظالم کے شکار، اس مقدمہ میں شیخ الاسلام نے جو بیان انگریزی عدالت میں ہزاروں آدمیوں کے سامنے دیا تھا وہ تاریخ ہند کی کتابوں میں آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے اس میں بیان دیتے ہوئے برسر اجلاس آپ نے فرمایا:۔

"آج انگریز گورنمنٹ کی فوجی بھرتی اس لئے حرام ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان کے مارنے کے لئے بھرتی کیا جارہا ہے، عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ ہے

قرآن شریف میں مسلمانوں کو قتل کرنے کی سخت ممانعت ہے، مسلمان کے لئے مسلمان کو قتل کرنا حرام ہے۔ اس لئے یہ ملازمت بھی حرام ہے۔"

(تذکرہ شیخ مدنی ص۱۵۲)

اسے کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں حق گوئی و بے باکی، غیر ملکی حکومت ہے، خون کی پیاسی ہے، جو بیان دے رہے ہیں سراسر باغیانہ ہے جس کی سزا پھانسی اور قتل ہے مگر کوئی خوف نہیں دلیری کے ساتھ جو حق بات ہے۔ علی الاعلان فرما رہے ہیں، اس کی قطعاً فکر نہیں ہے کہ کل پھانسی کے تختہ پر لٹکایا جاؤں گا یا کیا سزا بھگتنا پڑے گی۔

کمشنر سندھ جو ایک عیسائی تھا، حیرت زدہ تھا کہ یہ عجیب و غریب قیدی ہے، کس بے باکانہ انداز میں بیان دے رہا ہے، اسے اس کی قطعاً فکر نہیں ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

بیباکی و حق گوئی

کمشنر نے چھیڑنے کے لئے کہا کہ "بعض علماء فوج کی نوکری کو جائز کہتے ہیں" یہ سن کر آپ پر جلال طاری ہو گیا اور فرمایا:۔

"اگر کوئی مسلمان عالم دین ہمیں قرآنی احکام کی تعمیل سے روکے گا تو ہم اس کی بات ہرگز ہرگز نہیں مانیں گے کیونکہ ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے خالق کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی اطاعت درست نہیں ہے۔"

(تذکرہ شیخ مدنی ص۱۳۳)

خوب غور کیجئے یہ کونسا جذبہ ہے، جو پھانسی کے تختہ پر یہ اعلان حق کرا رہا ہے، واقعہ ہے جس دل میں اسلام کی محبت پیوست ہو جاتی ہے، وہ خدا کے سوا کسی کے آگے نہیں جھکتا، اور جو خدا کا ہو جاتا ہے وہ کسی بڑی سے بڑی حکومت کو بھی نظر میں نہیں لاتا۔

جدوجہد آزادی

اسی کراچی کے مقدمہ میں جیل سے جو خط اہل دیوبند کے نام لکھا ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں :-

"ہم کو اتنی ضرورت ہے کہ اس خدمت ضروریہ اور لازمی عمل درآمد میں اگر ہماری بھی کچھ ٹانگ اڑجائے، ہمارے قول، فعل، مال، جان کسی کو بھی دخل ہو جائے، تو کل قیامت کے دن منھ دکھانے کو جگہ ہوگی کل ہم رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے اور حضرت رب العزت کے سامنے یہ تو کہہ سکیں گے کہ ہم نے اپنی طاقت کے موافق کوئی کمی نہیں کی" (تذکرہ شیخ مدنی ص۱۳۶)

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ کل آپ نے ملک کی آزادی اور برطانوی حکومت کے خاتمہ کی جو جدوجہد کی تھی، وہ آپ کی نظر میں دینی خدمت نہیں تھی۔

حق کیلئے تکلیف پر مسرت

شیخ الاسلام کی پوری زندگی شاہد ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا، خدا کے لئے کیا، دین قیم کے لئے کیا، کراچی کا مشہور مقدمہ، اور پھر اس کا فیصلہ جب جیل کی صورت میں ہوا، تو بڑے اطمینان سے آپ نے یہ ایام قید میں گذارے، زبان پر کبھی کوئی شکوہ نہیں آیا، بلکہ وابستگان اور دوستوں کو لکھا:-

"آپ لوگوں کو میری جدائی، اور میری تکلیف کا ادنیٰ درجہ بھی خیال نہیں ہونا چاہئے، آپ کو اسلام کا درد ہونا چاہئے، دین محمدی کی فکر ہونی چاہئے، دشمنان اسلام نے ہزاروں نہیں لاکھوں خاندان برباد

کردیئے" (تذکرہ شیخ مدنی ۱۳۶)

ملاحظہ فرمائیں، فکر اپنی نہیں ہے، دین قیم کی ہے، گھر بار کی نہیں مسلم قوم کی ہے، اور دوگوں کو بھی اسی کا مشورہ دیا جارہا ہے کہ اس کی فکر نہ کرو کہ حسین احمد جیل میں ہے، فکر اس کی کرو کہ مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جارہے ہیں اور ناموس ملت پر حرف آرہا ہے۔

نام ونمود سے نفرت

کراچی مقدمہ کی شہرت پورے ملک میں گونج رہی تھی، شیخ الاسلامؒ پر لوگ جانیں چھڑک رہے تھے، جیل سے رہائی ہوئی تو اس خوشی میں عقیدتمندوں نے بڑی بڑی تیاریاں کیں، جلوس کا اعلیٰ پیمانہ پر نظم کیا مگر آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ شیخ الاسلامؒ نے اس کی نوبت نہیں آنے دی، مولانا راشد لکھتے ہیں:

"چنانچہ دیوبند میں اپنے سردار مولانا حسین احمد مدنیؒ جو محبوب عالم تھے، ان کے استقبال کی تیاریاں شروع ہوئیں، ہر ہر گھر میں عید کی سی خوشی، دیوبند کا ہر ہر فرد اپنے آقا کی آمد پر بہت سے زیادہ استقبال کی تیاری میں مصروف تھا، کراچی تار دیئے گئے، لاہور میں آدمی متعین تھے کہ فوراً اعلان کردیں، مگر کہیں سے کوئی اطلاع نہیں آئی، شہر دیوبند اسی الجھن میں تھا کہ رات کی تاریکی میں تن تنہا حضرت شیخ الہندؒ کے مکان پر تشریف لائے۔ جب سب حضرات غافل سو رہے تھے" (تذکرہ شیخ مدنی ۱۵۲)

ملک کی آزادی فریضہ کے درجہ میں

ملک کی آزادی میں برطانیہ کی مخالفت صرف اس لئے کی کہ آپ اسے ایک دینی فریضہ جانتے تھے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند میں جب انقلابی دور آیا اور شیخ الاسلامؒ کو آپ کے استاذ محترم جانشین قاسم العلوم حضرت مولانا

حافظ احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے صدر مدرسی کے لئے مجبور کیا تو آپ نے فرمایا :-

"میں حکم کی تعمیل کے لئے مجبور ہوں مگر حضور یہ فرمادیں کہ میں انگریز کے خلاف حضرت شیخ الہندؒ کی تجاویز کو پورا کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں اور جب تک زندہ ہوں انگریز کے خلاف کروں گا، یہاں تک کہ ملک آزاد ہو، اور انگریز گورنمنٹ کا وجود ہندوستان میں باقی نہ رہے، اور دارالعلوم کی پالیسی یہ ہے کسی تحریک میں کوئی ملازم حصہ نہ لے، اس کے جواب میں حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک زبان ہو کر فرمایا کہ دارالعلوم کے تمام قوانین سے آپ مستثنیٰ رہیں گے" (تذکرہ شیخ مدنی ص۱۵۲)

استاذ کے لئے بے پناہ محبت اور استاذ کے لئے تحمل

جس زمانہ میں آپ کا قیام مدینہ منورہ میں تھا، اور حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری عمل میں آئی، آپ بے چین ہو گئے اور پوری جدوجہد کی کہ مجھے حضرت کے پاس پہنچا دیا جائے، خود "اسیر مالٹا" نامی رسالہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

"چونکہ میں مدینہ منورہ سے فقط مولانا شیخ الہندؒ کی خدمت کے لئے نکلا ہوں، اس لئے مجھ کو خدمت میں رہنا ضروری ہے، اگر جدہ سے مولانا ہندوستان تشریف لے گئے، تو مجھے ساتھ رہنے کی ضرورت نہیں، وہاں مجھ سے اعلیٰ اعلیٰ خدام موجود ہیں، اور اگر کسی دوسری جگہ بھیجا گیا، تو میرا ساتھ رہنا ضروری ہے، اس لئے جس طرح ممکن ہو، مجھے مولانا شیخ الہندؒ کے پاس بھجوا دیجئے" (انفاس قدسیہ ص۲۵)

طلبہ سینہ پر ہاتھ رکھ کر اپنے دلوں کا جائزہ لیں کہ کیا اب بھی وہ اپنے

استاذ کے لئے ایسی قربانی دے سکتے ہیں ؟

آخر یہ کونسا جذبہ تھا جو ہر جگہ شیخ الاسلامؒ کو بے چین کئے رہتا تھا، کاش ہمارے زمانہ کے شاگردان باتمیز تھوڑی دیر یکسو ہوکر اس مسئلہ پر سوچتے،

حضرت اقدس کی مہمان نوازی

حضرت شیخ الاسلامؒ کی مہمان نوازی کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں ہے، لکھا ہے :-

"آپ مہمان کی صورت دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے، حقیقۃً آپ مہمان کو محبوب (اللہ تعالیٰ) کا تحفہ سمجھتے تھے، مہمان کی ذراسی تکلیف گوارا نہ تھی آپ کا فرمانا تھا کہ جس نے مہمان کو تکلیف پہنچائی، میں اس کو معاف نہ کروں گا، چاہے میرے علم میں آئے یا نہ آئے" (انفاس قدسیہ ص۳۱)

اب یہ جذبات عام علماء سے بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں، دنیا کی ہوس میں یہ بھی بتدریج گرفتار ہو رہے ہیں اور بھولتے جا رہے ہیں کہ یہ مہمان نوازی سنت رسول ہے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کی زندگی کے اس حصہ سے ہم سب کو سبق لینا چاہئے اور اخلاق کی بلندی کے لئے سعی پیہم کرنی چاہئے، تاکہ علماء کی بدنامی ختم ہو۔

غیروں کو اعتراف

حضرت شیخ الاسلامؒ کی مہمان نوازی کا اقرار صرف اپنوں کو ہی نہیں ہے بلکہ غیروں کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ اچاریہ کرپلانی سابق صدر کانگریس نے کہا تھا :-

"میں ان کے ساتھ جیل میں رہا ہوں، ان کا ڈھنگ نرالا تھا، اکیلے کبھی

کھانا نہ کھاتے تھے، بلکہ دوسرے معمولی قیدیوں کو بھی شامل کر لیتے تھے۔" (انفاس قدسیہ ص۱۳۲)

اسے کہتے ہیں ایثار و اخلاص، جیل میں بھی تنہا کھانا پسند نہیں کرتے تھے، اور معمولی درجہ کے قیدیوں کو اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو بڑا بننے کی سعی کرتے ہیں، ان حالات کا بغور مطالعہ کریں، اور ان اوصاف کا اپنے کو حامل بنائیں ۔

جیل میں اخلاق

ایک دوسرے ہندو سیتارام جی سوکل لکھتے ہیں :۔

"بھائی بھائی برابر ہیں، یہ کہتے ہوئے بہتوں سے سنا ہے، لیکن برابری کا برتاؤ صرف مولانا حضرت شیخ الاسلامؒ کو کرتے دیکھا، کھانا پکاتے وقت باورچی، باورچی رہتا تھا اور آپ مالک رہتے تھے، لیکن کھاتے وقت باورچی اور مالک ایک ہوتے تھے، یہی نہیں صرف ایک پاؤ گوشت مولانا کو ملتا تھا، لیکن کھانے کے وقت جو بھی آکر بیٹھ جاتا اسے کھانے میں حصہ مل جاتا تھا، پتہ نہیں تھا کہ جیل میں کب تک رہنا ہوگا، لیکن اگر کوئی معمولی قیدی کھانے کے وقت آ گیا تو اس کا کھانا اور اپنا کھانا ملا کر اس کو اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔" (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص۱۰)

دیکھ رہے ہیں مساوات پر عمل کہاں ہو رہا ہے؟ جیل میں جہاں نپا شوربا اور گنی بوٹی ملا کرتی ہے۔

کیا آج بھی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے، یہ تو نہیں کہتا کہ اس کی مثالیں ناپید ہیں، لیکن کم ضرور ہیں، کہنا واقعی آسان ہے، کہنے کو سب کہتے ہیں، مگر عمل ہر ایک کے بس کی بات نہیں ۔

☆ ☆ ☆

دلدہی

انھیں سیتا رام جی سوکل نے یہ بھی لکھا ہے :-

" ایک روز ایک قیدی نے آکر فریاد کی کہ نماز پڑھتے وقت میرے پاس فلاں قیدی بھی تھا، اس نے میری اٹھنی چرالی، مولانا نے کہا میں کیا کروں، میں بھی تمہاری طرح قیدی ہوں، لیکن جب اسے زیادہ رنجیدہ دیکھا، تو اپنے پاس سے اٹھنی دے کر رخصت کیا"

(الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص۳۶)

اس کا نام ہے انسانی ہمدردی، کہ کسی کی اداسی آپ سے دیکھی نہیں جاتی، اور کسی کو رنجیدہ دیکھ کر اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک اسے خوش نہ دیکھ لیتے۔

یقین کیجئے اعمال واخلاق کی پاکیزگی بڑی نعمت ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت میں سب سے بڑھ کر دخل اخلاق ہی کو ہے۔

ایک غیر مسلم کا تاثر

چنانچہ اس واقعہ کو نقل کر کے خود ان ہی رام جی سوکل نے لکھا ہے :-

"اسے دیکھ کر میں نے مولانا سے برجستہ عرض کیا کہ اب میں آپ کے ساتھ اس بیرک میں نہ رہوں گا، کیونکہ آپ کا اخلاق اتنا وسیع ہے کہ اگر میں تھوڑے دن اور رہا تو میں بھی مسلمان ہو جاؤں گا" (ایضاً)

کیا اس طرح کے واقعات سے بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلیں گی ؟ مسلمانوں کو سوچنا چاہیے۔ وہ کیا بن کر آئے تھے اور کیا بن رہے ہیں، ہندوستان میں اب بھی اسلام کی اشاعت کی گنجائش ہے بشرطیکہ سارے مسلمان اپنے اندر اس اخلاق واعمال کو پیدا کرلیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

اور صحابہ کرامؓ میں تھے ۔

ہمارے علماء اور طلبہ کے لئے اس طرح کے واقعات میں اور بھی درس عبرت ہے، کاش ان کی آنکھیں کھلیں اور وہ اپنی ذمہ داری محسوس کریں ۔ ؎

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے
تو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے

مہمانوں کا ہجوم اور آپ کی مسرت

ڈاکٹر محمد اشرف ایک مشہور کمیونسٹ لیڈر ہیں، وہ لکھتے ہیں :۔

"جنگ عظیم کے بعد اشیاء کی گرانی، مولانا کی قلیل آمدنی، بلیک مارکیٹ کا زور، مگر اس سے حضرت مولانا شیخ الاسلامؒ کی مہمان نوازی میں کیا فرق آسکتا تھا اور جب مجھ جیسے نسبتاً انجان اور بے دین کو مولانا نے باصرار اپنے مکان پر ٹھہرایا، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سیاست، رشتہ داری، دوستی اور درس تدریس کے واسطہ سے مہمانوں کا کیا ہجوم رہتا ہوگا جب میں مولانا کی رہائش گاہ پر پہنچا تو اٹھارہ مہمانوں کا قافلہ پہلے سے موجود تھا" (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص۲۹)

اس گرانی و پریشانی کے عالم میں جب مہمانوں کی یہ تعداد ہوا کرتی تھی، تو خود اندازہ لگایئے عام طور پر کتنے مہمانوں کی بھیڑ ہوتی ہوگی مگر مولانا مدنی قدس سرہ نے جس خندہ پیشانی سے فرائض میزبانی ادا کئے وہ اپنی آپ مثال ہے، نہ اس کی پرواہ کی کہ اشیاء کی گرانی ہے نہ اس کا اندیشہ کہ مشاہرہ کم ہے ۔ جو آیا حضرت نے باصرار اسے اپنا مہمان بنایا، اور مہمان بنا کر خوش ہوئے ۔

❖ ❖ ❖

حضرت مولانا علامہ عثمانی کی نظر میں

حضرت شیخ الاسلامؒ کی علمی و عملی یہی خوبیاں تھیں، جن سے متاثر ہوکر دار العلوم دیوبند کے مجمع عام میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے آپ کے متعلق فرمایا تھا، اور بالکل درست فرمایا تھا کہ :-

"بھائیو! اس سے زیادہ میں کیا کہہ سکتا ہوں، میرے علم میں بسیط ارض پر شریعت و طریقت و حقیقت کا حضرت مولانا مدنی سے بڑا کوئی عالم موجود نہیں" (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر صـ۲)

واقعہ ہے شیخ الاسلامؒ جامع اوصاف و کمالات تھے، اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائیں، آپ کے عقیدت مندوں میں آپ کا سا اخلاص و ایثار اور اخلاق و اعمال پیدا فرمائیں۔

یہ اس مشہور عالم دین کا بیان ہے جو آپ کے ساتھی اور ہم استاذ وہم مدرسہ تھے۔ جن کی زندگی کا بڑا حصہ آپ کے ساتھ گذرا تھا، اس لئے ان سے زیادہ حضرت والا کو اور کون جان سکتا ہے، اب ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں رہے، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائیں۔

خادم اسلام کی خدمت

خادم اسلام کی حضرت مولانا مدنیؒ بڑی عزت کیا کرتے تھے، خواہ خرد سال ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا بیان ہے :-

"یوپی میں میری تقریر تھی، رات کو تین بجے تقریر سے فارغ ہوکر لیٹ گیا، بین الیقظہ والنوم مجھ کو محسوس ہوا، کوئی میرا پاؤں دبا رہا ہے، میں نے جی میں کہا خیر مجھ کو عادت ہے، کوئی دوست ہوگا، سر اٹھایا تو دیکھا کہ حضرت شیخ مدنیؒ ہیں" (انفاس قدسیہ صـ۵۲)

اب یہ جذبہ خدمت گذاری علماء میں کہاں باقی رہا، وہاں پیش نظر یہ تھا کہ دین کا خدمت گذار تھکا ماندہ ہے، عادت بھی ہے چلو تم ہی یہ خدمت انجام دے لو، ورنہ دنیا جانتی ہے کہ جہاں کا بھی یہ واقعہ ہے حضرت کے ماننے والوں اور شاگردوں کی کمی نہیں تھی، کسی سے بھی اس خدمت کو کہدیا ہوتا، لیکن یہاں سوال تو خود ثواب دارین حاصل کرنے کا تھا اور چھوٹوں میں جذبہ صادق پیدا کرنے کا۔

صدر جمہوریہ کے یہاں جانے سے گریز

دنیاداروں سے ہمیشہ کنارہ کش رہا کرتے تھے، کبھی اپنی اس وضع میں فرق نہیں آنے دیا، لکھا ہے کہ غازی آباد میں جلسہ تھا، آپ بھی تشریف لے گئے ایک صاحب نے کہا حضرت دہلی تشریف لے چلیں، پوچھا کس لئے، کہنے لگے صدر جمہوریہ کے پاس جانا ہے، آپ نے فرمایا:-

"مجھے کیا ضرورت ہے کہ وہاں جاؤں، وہ بادشاہ میں فقیر، میرا ان کا کیا جوڑ، اب وہ پہلے والے راجندر پرشاد نہیں ہیں، اب تو وہ بادشاہ ہیں"

(انفاس قدسیہ ص۵۳)

آپ نے کچھ سمجھا؟ راجندر پرشاد کے یہاں تو جا سکتے تھے، لیکن جب وہ حکومت کے آدمی ہو گئے اور اپنے کو بادشاہ سمجھنے لگے تو پھر ان کے پاس جانا شیوۂ فقیری کے خلاف ہے، شاید ان کے یا کسی کے دل میں یہ نہ گذرے کہ بڑوں کے آگے جھکنا پڑا، پھر جو حکومت سے وابستہ ہو۔ بالخصوص ایسی حکومت سے جہاں انصاف کے بجائے ظلم ہوتا ہو، مساوات کی جگہ اقلیت و اکثریت کی تمیز برتی جاتی ہو، وہ خود بھی ان لوگوں کی صف میں آجاتا ہے جو ظلم و تعدی کے گناہ میں ڈوبے ہوتے ہیں، اس لئے ایسے لوگوں سے جس قدر دور رہا جائے اچھا ہے۔

سرکاری لوگوں سے پرہیز

ایک مرتبہ کسی صاحب نے درخواست کی کہ حضرت! میرا فلاں کام اٹکا ہوا ہے، نہیں ہو رہا ہے، براہ کرم میرے لئے ایک سفارشی چٹھی لکھ دیجئے، یہ سن کر حضرت اقدس نے فرمایا :-

"میری ان سے رسم الفت مٹ گئی
مدتیں گذریں، زمانہ ہوگیا"

(انفاس قدسیہ ص۵۳)

حکومت کے آدمیوں سے اجتناب اسی کا نام ہے، کل تک جس سے بے تکلفی تھی، جنگ آزادی میں ساتھ مل کر کام کیا تھا، مگر آج جب وہ حکومت کے کارکن بن گئے، حضرت والا نے ان سے راہ رسم رکھنا بھی گناہ محسوس کیا -

وزیر دفاع سے بے پروائی

ایک دن مہابیر تیاگی سابق وزیر دفاع آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ خندہ پیشانی سے پیش آئے اور چائے مٹھائی پیش کی، مگر جب چلتے ہوئے انھوں نے یہ درخواست کی، حضور! میری خواہش ہے کہ کوئی خدمت میرے سپرد کریں، تب حضرت نے ارشاد فرمایا :-

"تمہیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی
چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی"

(انفاس قدسیہ ص۵۳)

اسے کہتے ہیں اللہ والوں کی بے پروائی، کوئی بھی ہو ان کے استغناء کا عالم وہی ہوتا ہے، اپنی ذات کے لئے کہیں سے کبھی لجاجت پیدا نہیں ہوتی - سچ ہے جو اللہ کا ہو جاتا ہے وہ دوسروں سے بے نیاز ہو جاتا ہے -

ہمارے نوجوان عالمان دین ان واقعات کو پڑھ کر جلدی سے گزرنے کی کوشش نہ کریں، بلکہ رک کر سوچیں اور اگر کوئی بات سمجھ میں آجائے تو اس پر عمل کریں، کیا عجب اسی سے ان کی سیرت بن جائے۔

نشست میں تواضع

حضرت شیخ الاسلامؒ میں بے انتہا تواضع تھی اور تصنع وتکلف سے قطعاً پاک، چنانچہ آپ اپنی نشست میں تواضع سے قریب تر صورت اختیار فرماتے اور سنت کے مطابق، لکھا ہے:۔

"شیخ الاسلام ہمیشہ دو زانو بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے، اور بیٹھنے میں اسی نشست کو اختیار کرتے تھے جو حدیث میں مذکور ہے"

(انفاس قدسیہ ص۸۶)

اب ان باتوں کا اہتمام علماء سے بھی ختم ہوتا جارہا ہے، لیکن انھیں سوچنا چاہئے کہ اگر اسی طرح سارے آداب ومسنون طریقے چھوٹتے چلے گئے تو ان میں اور عوام میں کیا فرق رہ جائے گا؟ ان کی کونسی ادا دیکھ کر عوام اپنے سے برتر محسوس کریں گے۔ اور اسے اپنے لئے اسوہ بنائیں گے؟

آداب دسترخوان

شیخ الاسلامؒ کھانے کے وقت ان تمام آداب وسنن کا پورا لحاظ رکھتے جو کتب حدیث میں مذکور ہیں، لکھا ہے:۔

"حضرت شیخ الاسلامؒ کے ساتھ ریل میں بھی کھانے کا اتفاق ہوا ہے اور بارہا اس چیز کو دیکھا کہ اگر کوئی ریزہ دسترخوان سے نیچے گر جاتا تو آپ سبقت کرتے اور صاف کر کے کھا لیتے تھے" (ایضاً ص۸۶)

جو لوگ بار بار کسی موقعہ سے حضرت شیخ الاسلامؒ کا نام لیتے ہیں ان کو

چاہئے کہ وہ اپنی زندگی میں حضرت شیخ مدنیؒ سے ان چیزوں میں بھی سبق حاصل کریں اور سنت پر خود بھی عمل کریں اور اپنی اولاد کو بھی دین کے ساتھ شغف پیدا کرنے کی طرف توجہ دلائیں۔

ھدایا سے اجتناب کی کوشش

شیخ الاسلامؒ ہدایا عموماً قبول نہیں فرمایا کرتے تھے، بلکہ دینے والے کو سمجھاتے تھے کہ بھائی میں بھی کماتا ہوں کسی اور ضرورت مند کو پیش کرو ——— انفاس قدسیہ میں ہے:۔

"ھدایا کے سلسلہ میں حضرت کا یہ طریقہ تھا کہ جو بڑی بڑی رقمیں پیش کرنے والے ہوتے تھے ان سے فرما دیتے کہ بھائی کسی غریب آدمی کو دے دیجئے میں تو پانچ سو روپے تنخواہ پاتا ہوں" (انفاس قدسیہ ص۳۸)

ہمارے اس دور میں حضرت شیخ کے اس طرز عمل سے ان تمام لوگوں کو سبق لینا چاہئے، جو ہدایا، تحائف اور نذرانے کے خواہشمند ہوتے ہیں، اور بڑی بڑی رقموں پر نظر رکھتے ہیں۔

معمولی ھدیہ قبول

اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حضرت شیخ الاسلامؒ معمولی نذرانہ قبول فرما لیتے لکھا ہے:۔

"ایک دفعہ مرادآباد کے ایک مجذوب شمس الدین صاحب نے حضرت کی خدمت میں ایک روپیہ پیش کیا، حضرت نے فوراً قبول فرمالیا اور کچھ بھی نہ فرمایا" (ایضاً ص۳۸)

اگر آج کسی بڑے آدمی کو ایک روپیہ پیش کرے تو وہ اپنی توہین محسوس کرے گا، حالانکہ نگاہ دینے والے کے جذبات و اخلاص پر ہونی چاہئے نہ کہ

رقم کی مقدار و تعداد پر۔

استاذزادوں کا احترام

تواضع کا یہ عالم تھا کہ اپنے سے چھوٹی عمر والوں کے لئے بھی ایسے کلمات زبان پر لاتے ذرا بھی نہیں ہچکچاتے تھے جس سے اس کا بڑا ہونا اور اپنا چھوٹا ہونا ظاہر ہوتا ہو، اور اگر وہ پیرزادہ یا اس خاندان کا کوئی فرد ہوتا یا استاذ زادہ یا اس کی طرف منسوب، تو اس کے لئے بڑا اہتمام کرتے اور اس کی دلجوئی اپنا فریضہ جانتے تھے، حضرت مہتمم صاحب مدظلہ جب سفر پاکستان سے تشریف لائے تو ان کے استقبال میں شاندار جلسہ کرایا، اور اس استقبالیہ جلسہ میں فرمایا:۔

"ہم تو آپ کے نوکر ہیں اور آپ ہمارے آقا ہیں، آپ ہمیں حکم دیں، ہم تعمیل حکم کے لئے حاضر ہیں" (انفاس قدسیہ صفحہ ۹)

اب یہ ادب و تہذیب کہاں باقی ہے؟ "ہرکس بخیال خویش خبطے دارد" والا مسئلہ ہے، چھوٹا تو چھوٹا، بڑے کی تعظیم و تکریم کے لئے کوئی آمادہ نظر نہیں آتا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب بتدریج یہ ساری چیزیں ختم ہو جائیں گی. ہر شخص اپنی بڑائی کے پیچھے دیوانہ ہے، مولویوں کی یہ خصوصیت ہوتی جا رہی ہے کہ وہ سب کے سب بڑائی کے ہی طالب ہیں۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کی زندگی تواضع اور حسن ادب کے واقعات سے بھری ہوئی ہے، ان سے ہم سب کو سبق حاصل کرنا چاہئے۔

ثابت قدمی

غلام ہندوستان میں حضرت مدنیؒ پر بے انتہا مظالم ڈھائے گئے خصوصاً سیاسی مخالفین نے کچھ اٹھا نہیں رکھا، مگر حضرت شیخ الاسلامؒ کی یہ کرامت

ہے کہ وہ ساری مصیبتیں ہنسی خوشی برداشت کر گئے۔ کبھی کسی سے الجھے نہیں اور نہ کسی کا دل دکھایا، دوسری طرف کبھی اپنے مسلک میں کمزوری ظاہر ہونے نہ دی، چٹان کی طرح اپنی جگہ ثابت قدم رہے۔ آخری الیکشن جس کے بعد ہندوستان آزاد ہوا ہے اس موقع سے سید پور ضلع دیناجپور اسٹیشن پر کوئی تین ہزار غنڈوں نے آپ کو اپنے نرغہ میں لے لیا، بدتمیزی سے پیش آئے اور وہ بھی اس طرح کہ جسے دیکھ کر انسانیت اور شرافت اپنا سر پیٹ لے مگر اس عالم میں بھی آپ نے عفو درگذر ہی سے کام لیا۔

"حملوں اور سب وشتم کے وقت حضرت شیخ کی کیا حالت تھی؟ مولانا ریاض الدین صاحب فرماتے ہیں کہ چہرے پر قطعاً خوف وہراس نہ تھا، اور مدنی صاحبؒ اکثر مراقبہ کی حالت میں ہو جاتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت ممدوح سے دیگر اشخاص نے اجازت طلب کی کہ ہم غنڈوں کے قلع قمع کے لئے حاضر ہیں، مگر مولانا نے بلوہ کے اندیشہ اور اپنے اعتماد علی اللہ کی بنا پر اجازت نہیں دی" (انفاس قدسیہ ص۱۶۲)

اسے کہتے ہیں صبر واستقلال کہ جان پر بن رہی ہے، عزت خطرہ میں ہے مگر چونکہ غنڈے مسلمان ہیں اس لئے مظلومیت پر قناعت کرتے ہیں لیکن مقابلہ کی اجازت نہیں دیتے۔

قطب وقت

شیخ الاسلامؒ جس طرح دارالعلوم کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین تھے اسی طرح ولایت میں بھی آپ کا درجہ بہت بلند تھا صرف مدرس ہی نہیں تھے بلکہ ولی کامل اور قطب وقت بھی تھے، مولانا سجاد میرٹھی ولی کے اوصاف بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"خدا کا ایک مقدس بندہ جو ابھی چند روز پیشتر ہم سے رخصت ہو کر اللہ تعالیٰ

کے جوار رحمت میں داخل ہوا ہے، اور جسے دنیا حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے نام سے جانتی ہے اس کی زندگی قرآن کریم کے اس معیار ولایت پر کس قدر پوری اترتی ہے اور اس کے خدو خال اس آئینہ میں کس قدر حسین و دلآویز معلوم ہوتے ہیں"

اب ہم عالم بننے کی تو ضرور سعی کرتے ہیں مگر ولی بننے کی جدوجہد نہیں کرتے حالانکہ علم بغیر عمل کے وبال ہے، دنیا میں بھی عزت نصیب نہیں ہوتی اور آخرت میں بھی درجہ بلند نہیں ملتا، علم کی رونق تو عمل سے ہے۔

جامع کمالات

قاضی صاحب نے لکھا ہے:۔

"حضرت مدنی کی زندگی اس علمی وعملی جامعیت کا اس دور میں ایک بے نظیر نمونہ تھی، آپ کے ایمان کا کیا ذکر؟ آپ کی صحبت میں بیٹھ کر دوسروں کا ایمان تازہ ہوتا تھا، آپ کے اعمال و افعال دیکھ کر صحابہ کرام کی زندگی کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی تھی، فرائض و واجبات تو الگ رہے، کیا مجال کہ مستحبات اور مندوبات بھی ہاتھ سے چھوٹ جائیں"

سچ پوچھئے تو عالم ایسے شخص کو کہا جاتا ہے، عالم لبے کرتے اور عمامہ کا نام نہیں ہے، یہ تو عالموں کی ایک وضع ہے جو چاہے اختیار کرے مگر وہ اوصاف و کمالات جو دوسروں کو متاثر کریں بڑی نعمت ہیں، وہ سب کے حصہ میں نہیں آتے، پھر دین کے احکام پر عمل کا یہ اہتمام کہ مستحبات اور مندوبات بھی نہ چھوٹنے پائیں ایک عالم کا شیوۂ خاص ہونا چاہئے۔

جامع اوصاف

شیخ الاسلامؒ میں اسی جامعیت نے رنگ و بو کی وہ دلآویزی پیدا

کردی تھی کہ آج تک لوگ کھنچتے چلے آرہے ہیں اور نہ معلوم کب تک یہی ہوتا رہے گا، وہ نہ صرف عابد شب زندہ دار، بلکہ تمام اوصاف کے جامع تھے، قاضی صاحب نے درست لکھا ہے :۔

"حضرت مدنی ایک طرف دنیائے اسلام کی ممتاز ترین دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی مسند حدیث کے رونق تھے اور دوسری طرف قطب وقت حضرت حاجی امداد اللہؒ اور شیخ عصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی بزم معرفت کی آخری شمع۔ دن کی جلوتوں میں آپ طالبانِ علوم ظاہری کے دماغوں کو کتاب وسنت کے انوار سے روشن کرتے تھے، اور رات کی خلوتوں میں آپ مشتاقانِ فیوض باطن کے دلوں کو محبت ومعرفت کی آگ سے گرماتے تھے۔"

(الجمعیۃ حضرت مدنی نمبر ص۵)

دیکھ رہے ہیں عالم کی شان کیا ہوتی ہے، خوب غور سے پڑھیں، اور پھر اپنے احوال کا جائزہ لیں کہ کیا ہم میں یہ خوبیاں موجود ہیں، اگر نہیں تو پھر کہیں کہیں سے یہ خوبیاں تلاش کرنی چاہئیں، صرف تمنا کافی نہیں ہوا کرتی، اگر آرزوؤں ہی سے کام چلتا تو کوئی بھی ان نعمتوں سے محروم نہ رہتا۔

خدا ترسی کا ثمرہ

حضرت شیخ الاسلام کی خدا ترسی کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ کہیں کسی کے آگے نہیں جھکے، بس صرف اپنے خدا کے حضور میں جھکنا جانتے تھے، قاضی سجاد صاحب میرٹھی نے کس قدر درست لکھا ہے :۔

"دنیا نے دیکھا کہ اس اللہ کے شیر نے مصر کے زنداں خانے میں، مالٹا کے مقتل میں، اور کراچی کے مجلس میں، ہر فرعونِ عصر اور قیصر وقت کے سامنے پوری قوت وجرأت مگر کامل اطمینان وسکینت کے ساتھ کلمۂ حق بلند کیا، خالق دینا ہال کراچی کے ایک اجلاس میں جب آپ نے اپنا تاریخی بیان دیا

تو رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ جنہوں نے اپنی باطل شکن تقریروں سے قصر بکنگھم کی دیواروں میں زلزلہ ڈال دیا تھا، آپ کے قدموں میں گوپڑے اور جوش عقیدت میں آپ کی پا بوسی کی سعادت حاصل کی۔"

(الحرم حضرت مدنی نمبر صـــ)

وسیع الظرفی

شیخ الاسلامؒ ان تمام اوصاف کے ساتھ وسیع الظرف بھی تھے اور دوسروں کی دلداری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، اور جہاں تک فقہاء نے اجازت دی ہے اس کی حدود میں اپنے معمولات کے خلاف کرنا پڑتا تو اسے بھی میزبان کی خاطر کر گذرتے، حضرت مولانا محمد میاں صاحب مدظلہ نے لکھا ہے :-

"حضرت مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی وزارت کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے کہ آپ نے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز اور ان کے ساتھ چند مخصوص خدام کی دعوت کی، اس مرتبہ کھانے کا انتظام میز پر تھا، حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز نے کھانا تناول فرمایا، مگر طبع مبارک منقبض رہی، پھر آخر میں ایک لطیف انداز میں اس طرف اشارہ بھی فرمادیا۔" (الحرم حضرت مدنی نمبر ص۱۲)

کھلی بات ہے کہ میز پر کھانا آپ کی عادت اور وضع داری کے خلاف تھا، طبع مبارک میں بار بھی گذرا، مگر جواز کی حد میں تھا اس لئے بادل ناخواستہ ہی سہی کھانا کھانے سے انکار نہیں فرمایا بلکہ کھالیا، یہ الگ بات ہے کہ اپنا انقباض ظاہر بھی فرمادیا، تاکہ میزبان کو تنبیہ ہو جائے اور جان لیں کہ یہ وضع جو سنت کے خلاف ہے پسند نہیں، چنانچہ جب دوسری مرتبہ حضرت مولانا آزادؒ نے دعوت کی تو کھانے کا انتظام فرش پر کیا۔

شعار دین کی اہمیت

اخیر عمر میں ڈاڑھی کے معاملہ میں بڑی شدت آگئی تھی اور اپنے چاہنے والوں سے بڑی سختی کے ساتھ ڈاڑھی رکھنے کی فرمائش کرتے، خدا نے زبان میں تاثیر عطا کر رکھی تھی، عموماً لوگ متاثر ہوتے اور آپ کے فرمان پر عمل کرتے، لکھا ہے:۔

"۱۹۴۷ء کے بعد ڈاڑھی کے مسئلہ میں بھی آپ کی شدت روز افزوں تھی، اور چند سال سے تو حالت یہ ہوگئی تھی کہ خلاف شرع صورت دیکھ کر آپ بے قابو ہو جاتے تھے، اور ایک طرح جذب کی کیفیت آپ پر طاری ہو جاتی تھی" (الجمعیۃ حضرت مدنی نمبر ص۱۷)

جہاں اور وجہ تھی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگوں میں یہ جذبہ پیدا ہو چلا تھا کہ وہ ہندوؤں پر اپنی مسلمانیت کو چھپائیں، یہ چیز بڑی خطرناک تھی، اس کی زد ایمان پر پڑتی تھی، اس لئے شیخ وقت کو ضرورت محسوس ہوئی کہ مسلمانوں سے یہ برائی دور کرنے کی فکر کریں اور انھیں اسلامی وضع پر مائل ہونے کی تلقین شدت کے ساتھ کریں، اور کون نہیں جانتا کہ ابتدائے آزادی میں اسکول وکالج کے طلبہ اور ٹیچر میں یہ غلط جذبہ بڑی قوت سے برانگیختہ ہوا تھا جو ملت اسلامیہ کے لئے مہلک تھا۔

دین قیم سے شیفتگی

دین قیم سے شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اس کی حرمت وعزت کی خاطر اپنا سارا سرمایہ نچھاور کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا، آپ کا حال یہ تھا کہ:۔

"اپنے مولا کی وفادانہ بندگی کا جذبۂ صادق اور اس کی راہ میں ہر قسم کی قربانی کا یہ جوش وافر تھا کہ اس راہ میں ہر کانٹے کو آپ نے پھول سمجھا،

ہر ذلت کو آپ نے عزت قرار دیا، اور ہر مصیبت کو راحت، دشمنوں کی گالیوں کا جواب دعاؤں سے دیا، اور پتھروں کی بوچھاڑوں کے بدلہ میں آپ نے تبسم کے پھولوں کی بارش کی، اسی کمال ایمان وطاقت اور صبر واستقامت کا نتیجہ تھا کہ جب آپ دنیا سے رخصت ہوئے تو بارگاہ قدس سے فرشتے آپ کے استقبال کے لئے بھیجے گئے۔" (الحرم حضرت مدنی نمبر ص)

نائب رسول کا شیوہ دیکھ رہے ہیں کہ دین کی خاطر ساری اذیتیں برداشت کیں، اور چہرہ پر شکن تک آنے نہ دیا، آہ اب یہ چیزیں ہم سے رخصت ہوتی جارہی ہیں، اپنا شیوہ ہم چھوڑتے جارہے ہیں، اور دینی جذبۂ صادق ہم سے فنا ہوتا جارہا ہے، پتہ نہیں اگر یہی لیل ونہار رہے تو پچاس سال بعد ہمارا کیا حشر ہوگا۔ ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

عمل صالح کا اثر بوقت موت

دنیا جائے عمل ہے حدیث میں ہے الدنیا مزرعۃ الاٰخرۃ۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یعنی دنیا تو سنورتی ہی ہے، اگر عمل صالح ہو تو آخرت بھی سنور جاتی ہے، خود حضرت شیخ الاسلامؒ کی مثال موجود ہے کہ دنیا میں آپ کا جو احترام واکرام ہوتا تھا، وہ تو اظہر من الشمس ہے، آخرت بھی نورٌ علیٰ نور رہی قاضی صاحب نے لکھا ہے:۔

"دارالحدیث کے وسیع ہال میں حضرت اقدسؒ کے آخری دیدار سے یہ راقم جن بزرگوں کی معیت میں مشرف ہوا، ان میں ایک صاحب، حاجی محمد صالح دہلوی بھی تھے، یہ بزرگ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نائب صدر ہیں زیارت سے فارغ ہو کر جب ہم لوگ دارالاہتمام میں واپس آئے تو حاجی

صاحب نے حضرت مہتم صاحب اور دوسرے بزرگوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اگر میں حضرت شیخ کی زیارت خود اپنی آنکھوں سے نہ کرلیتا اور کوئی مجھ سے کہتا کہ مولانا حسین احمد موت کے بعد مسکرا رہے تھے تو میں کبھی اس کی بات کا یقین نہ کرتا، مگر کیا کروں اپنی آنکھوں کو جھٹلا نہیں سکتا۔"

(الجرم حضرت مدنی نمبر صلا)

یہ شہادت ایک غیر مسلک مسلمان کی ہے، اور بڑے ذمہ دار کی۔

خصوصی اوصاف

حضرت حکیم الاسلام لکھتے ہیں :-

"مقامات دیکھو تو وقار میں کوہ گراں، تواضع میں مشت خاک، دلداری میں لطیف پانی، بغض فی اللہ میں آتش مجسم، سخاوت میں باریک ہوا، شجاعت قلب میں آہن، بھاری بھرکم ہونے میں وزن دار قطع زمین، اور خودداری میں بلند آسمان، معمولات کو تو تو مجلس جلوت میں نمایاں، گوشہ خلوت میں پنہاں قلب میں سب سے اونچے الگ، قالب میں سب کے ساتھ، عالم جلوت نشیں، صوفی خلوت گزیں، مدرسہ میں مدرس، خانقاہ میں شیخ، سیاست میں سپاہی، میدان میں مرد مجاہد، فقیروں میں درویش، عوام میں لیڈر، خواص میں مقتدار..... غرض ہر میدان میں امتیازی شان کے ساتھ موجود، مگر سب شانوں میں تعلق مع اللہ بدستور، اور خلوت در انجمن کے صحیح مصداق۔" (الجرم حضرت مدنی نمبر صلا)

ساری تفصیلات پڑھنے کے بعد پھر وہیں آنا پڑتا ہے کہ تعلق مع اللہ اور خوف خدا نے آپ کو ہر دلعزیز بنا رکھا تھا، حدیث میں آیا ہے کہ جو اللہ کا ہو جاتا ہے ساری کائنات اس کی فرماں بردار بن جاتی ہے، شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اس راز کو پا لیا تھا۔ اور آپ کا اسی پر عمل تھا۔

نسبت مع اللہ

حکیم الاسلام حضرت مہتمم صاحب مدظلہ ہی نے آگے چل کر لکھا ہے، اور بہت درست لکھا ہے :۔

"حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے بڑی طاقت یہی نسبت مع اللہ تھی جس سے وہ کہیں گرم اور کہیں نرم، کہیں آگ کہیں پانی، کہیں خلوت گزیں اور کہیں جلوت نشیں، کہیں منفرد اور کہیں مجتمع اور جامع نظر آتے تھے"۔

(الجمعیۃ حضرت مدنی نمبر صلا)

یہ اس ذات بابرکت کا بیان ہے جس نے کم و بیش ۳۶ سال ساتھ رہ کر کام کیا، مشورے ہوئے، قریب سے دیکھا، ایک ایک چیز کا جائزہ لیا، اور سب کچھ ذمہ دارانہ طور پر کیا، اس لئے اس سے بڑھ کر اور کسی کی شہادت نہیں ہوسکتی، آپ بار بار اسے پڑھیں اور سوچیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے اور انسانی زندگی کو کس طرح سنوار دیتا ہے، کہ ہر خاص و عام کی نگاہ میں وہ محبوب بن جاتا ہے۔

شیخ الاسلام کی نسبت باطنی

شیخ الاسلام مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت بڑی قوی تھی، مسلسل جدوجہد جفاکشی اور ریاضت نے بڑا اونچا مقام عطا کر دیا تھا، حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے اپنے خسر مولوی محمود صاحب مرحوم رامپوری کے حوالہ سے لکھا ہے :۔

"جب حضرت مدنیؒ کو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اجازت خلافت عطا فرمائی اور اسی زمانہ میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے اجازت و خلافت سے نوازا، تو اس وقت عام اہل نسبت بزرگوں کی رائے اس پر متفق تھی کہ

مولانا مدنیؒ کی نسبت قوت میں حضرت حاجی صاحبؒ کی نسبت کے مشابہ اور نوعیت میں ان سے ملتی جلتی ہے۔" (الحرم حضرت مدنی نمبر ۱۲)

دیکھ رہے ہیں یہ گواہی ان لوگوں کی ہے، جنہوں نے حضرت شیخؒ کو قریب سے دیکھا تھا، اور جن کی نظر آپ کی ہر ہر ادا پر رہتی تھی، اور وہ سب خود اہل نسبت تھے، اور سچ یہ ہے کہ اسی نسبت کی قوت نے آپ میں پہاڑ کا سا جماؤ، اور سمندر کی سی گہرائی، اور آفتاب کی سی فیض رسانی بخشدی تھی کوئی بھی آپ کے دربار گہربار سے خالی دامن نہ آتا الّا ماشاء اللہ، جس پر نگاہ ڈال دی آدمی بن گیا، جس کے لئے دعا کردی وہ سنور گیا۔

اتباع سنت

اسی تعلق مع اللہ اور دین سے شغف کا نتیجہ تھا کہ اتباع سنت پر جان دیتے تھے، مولانا محمد میاں صاحب مدظلہ ناظم جمعیۃ علماء ہند لکھتے ہیں:-

"اتباع سنت اور نہ صرف اتباع سنت بلکہ سنن و مستحبات سے شغف اور نقش پا سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کا ایسا نمایاں اور ممتاز وصف ہے جیسے آفتاب نیمروز۔" (الحرم حضرت مدنی نمبر ۵)

یہ تھا آپ کا حال، کہاں ہیں وہ علماء اور صوفیاء جو ترقی چاہتے ہیں، ان حالات کا مطالعہ کریں اور بار بار سوچیں کہ ظاہری و باطنی ترقی کا سرچشمہ کہاں سے ابلتا ہے، جس سے مخلوق خدا بلا تمیز عالم و جاہل سیراب ہوتی ہے خود اسے بھی عظمت و رفعت حاصل ہوتی ہے اور اس سے نسبت رکھنے والوں کو بھی۔

اعتدال پسندی

حضرت شیخ الاسلامؒ اعتدال پر قائم تھے، وہ خوب جانتے تھے کہ

کہاں نرم ہونا چاہئے اور کہاں گرم، میانہ روی آپ کا خاص وصف تھا، حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہ لکھتے ہیں :-

"حضرت مرحوم سعادت حقیقی کے اس مرتبہ علیا پر فائز تھے جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اضطراری اتباع یا پیروی سے حاصل ہوتا ہے، آپ کا ذکر و فکر، طور وطریق، نشست و برخاست، معاملات شجاعت و جرأت شوق جہاد وغزا، اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے بے تابی اور بے چینی، دشمنوں کے ساتھ رحم وکرم اور اعراض ومسامحت، دوستوں کے لئے مخدومانہ نہیں بلکہ خادمانہ برتاؤ، اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ کے ساتھ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی مکمل تصویر، ذاتی طور پر بے حد متواضع اور فروتن، لیکن دینی اور اسلامی امور میں حد درجہ متشدد اور غیور وخوددار، رات رات بھر تہجد اور نوافل کے ساتھ قید وبند بھی ہے اور دار ورسن کا خیر مقدم بھی، اصلاح باطن اور روحانی ارشاد وھدایت بھی ہے، اور میدان جہاد میں نبرد آزمائی بھی، مصائب وآلام پر صبر واستقامت اور شدائد ومحن کا کشادہ دلی اور عزم کے ساتھ مقابلہ، خدام اور گھر والوں کے ساتھ حسن معاشرت وخندہ جبینی اور لطف و مزاح اور کسی امر شرعی کے عدم امتثال پر زجر وتوبیخ، اور پھر سب کچھ کسی حظ نفس کی خاطر نہیں، بلکہ اللہ اور صرف اللہ کے استرضاء اور اسوۂ رسولؐ کے اتباع کے لئے۔" (الجمعیۃ حضرت مدنی نمبر ص۲۱۲۲)

شیخ الاسلام کی زندگی کا نقشہ

شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو خداشناسی وخداترسی نے ایک نمونہ بنا دیا تھا، جو پوری دنیا میں کھلی کتاب کی طرح پیش کئے جا سکتے تھے جسے ہر شخص مختلف جہت سے پڑھ سکتا تھا، اور پڑھنے کے بعد اس کی جامعیت کے اعتراف پر مجبور تھا، حضرت مولانا اکبرآبادی مدظلہ لکھتے ہیں :-

"اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت شیخ اس عہد میں اللہ کی ایک حجت بھی تھے اور اس کی نشانی بھی، ان کو دیکھ کر سلف صالحین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، ان میں جنیدؒ و شبلی، مسعود و سالار اور مجدد الف ثانی رحمہم اللہ کی شخصیتیں اس طرح مجتمع ہوگئی تھیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں تھا" (الجمعیۃ حضرت مدنی نمبر ص۲۱۲)

یہ تھی زندگی حضرت مرشد مدنیؒ کی، جن لوگوں نے صحابہ کرامؓ کی تاریخ کا غور و فکر سے مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمان کی اصل زندگی یہی ہے کہ وہ شب بیدار بھی ہو، مجاہد فی سبیل اللہ بھی ہو، جفاکش اور محنتی بھی ہو، مصلے پر کھڑا ہو تو دیکھنے والا سمجھے کہ یہ ساری دنیا سے بے فکر خدا کے حضور میں الحاح وزاری کے اندر ہی مر مٹے گا، میدان کارزار میں دیکھے تو اسے یقین ہو کہ اس سے بڑھ کر کوئی جانباز و جاں نثار نہیں، یہ سب سے بڑا بہادر اور جنگ جو ہے، گویا اس میں ساری خوبیاں پائی جائیں، علماء سے اسی زندگی کا مطالبہ ہے، کاش علماء اس زندگی کا یقین پیدا کرتے اور اپنی زندگی اسی کے مطابق بنانے کی جدوجہد کرتے، مدتوں سے صحابہ کرامؓ کے نقش قدم پر مر مٹنے کا جذبہ فنا ہوتا جا رہا ہے۔ اسے دوبارہ زندہ کرنا ہم سب کا فریضہ ہے۔

بنی نوع انسان کی خدمت

حضرت مدنیؒ ہر زمانہ میں بنی نوع انسان کے بہی خواہ اور مخلص رہے، اس لئے محبت سبھوں کو رہی، سیاسی اختلافات نے بعضوں کو طبعی طور پر دور کر دیا، مگر یہ ظاہری اعتبار سے، باطنی طور پر ہر ایک آپ سے بہت قریب تھا، جب اس کا جھگڑا ختم ہوگیا۔ انگریزی حکومت کی بساط الٹ دی گئی، تو پھر دے کر آپ نے اپنی ساری توجہ اصلاح پر مرکوز کر دی، لکھا ہے :-

"حضرت مدنی قدس سرہ برطانیہ کو شکست دینے اور آزادی کے حاصل ہو جانے کے بعد جب اپنے اصل مقصود اعلاء کلمۃ اللہ اور انسانیت کی خدمت کی طرف پوری سرگرمی سے اور گرم جوشی کے ساتھ مشغول ہوئے تو آپ کی قلبی توجہ بنی نوع انسان کی طرف قوت کے ساتھ مبذول ہوگئی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دم انسانی قلوب آپ کی طرف مائل ہوگئے اور خلق خدا آپ سے وابستہ ہوگئی" (الحرم حضرت مدنی نمبر ص۳۳)

بات صرف اتنی تھی کہ سیاست کا جو پردہ آپ نے اپنے چہرۂ پرنور پر ڈالا تھا، جب وہ انقلاب سے اٹھ گیا، پھر وہ شعاعیں پھوٹ پڑیں جو روپوش تھیں، اور اس کی گرمی نے انسانی قلوب کو گرما دیا، جو چند انسان ظاہر دیکھنے کے عادی تھے ان پر بھی ایک وجد و کیف کا عالم طاری ہو گیا، اور پروانہ وار نثار ہونے لگے، قوت وہی اخلاص وللہیت اور تعلق مع اللہ کی تھی، جو پہلے بھی تھی اور اب بھی۔

حقیقی امن وسلامتی

صرف ہندوستان کی آزادی آپ کا مطمح نظر نہ تھا بلکہ اسی کے ساتھ حقیقی امن و سلامتی کا قیام بھی پیش نظر تھا، آپ نے اپنے ایک مکتوب میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے :-

"بلاشبہ اسلامی قوانین ہی دنیا کے لئے حقیقی امن و سلامتی کے ضامن ہیں، ہندوستان کی مشترکہ حکومت میں ان قوانین کی حاکمیت مطلقہ قائم نہ ہوگی، اور نہ حدود شرعیہ جاری ہوں گی، لیکن یہ خود مسلمانوں کا علمی عملی فریضہ ہے، کہ وہ دوسری قوموں سے اسلامی قوانین کی یہ حیثیت تسلیم کرالیں، اھون البلیتین آخری منزل مقصود نہیں ہو سکتی، مسلمانوں کے لئے سعی و عمل کی راہیں کھلی ہوئی ہیں ہندوستان کی آزادی سے یہ راہیں بند نہ ہو جائیں گی" (ایضاً ص۳۴)

آنکھیں کھول کران سطروں کو پڑھئے اورغور کیجئے کہ حضرت مدنیؒ کانقطہ نگاہ کس قدر بلند تھااور آپ کیاچاہتے تھے۔

۱۹۴۷ء اور شیخ الاسلام

۱۹۴۷ء کے انقلاب میں حضرت شیخ الاسلامؒ جس طرح ثابت قدم رہے، وہ اپنی آپ مثال ہے۔ آگ وخون کی بارش میں بھی کبھی آپ نے ہمت نہیں ہاری اپنی جگہ ڈٹے رہے، ایک انچ اپنی جگہ سے ہٹنا گوارا نہیں کیا، اس زمانہ میں آپ کا حال یہ تھا:-

"ان حالات میں حضرت شیخ الاسلامؒ نہایت صبر واستقلال سے مسلمانوں کو ثابت قدم رہنے اور خدا پر بھروسہ کرنے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نقش قدم پر چلنے کی نصیحتیں فرماتے رہے، بستی بستی میں جاکر تقریریں فرماتے۔ دوسری طرف حکومت اور وزراء سے لڑتے اور روزانہ ٹیلی فون پر ان کو کھڑکھڑاتے، کبھی خود جاکر افسران سے ملتے، غرض آپ نے دن رات ایک کردیااور مسلمانوں میں اعتماد واستقلال کی روح پھونک دی"

(الجمعیۃ حضرت مدنی نمبر ص۱۱۲)

یہ تھا آپ کی جرأت واستقامت کاحال، حالات سے گھبراتے نہیں تھے، اس سے ٹکراکر موافق بنانے کی جدوجہد کرتے، اور اس سلسلہ میں وہ ساری اذیتیں برداشت کرتے جو آپ کرسکتے تھے، خدا کے خوف کے سوا کسی اور طرح کاکوئی خوف آپ کے قلب پر اثرانداز نہیں ہوتا۔

جماعت کی پابندی پر زور

حضرت شیخ الاسلامؒ کا معمول تھاکہ اگر کوئی کسی کام میں کوتاہی کرتا، تو اسے ڈانٹتے، اور پورے طور پر عمل کی تاکید کرتے، اس سلسلہ میں کسی کے ساتھ

کوئی رعایت روا نہیں رکھتے، اپنے ایک مرید عالم کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ جماعت میں کوتاہی کرتے ہیں، تو آپ نے لکھا :-

"آپ کا جماعت اور اذکار سے تغافل باعث افسوس اور تعجب ہے، ہمیشہ تکاسل اور غفلت کو حتی الوسع دور کرنے کی کوشش کیجئے، مردانہ وار ہمت ہونی چاہیئے، یہ چند دنوں کی زندگانی ہے ..... جس قدر بھی ممکن ہو، زاد برائے آخرت اس میں تیار کر لیجئے، محبوب حقیقی کے یہاں جاہ و عزت حاصل کرلیں، وہ کہتا ہے فاذکرونی اذکرکم ..... الحاصل ہمت بلند رکھیئے، غفلت پر لعنت کیجئے، جس قدر ممکن ہو اپنے سانس اور اعضاء وارکان کو پروردگار حقیقی کے نام لینے میں صرف کیجئے۔

مع من نہ کردم شما حذر بکنید" (مکتوبات شیخ الاسلام ص۱۷۰ ج۱)

خط کا یہ حصہ بار بار پڑھا جائے کہ آپ نے ذرا سی کوتاہی پر کس قدر فہمائش کی ہے، اور اس کی اہمیت ذہن نشین کرانے کے لئے کیسی جد وجہد فرمارہے ہیں، لفظ لفظ میں جو درد دل اور خیرخواہانہ جذبات ہیں، ان سے اندازہ لگایئے کہ شیخ الاسلام دینی احکام پر عمل کے سلسلہ میں کہاں پہنچے ہوئے تھے۔

قرض سے اجتناب کی تاکید

ایک دفعہ کسی مرید نے لکھا کہ قرضہ ہو گیا ہے، تو حضرت شیخ الاسلام نے لکھا :-

"دنیاوی مصائب سے گھبرانا نہیں چاہیئے، نہایت استقلال سے خداوند کریم کی طرف لو لگانا چاہیئے۔ قرضہ سخت مصیبت ہے خصوصاً سودی قرض تو زہر قاتل ہے، اگر ممکن ہو تو کچھ حصہ جائداد کا کسی مسلمان کے ہاتھ فروخت کرکے اس سے سبکدوشی اختیار کیجئے۔ اگر مسلمان خریدار نہ پیدا ہو تو غیرقوم کے ہاتھ فروخت کریں، اور ہمیشہ احتیاط رکھیں کہ قرضہ خصوصاً سودی

ہرگز نہ لیں " (مکتوبات شیخ الاسلام ص ۲۲)

جس طرح آپ اعمال خیر پر زور دیتے ہیں، دل نشیں پیرایہ میں نصیحت فرماتے ہیں اور عمل پیرا ہونے کی تلقین فرماتے ہیں، وہ معاملات جن کو لوگ دنیاوی کہا کرتے ہیں، ان میں بھی آپ احتیاط کی تاکید کرتے ہیں، قرضہ جو بسا اوقات انسان کو سرے سے تباہ کر دیتا ہے، جن میں جائدادیں نیلام ہو جاتی ہیں، حضرت اسے بھی کسی مسلمان کے لئے گوارا نہیں فرماتے بالخصوص سودی قرضہ جس کی لعنت نے ہزاروں مسلمانوں کو برباد کر ڈالا، بچنے کی شدت کے ساتھ تاکید فرماتے ہیں ۔

ذکر اللہ پر مداومت

ذکر اللہ کی مداومت پر حضرت شیخ الاسلامؒ بہت زور دیا کرتے تھے اور ناغہ کسی حال میں پسند نہیں فرماتے تھے ۔ اس سلسلہ میں ایک وابستہ کو لکھتے ہیں :-

"ذکر اللہ جو کچھ کرتے ہیں برابر کرتے رہیئے، واقعہ یہ ہے کہ ذکر کرتے کرتے جب چھوٹ جاتا ہے تو قلب میں قساوت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے بعد ذکر کرنے میں پہلی حالت زیادہ دنوں میں عود کرتی ہے ۔ ہاں اگر انسان کے باطنی اجزاء ذکر سے پوری طرح رنگین ہو چکے ہوں تو پھر ترک کرنا مضر نہیں ہوتا ۔ بلکہ وہ ترک نہیں ہو سکتا " (ایضاً ص ۲۵)

وہ لوگ جنہیں ذکر سے دلچسپی ہے، وہ حضرت والا کی اس تحریر کو بغور پڑھیں اور غور کریں کہ ذکر پر مداومت کی تاکید کس انداز میں کی جا رہی ہے اور ناغہ کے نقصان کی نشاندہی کس خوبی سے فرما رہے ہیں، جو بات لکھی گئی ہے وہ ان لوگوں کے سمجھ میں بہت جلد آ سکتی ہے، جو اس راہ کے راہ رو ہیں ۔

❊ ❊ ❊

اعتکاف کی حیثیت

اعتکاف کے متعلق آپ نے ایک مرتبہ ایک صاحب کو لکھا :-

"اعتکاف نہایت عمدہ اور موکد سنت ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ سائل اور محتاج غلام اپنے آقا کے دروازے پر اور اس کے گھر پر آپڑے اور کہے کہ جب تک میری حاجت براری نہ ہو جائے گی، میں اس در سے نہ جاؤنگا کھانا، پینا، سونا چھوڑ کر دن رات اسی کے در کا ہو جائے، ظاہر ہے کہ اس حالت میں آقائے کریم کے عظیم الشان الطاف اس کو مورد الطاف کیوں نہ بنائیں گے، غرضیکہ یہ مبارک عبادت گناہوں کے ازالہ کے لئے کی جاتی ہے" (مکتوبات شیخ الاسلام ص ٨٦/١٢)

حقوق العباد و حقوق اللہ

حضرت والاؒ نے ایک مرتبہ ایک عقیدت مند کو لکھا :-

"آپ کی حالت پر مجھے سخت افسوس ہے، ذکر پر مداومت تو درکنار احکام شرعیہ ضروریہ پر بھی آپ کی مداومت نہیں رہی، پنجگانہ جماعت کی پابندی نہیں فرماتے ہیں، نماز میں دل نہیں لگاتے، دنیاوی جھگڑوں میں منہمک رہتے ہیں، حقوق اللہ میں اس قدر بے پرواہی اور کسل مندی ہے۔ اور حقوق العباد میں بہت زیادہ کوتاہی ہے، آپ کے ذمہ ارباب حصص کے اور رشتہ داروں کے بہت زیادہ حقوق ہیں، ان میں برابر کوتاہیاں ہو رہی ہیں، آخر آپ کو اپنے انجام کی رستگاری کس طرح حاصل ہو گی"

(مکتوبات شیخ الاسلام ص ١٢٠)

آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ آپ کی یہ تحریر کس قدر برجستہ اور بلا رو رعایت ہے، اور جوبات فرما رہے ہیں کس مضبوطی کے ساتھ فرما رہے ہیں، اس کا قطعا

خیال نہیں ہے کہ مکتوب الیہ پر کوئی ناگوار اثر پڑے گا۔

تبلیغ دین اور اس کی اہمیت

شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے احباب او رعزیز کو تبلیغ دین کے فرض کی ادائیگی کے لئے مختلف انداز سے آمادہ فرمایا کرتے تھے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رہتا تھا کہ بلامعاوضہ ہو تاکہ اخلاص کارفرما ہو، چنانچہ ایک خط میں شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"تقریر کے مسئلہ میں جب بھی آپ پر اعتراض کرتا تھا تو یہ حقیقت ملحوظ رہتی تھی کہ آپ سے یہ جبن و بخل چھڑایا جائے، آخر وہ فریضہ تبلیغ جو مسلمانوں پر عموماً اور اہل علم پر خصوصاً عائد ہوتا ہے، اس کے ادا کرنے میں کیا یہ تقریر درجہ علیا نہیں رکھتی؟ بالخصوص جب کہ یہ بلامعاوضہ اور بلا تنخواہ ہے"

تبلیغ بلاقصد معاوضہ ہو

تبلیغ دین کا جذبہ ہے جو آپ کو بے چین کئے ہوئے ہے اور چاہتے ہیں کہ علماء اپنی چھٹی کے دنوں میں بلامعاوضہ اس فریضہ کو انجام دیں اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے تقریر پر زور دیتے ہیں، کہ یہ عوام کی اصلاح میں اونچا مقام رکھتی ہے، چنانچہ آگے اسی خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہماری تعلیمات تنخواہوں کی وجہ سے یقیناً محل نظر ہے الا ان یرحم اللہ علینا مگر یہ تقاریر اگر بلاقصد معاوضہ ہیں تو یقیناً ہمارے لئے ذریعہ نجات ہیں اور امت کے لئے موجب اصلاح"

مگر کیسے کہا جائے اور کیا کہا جائے کہ اب تقریروں کو بھی ذریعہ معاش بنا لیا گیا ہے، لوگ اس سلسلہ میں غلو کی حد تک آگے بڑھے ہوئے ہیں، پہلے

فیس طے کرتے ہیں پھر گھر سے قدم نکالتے ہیں، حضرت والا نے جملہ کتنا جچا تلا لکھا ہے "بلا قصد معاوضہ"

ماحصل یہ ہے کہ خود اپنی نیت معاوضہ سے خالی ہو، اگر بلا قصد معاوضہ کوئی اپنی طرف سے بطور نذرانہ یا بطور خدمت کچھ دیدے، تو اس کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

تبلیغ کے سلسلہ میں شبہات کے جوابات

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اس خط میں جو غلط شبہات ہو سکتے ہیں، ان کا جواب بھی دیا ہے، لکھتے ہیں :-

"رہا یہ شبہ کہ بعد میں عجب پیدا ہوتا ہے، اور اسی بناء پر آپ اس کو پیشہ قرار دیتے ہیں، اور نہایت ناگواری کے الفاظ مصافحہ وغیرہ سے استخراج فرماتے ہیں، میرے لئے انتہائی تعجب خیز ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا ذخیرہ کیا یہی تقریریں اور خطب نہیں ہیں، کیا وہ ہماری طرح کتاب سے کر پڑھاتے تھے، رہبانیت پر اعتراض تو جب ہی عائد ہوگا جب کہ عمل سے پیشتر اس کا قصد اور ارادہ بھی ریا وسمعہ ہوا ہو، اور اگر پہلے سے ایسا قصد نہیں یا اسماع اور ارادہ محض اصلاح مخاطبین کے لئے ہے تو یقیناً اجر و ثواب ہے"

جو بات کہی جا رہی ہے اسے غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے تقریر و وعظ سے کنارہ کشی اختیار نہ کی جائے، بلکہ اپنے عمل کی اصلاح کی جائے، خلوص وللہیت پیدا کی جائے، دل سے کھوٹ دور کر لیا جائے، اور للہ فی اللہ یہ کام کیا جائے۔

☆ ☆ ☆

اسلاف وعلماء کا احترام

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں یہ بات بہت کھل کر تحریر فرمائی ہے کہ تقلید تو صرف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کرتے ہیں، باقی اپنے سلسلے کے علماء اور اساتذہ ان کے علوم سے استفادہ کرتے ہیں، ان کی ہر رائے کا ماننا ہم پر ضروری نہیں ہے، اس لئے ان میں سے کسی کا قول نقل کر کے اعتراض کرنا صحیح نہیں ہے، لکھتے ہیں:۔

"ہم سب اور ہمارے اسلاف کرام حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے مقلد ہیں، اساتذہ کرام کے ہم خوشہ چیں ہیں، ان کے احسان اور علوم سے استفادہ کرنے والے اور شکرگذار ہیں، مگر تقلید صرف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کرتے ہیں۔ اور اسی کو علمی روشنی میں ضروری اور باعث نظام امت سمجھتے ہیں، ہم مذاہب کو بھی حق سمجھتے ہیں، ..... بہرحال ہمارے اکابر فقط امام صاحبؒ کی فقہ کے مقلد ہیں، دوسروں کے اقوال کو مرجوح سمجھتے ہیں، باطل نہیں کہتے۔"

اسے کہتے ہیں ادب اور اسلاف کے ساتھ عقیدت ومحبت، کوئی سخت جملہ آیا؟ جو بات کہی صاف کہی، مگر ادب واحترام کا سررشتہ کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، آگے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تفردات وخیالات کے متعلق لکھتے ہیں۔

کسی بڑے عالم کی سب رائے پر عمل کرنا ضروری نہیں

"حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ العزیز کو جو سلسلہ کے بہت بڑے امام اور حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ الاستاذ

اور جد بزرگوار ہیں، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقابلہ میں مطاع قرار نہیں دیتے، حجۃ اللہ البالغہ کی جلد ثانی میں شاہ صاحبؒ نے بہت سے مسائل میں خلاف فرمایا ہے، ہم ان پر نہ فتویٰ دیتے ہیں اور نہ عمل کرتے ہیں، اور بحمد اللہ ہمارے پاس ان مسائل فرعیہ کے جوابات بھی مکمل طور پر موجود ہیں، اور اسی طرح پر محقق العصر علامہ ابن ہمام وغیرہ دوسرے اکابر کے تفردات بھی ہم معمول بہا نہیں قرار دیتے۔"

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بڑی خوبی تھی، جب کوئی بات کہی صاف کہی، علمی مسائل میں بھی آپ کا مسلک نکھرا ہوا تھا، اگر مگر اور چوں چرا دالی بات ہرگز نہیں کیا کرتے تھے، اور یہی چاہئے ہمارے اسلاف کا برابر یہی دستور رہا ہے، بات ہمیشہ اصولی کرنی چاہئے تاکہ اس سے نہ کسی کو دکھ ہو، نہ اپنا مسلک کمزور ہو۔

پھر آپ نے شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "ایضاح الحق الصریح" کے متعلق بھی وہی بات لکھی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھ چکے ہیں، اور یہ بھی تحریر فرماتے ہیں، کہ ان کی خلاف حنفیہ باتوں کے نہ ماننے سے احترام میں فرق نہیں آتا۔

اعتدال کی تلقین

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ ہر راستہ میں اعتدال کو پسند فرماتے تھے، غلو سے ہمیشہ گریزاں رہے، تصوف کے سلسلہ میں خود بھی چاروں سلسلہ میں بیعت تھے، اور دوسروں کو بھی چاروں سلسلہ میں بیعت فرماتے تھے، اور اس کا منشا یہ ہوتا تھا کہ کوئی کسی سلسلہ کی تنقیص پر نہ اتر آئے، بلکہ ہر سلسلہ سے اسے برابر محبت ہو، چنانچہ ایک مرید کو لکھتے ہیں:-

"الغرض کام کیجئے اور سب کو اپنا مقصد قرار دیجئے کسی کی تنقیص نہ کیجئے

سب سے ادب و احترام کا معاملہ کیجئے "

اس سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہئے جو کسی سلسلہ کو کمتر دکھانے کی سعی کرتے ہیں اور کسی کو بہت اونچا کرنے کی، اعتدال کی راہ کبھی ہاتھ سے چھوٹنی نہیں چاہئے، اور ہر سلسلہ کا احترام برابر ہونا چاہئے۔

اسلاف کے طریقہ پر ثابت قدمی

حضرت والاؒ اپنے اکابر کا جو طریقہ ہے اس سے سرمو انحراف نہیں کرتے تھے، مگر اسی کے ساتھ دوسرے اکابر کو بھی بُرا نہیں کہتے، بلکہ ان کے ساتھ ان کے منصب کے لائق برتاؤ کرتے ہیں، اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ :-

"ہمارے اکابر بدعات سے متنفر اور مجتنب ہیں، یہ مشرب ہمارے اکابر واسلاف کا رہا ہے، اس مشرب کے خلاف ہونے والوں کو ہم نہ سب کو کافر کہتے ہیں نہ سب کو فاسق کہتے ہیں نہ سب سے عداوت رکھتے ہیں "

وہ لوگ جو علماء دیوبند کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں غور سے ملاحظہ فرمائیں، اور خود فیصلہ کریں کہ وہ کس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، البتہ جو غلطیاں نظر آتی ہیں، ان پر علمی انداز سے بحث کرتے ہیں، اور یہ ہر اہل علم کا قدرتی حق ہے جس سے کسی کو روکا نہیں جا سکتا۔

ذکر کی اہمیت

حضرت شیخ الاسلامؒ اپنے وابستگان سے پاس انفاس کا عمل کروایا کرتے تھے، تاکہ ذکر اللہ ہر سانس سے جاری رہ سکے، چنانچہ ایک صاحب کو تحریر فرماتے ہیں :-

"میرے محترم پاس انفاس سے اصلی غرض یہ ہے کہ انسان کا کوئی سانس

اللہ کے ذکر سے خالی نہ رہے، نہ اندر جانے والا سانس اور نہ باہر نکلنے والا سانس، انسان دن رات میں تقریباً پچیس ہزار سانس لیتا ہے، سب کا سب ذکر سے معمور رہے، عمر عزیز کا جو حصہ بھی ذکر میں گذرے وہی زندگی ہے، اور وہی مفید ہے۔" (مکتوبات شیخ الاسلام ص۱۹۳)

ہمارے اسلاف و اکابر ذکر اللہ پر کس قدر زور دیتے ہیں، اور یہی نہیں کہ صرف دوسروں کو نصیحت کرتے ہوں، بلکہ خود ان کا اپنا عمل بھی اسی پر تھا، ہر آن ان کا قلب جاری رہتا تھا، اور کسی وقت ان پر ذکر اللہ سے غفلت طاری نہیں ہوتی تھی، یہی وجہ تھی کہ ان میں خوف خدا، دین سے شیفتگی اور راہ حق پر جان نچھاور کرنے کا جذبہ کارفرما تھا۔

بُری عادتوں سے اجتناب

ایک مرید کو لکھتے ہیں کہ:۔

"بے شک یہ امور ثلاثہ جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا، امانت میں خیانت کرنا، نفاق کے شعبے ہیں، مگر یہ نفاق عقیدہ نہیں ہے، نفاق عمل ہے: ان کو جہاں تک ممکن ہو چھوڑنا چاہئے، اور اس کے ترک کی کوشش میں لگے رہنا چاہئے اور بارگاہ خداوندی میں استغفار کرتے رہنا چاہئے اور اسی سے دعا مانگتے رہنا چاہئے کہ وہ کریم کارساز ان تمام بری عادتوں اور تمام ناپسندیدہ اخلاق اور اعمال سے ہم کو بچائے اور موجودہ ناسزا امور کو دور کرے۔"

مسلمانوں میں بھی اب یہ عیوب و نقائص عام ہیں اور حیرت یہ ہے کہ انھیں احساس تک نہیں ہوتا، کہ وہ کسی بُرائی میں مبتلا ہیں، اور جاں بلب کی حد تک پہنچ چکے ہیں، اور جب کسی قوم یا جماعت سے بُرائی کے متعلق برائی کا احساس مٹ جاتا ہے تو یہ اس قوم کی انتہائی نازک حالت کا موقع ہوتا ہے۔

❊ ❊ ❊ ❊

اہل وعیال کو چھوڑ کر پیر کے پاس آنا

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اپنے معتقدین کو اتباع شریعت کی برابر تاکید فرمایا کرتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"آپ ذکر اللہ اور اتباع شریعت و سنت پر مداومت کرتے رہئے انشاء اللہ اصلاح رفتہ رفتہ ہو جائے گی، اہل وعیال اور ان کی خبرگیری چھوڑ کر میرے پاس آنا ٹھیک نہیں ہے"

وہ لوگ جنہیں اس کام میں غلو پسند ہے، ان کو چاہیئے کہ حضرت والاؒ کی اس تحریر سے سبق حاصل کریں اور پھر فیصلہ کریں کہ غلو ہر کام میں کس قدر برا ہے۔ اتباع سنت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، اصل عبادت اور بزرگی اس کا نام ہے، کہ آدمی اپنے کو شریعت کا تابع بنائے، حدیث میں آیا ہے وان لزوجك عليك حقا ولجسدك عليك حقا۔

میل ملاپ اور اتحاد

اسی طرح باہمی میل ملاپ اور اتحاد و اتفاق کی بھی تاکید کیا کرتے تھے زبانی فہمائش بھی فرماتے اور خطا کے ذریعہ بھی اس کی اہمیت ذہن نشیں کرتے۔ جو نہ موقع ملتا اسے خالی نہ جانے دیتے، ایک صاحب کو لکھتے ہیں :۔

"خاندان میں میل جول، اتفاق و اتحاد ہونا بہت مفید اور ضروری ہے۔ اور جو سبیل بھی باعزت میل جول کی ہو، اس میں کوتاہی نہ ہونی چاہیئے، افسوس کہ ابوالفضل صاحب عقلمندی کی باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے، اور غلط طریقوں کو اختیار کئے ہوئے ہیں"

دیکھ رہے ہیں جو بات ضروری ہے اسے برملا کہہ سناتے ہیں، کسی کی

رو رعایت نہیں کرتے، افسوس اب اس زمانہ میں مسلمان باہم مقدمہ بازی میں مبتلا ہیں، ایک خاندان میں کئی کئی گروپ ہیں، اور ہر ایک دوسرے کے درپے آزار ہے، ان میں کسی کو مطلقاً پرواہ نہیں کہ ہمارے اس کرتوت کا انجام کیا ہوگا، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہزاروں خاندان باہمی جھگڑوں کی وجہ سے تباہ و برباد ہوگئے، جائدادیں نیلام ہوگئیں، گھر بک گئے اور زیورات گروہو کر مہاجنوں کے پاس چلے گئے، کڑوروں کی مالیت لاکھوں میں بکی اور وہ صرف کچہری کے وکلاء اور پیروکار کے پیچھے مارے مارے پھرے۔

جوانی کا قیمتی دور

جوانی کا زمانہ جو سب سے قیمتی ہوتا ہے، اور جسے نوجوان طبقہ سب سے زیادہ برباد کرتا ہے، اور بڑی بے دردی سے، حضرت والا اپنے وابستگان اور دوسرے مسلمانوں کو اس حصۂ زندگی کی اہمیت بتا کر عمل کی ترغیب فرمایا کرتے تھے، ایک صاحب کو ان کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"نیز اتباع شریعت اور احیاء سنت میں آپ کی مساعی سے بہت خوشی ہوئی خصوصاً اذکار کی پابندی بہت امید افزا ہے، اس میں کسل کو راہ نہ دیجئے اور مردانہ وار قدم بڑھایئے، عمر عزیز کا ہر حصہ بالخصوص شباب کا زمانہ بہت ہی قیمتی اور کارآمد ہے، اس میں ذکر و شغل بہت زیادہ مؤثر اور دیرپا ہوتا ہے، اس کو غفلتوں میں ضائع کرنا خسارہ عظیمہ ہے، اسے غنیمت کبری سمجھنا اور اس کو موجبات رضوانیہ ذکر و فکر سے معمور رکھنا از بس ضروری اور مفید ہے۔"

کہاں ہیں نوجوان علماء وہ ان سطروں کو بار بار پڑھیں اور سوچیں کہ ان پر کیا ذمہ داری عاید ہوتی ہے، ان کو کیا کرنا چاہئے اور کیسی زندگی گذارنی چاہئے۔

حدیث کا اشتغال

اپنے شاگردوں کو درس و تدریس کی رغبت دیتے، اور جب کوئی اس طرح مسرت افزا خبر ملتی بہت خوش ہوتے، بالخصوص حدیث کا درس ظاہری اور باطنی دونوں لحاظ سے بہت با برکت ہوتا ہے، ایک صاحب کو لکھتے ہیں کہ

"آپ کو مشکوٰۃ شریف کی تدریس تفویض ہوئی ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے علم حدیث کا اشتغال بہت ہی مبارک ہے، جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تعلق بہت قوی ہو جاتا ہے۔"

خدمت حدیث

اور حدیث کا یہ نفع جس طرح پڑھانے سے حاصل ہوتا ہے، مطالعہ اور تحریر سے بھی ہوتا ہے، خود حضرت والا ہی لکھتے ہیں:۔

"حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "فیوض الحرمین" میں لکھا ہے، کہ میں نے مشاہدہ کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اور مشتغلین حدیث کے درمیان ایک نورانی دھاگہ متصل ہے، اس لئے انھوں نے وصیت فرمائی ہے کہ تم کو اشتغال بالحدیث رکھنا چاہئے تعلیماً ہو یا مطالعتہً تحریراً یا کسی طرح اس کو ہمیشہ باقی رکھنا چاہئے، اس اشتغال میں ہمیشہ سلف صالحین کا اتباع اور ادب ملحوظ رکھنا چاہئے۔"

خوش خبری ہے ان خدام حدیث کو جو دن رات اسی خدمت میں لگے لپٹے رہتے ہیں۔

مختصر حالات زندگی

موضع الہ داد پور تانڈہ ضلع فیض آباد وطن تھا، آپ کے والد محترم مولانا

سید حبیب اللہ صاحبؒ بانگر مؤ ضلع اناؤ میں ہیڈ ماسٹر تھے، وہیں آپ پیدا ہوئے، پرائمری تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۳۰۹ھ میں دیو بند حاضر ہوئے، ابتدائی درجۂ عربی میں داخل ہوئے، ۱۳۱۶ھ میں فراغت حاصل کی۔ واپس ہو کر والد بزرگوار کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، حجاز پہنچ کر حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے اکتساب فیض کیا، ۱۷ سال تک مسجد نبوی میں درس حدیث دیا شیخ الہندؒ کی معیت میں اسارت مالٹا کی اذیت برداشت کی، ۱۳۳۹ھ میں مالٹا سے شیخ الہندؒ کے ساتھ ہندوستان واپسی ہوئی، یہاں سیاسیات میں شریک ہو گئے، اور ملک کی آزادی کے لئے وہ سب کچھ کیا جو ایک محب وطن کو کرنا چاہئے متعدد بار جیل جانا پڑا، اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے، جب تک ملک کو آزاد نہیں کرا لیا، ملک وملت نے شیخ الاسلام کے نام سے یاد کیا۔

۱۳۴۶ھ میں حضرت کشمیریؒ کی علیحدگی کے بعد دار العلوم دیو بند کی مسند صدارت پر فائز کئے گئے، اور اخیر عمر تک اسی عہدہ پر قائم رہے، ۱۲ رجمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ ۳ بجے دن میں وفات پائی، اور قبرستان قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں، آپ کے ہزاروں شاگرد اور لاکھوں مرید ملک و بیرون ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، آپ کی متعدد تصانیف ہیں، تقریر ترمذی متعدد تلامذہ نے مختلف ناموں سے شائع کی ہیں، نقش حیات، الشہاب الثاقب، مکتوبات شیخ الاسلام، جمعیۃ علماء ہند کے مختلف اجلاسوں کے معدد خطبات صدارت اور سیاسیات پر متعدد رسالے آپ کے قلم کے رہین منت ہیں، مفصل حالات کے لئے دیکھئے نقش حیات، الجمعیۃ دہلی کا شیخ الاسلام نمبر، الحرم میرٹھ کا حضرت مدنی نمبر، حیات شیخ الاسلام از مولانا سید محمد میاںؒ۔

(مشاہیر علماء دار العلوم دیو بند ص۵۵، ۵۶)

تاریخی حقائق

سید الملت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی زندگی کے بعض گوشے

یہ سبھی جانتے ہیں کہ علماء ندوہ میں سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۷۳ھ) کا تقریباً وہی درجہ ہے جو علماء دیوبند میں حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ کا۔ یہ معلوم ہے کہ سید صاحبؒ اخیر عمر میں حکیم الامۃ سے مرید ہو گئے تھے، اور ان کے مرشد حضرت تھانویؒ نے بہت جلد انھیں خلافت عطا کر دی تھی۔

سید صاحبؒ کی حیات پڑھتے ہوئے کہیں کہیں نشان لگاتا گیا۔ اس وقت انہی میں سے چند پیش کیا جا رہا ہے۔ جو ہم جیسے دوسروں لوگوں کے لئے سبق آموز ہے ——— طالب دعاء: ظفیر صدیقی

کم عمری میں تقویۃ الایمان کی خواندگی

ان کی ابتدائی زندگی کے سلسلہ میں لکھا ہے:۔

"ان کے بھائی مولانا ابو حبیب کو گاؤں کی مسلمان خواتین کی اصلاح کی دھن تھی، ان کے وعظ کی صورت یہ تھی کہ مولانا اسمٰعیل شہید کی "تقویۃ الایمان" نامی کتاب اپنے چھوٹے بھائی سید سلیمان کے ہاتھ میں دے کر پردہ میں خواتین کے سامنے بٹھا دیتے، اور وہ معصومانہ انداز سے پڑھتے جاتے اور مولانا پس پردہ اس کی وضاحت فرماتے جاتے" (تذکرہ سلیمان ص ۳۳)

اس کا کیا اثر ہوا، سید صاحبؒ خود فرماتے ہیں :-

"یہ تقویۃ الایمان پہلی کتاب ہے جس نے مجھے دین کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں اور کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں ان میں سے ایک نے بھی اپنی جگہ سے نہ ہل سکی۔" (تذکرہ سلیمان ص۳۵)

اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ بچوں کو ابتدائی زندگی میں مذہبی تعلیم دینا بہت ضروری ہے اور تعلیم کسی اچھے مصنف کی مستند کتاب کے ذریعہ ہونی چاہئے تاکہ دین بچے کے ذہن میں راسخ ہو جائے، افسوس اب ہماری اس طرف قطعاً توجہ نہیں ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ بچے آگے چل کر بے راہ ہو جاتے ہیں۔

متانت وسنجیدگی

پڑھنے کے زمانہ میں طبیعت میں متانت وسنجیدگی کا یہ عالم تھا کہ:-

"اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا تو اس کا جواب نرم الفاظ میں دیتے اور خاموش ہو جاتے، کبھی سخت کلام یا لب ولہجہ سخت نہ ہوتا، لیکن درسی کتابوں کی تکرار میں لب ولہجہ البتہ زور دار ہوتا، اور بیان کی قوت وروانی سے شرکاء کے دل پر متکلم کا رعب بیٹھ جاتا۔" (ایضاً ص۳۶)

ایک آجکل کے طلبہ ہیں، لڑنے جھگڑنے میں تو شیر ہوتے ہیں، مگر تکرار میں نرے جاہل معلوم ہوتے ہیں، کتابی مناسبت برائے نام ہوتی ہے، اور اس وقت وہ زور نہیں ہوتا جو ہونا چاہیئے، البتہ کچھ ہونہار کو کتابی مناسبت بھی ہوتی ہے۔

زمانہ طالب علمی میں شہرت

اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی طالب علمی میں ہی کافی شہرت حاصل کرلی

لکھا ہے:-

"اسی زمانہ میں نواب محسن الملک مرحوم دارالعلوم ندوہ کے معائنہ کے لئے تشریف لائے، سید صاحب نے عربی میں قصیدہ لکھا تھا، نواب صاحب سے کہا گیا کہ یہ قصیدہ سنائیں گے، چنانچہ آپ نے اپنا عربی قصیدہ سنایا، نواب صاحب نے فرمایا میں اس پرانی ادب کا قائل نہیں، عربی کا کوئی اخبار منگوایئے، اخبار لائے گئے، سید صاحب نے اس کو پڑھ کر اس کا ترجمہ سنایا، نواب صاحب بے حد خوش ہوئے۔"

(تذکرہ سلیمان صـــ)

عام طالب علموں کو اس واقعہ کو پڑھ کر سوچنا چاہئے کہ کیا وہ بھی قصیدہ عربی لکھنے اور عربی اخبارات کے ترجمہ پر قادر ہیں، یا نہیں، ان کی استعداد بھی پہنچتی ہے یا نہیں، صرف اردو اخبارات سے ہی مناسبت ہے یا عربی سے بھی۔

عربی میں تقریر

اسی طرح ایک جلسہ میں فوری طور پر ایک عنوان دیا گیا کہ اس پر تقریر کرو۔ سید صاحب لکھتے ہیں:-

"میں اس موضوع پر عربی میں اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کئے ہر طرف سے احسنت و آفریں کی صدائیں بار بار بلند ہو رہی تھیں، استاذ مرحوم (مولانا شبلی) نے جوش مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر میرے سر پر باندھ دیا۔" (ایضاً صـــ)

یہ واقعہ ہے کہ طلبہ کی استعداد کی ہر دور میں قدر کی گئی ہے اور اس کی حوصلہ افزائی بڑوں نے کی ہے ہمارے اس زمانہ میں استعداد علمی کا فقدان ہوتا جارہا ہے اور طلبہ اپنی معمولی استعداد پر قناعت کرنے

لگے ہیں، ورنہ اس زمانہ میں پہلے سے بہت زیادہ سہولتیں حاصل ہیں، کاش طلبہ کی سوئی بستی میں پھر ایک دفعہ بیداری کی لہر دوڑ جاتی، اور وہ اپنے مقام و منصب کو جان لیتے۔

استاذ کو اعتماد

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی استعداد کا ہی نتیجہ تھا کہ علامہ شبلیؒ نے بوقت وفات سید صاحبؒ کو بلایا اور فرمایا:۔

"سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کر دو"

(تذکرہ سلیمان ص۲۲)

چنانچہ سید صاحب نے یہ خدمت انجام دی اور چھ بلکہ سات ضخیم جلدوں میں سیرت النبی مکمل کر کے شائع کرایا، جسے پڑھ کر سارے اہل علم نے تحسین کی۔

سیاست سے کنارہ کشی

سید صاحبؒ کے علمی شغف کا حال یہ تھا، کہ سیاسی دور میں انھوں نے اس کی بڑی حفاظت کی، بہت سارے لوگوں نے سیاست میں گھسیٹنا چاہا مگر وہ کسی کی بات میں نہیں آئے، اس زمانہ میں اپنے ایک ہمدرد کو لکھا:۔

"ڈر ہے کہیں پالیٹیکس میرے علمی مشاغل کو تہ و بالا نہ کر دے" (ایضاً)

خود لکھا ہے کہ بعض مرتبہ بعض لوگوں نے سیاسی بنانے کی کوشش کی مگر میں ان کی گرفت میں نہیں آیا، اور مختلف انداز سے سیاست کی خاردار جھاڑیوں سے بچتا رہا، اس پر بہت ساتھیوں کو ناگواری ہوئی۔ مگر میں نے کسی کی پرواہ نہیں کی۔

یہ واقعہ ہے کہ سیاست علمی ذوق کی قاتل ہے۔ اچھے اچھے یہاں آکر علم سے دور ہو گئے، اور ان کی علمی توانائی نے دم توڑ دیا، آج بھی جو

اہل علم ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ نام و نمود اور شہرت کے جال میں پھنسنے سے بچیں، اور اپنے علمی ذوق کا خون نہ کریں۔

عمر خیام پر تحقیقی کام

عمر خیام پر آپ نے کتاب لکھی ہر طرف اس کی تعریف ہوئی، علامہ اقبال نے لکھا کہ کوئی مشرقی یا مغربی عالم اس پر اضافہ نہ کر سکے گا، مگر خود سید صاحب لکھتے ہیں :-

"میں نے یہ کتاب محض اس اظہار کے لئے پیش کی تھی کہ اہل مغرب کو معلوم ہو جائے کہ ان کو جس ریسرچ پر ناز ہے، مشرقی علماء اس میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں، خدا کا شکر ہے ایسا ہی ہوا" (تذکرہ سلیمان ص۵۶)

یہ سچ ہے کہ مولوی کسی شعبہ میں جب تحقیقی کتاب یا مقالہ لکھنا چاہے گا تو وہ سبھوں سے آگے جائے گا، پیچھے ہرگز نہ رہے گا، سیاسی ہنگامہ آرائی نے بہت سارے علماء کو علمی لائن سے دور کر دیا، ورنہ ان کا مقابلہ جدید تعلیم یافتہ نہیں کر سکتے۔

سیاست سے علیحدگی

سید صاحب نے اپنے کو سیاست سے بچایا، خود لکھتے ہیں :-

"میں نے کبھی اس خرقۂ آلود کو از خود نہیں پہنا، کبھی محمد علی نے پہنا دیا کبھی شوکت علی نے، اور جب کسی نے پہنایا میں نے فوراً اتار پھینکا۔ ؎

حافظ زخود نہ پوشید ایں خرقۂ آلود

اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا"

(تذکرہ سلیمان ص۵۸)

اہل علم کو اس فریب میں کبھی نہیں آنا چاہئے، بنیادی کاموں میں حصہ

لینا چاہیے، اور کتب بینی اور مطالعہ سے شغف رکھنا چاہیے، سید صاحب نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے:-

"ڈپلومیسی (سیاست) کے معنی تو یہ ہیں کہ ہر ایک کو غیر دیانتدار سمجھ کر اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے، پھر اگر اس کی دیانت ثابت ہو جائے تو دیانتدار مانا جائے، اور میرا مسلک یہ ہے کہ ہر ایک کو اچھا اور دیانتدار سمجھا جائے پھر اگر اس کی بددیانتی ثابت ہو جائے تو اس سے قطع تعلق کیا جائے"

(تذکرہ سلیمان ۵۸)

سید صاحبؒ نے سیاست کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے، یہی وجہ ہے کہ علمی مزاج سے سیاسی مزاج میل نہیں کھاتا، سیاست میں ہر دن اکھاڑ پچھاڑ چلتی رہتی ہے، اور کوئی کسی کو موقع پاکر معاف نہیں کرتا۔

غلام ہندوستان میں آزاد ہندوستان کے لئے ایک تجویز

ایک مرتبہ جمعیۃ علمار ہند کے اجلاس کی صدارت پیش کی گئی اور اصرار کیا گیا تو قبول فرمالیا، مگر بات اس انگریزی حکومت کے زمانہ میں بڑے کام کی فرمائی، ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ علمار کا کلکتہ میں یہ اجلاس ہوا، اور آپ نے خطبہ صدارت میں تحریر فرمایا:-

"سوراج قائم ہونے کے بعد مسلمانوں کے پیش نظر جو معاملات ہیں ان میں ایک مطالبہ یہ بھی ہو کہ آئندہ (آزاد) حکومت میں مسلمانوں کے خالص مذہبی اور شخصی (پرسنل لا کے) قوانین کے تحفظ، ترقی و اصلاح اور استحکام کے لئے ایک علیحدہ انتظام ہونا چاہئے، اور اس کے لئے ایک قابل عمل خاکہ پیش کیا جائے"

اس کے بعد یہ بھی لکھا:-

"اگر آسمان دیکھ کر انقلاب کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے تو موجودہ حالات کو دیکھ کر مجھ کو یقین ہے کہ اگر اس طرح تدبیر نہیں کی گئی تو مسلمانوں کی ممتاز ہستی اس ملک میں قائم نہیں رہ سکتی" (تذکرہ سلیمان صلا)

آج ہمارے سامنے جو حالات آزادی کے بعد پیش آئے ہیں اس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، ملک چونکہ تقسیم ہو کر آزاد ہوا، اور دونوں طرف بے انتہا قتل و خونریزی ہوئی، اس لئے مسلمان کچھ بھی نہیں کر سکے، ورنہ یہ مطالبہ کرنا چاہیئے تھا۔

بیعت کی خواہش

ایک زمانہ آیا جب آپ کسی شیخ کامل سے بیعت ہونا چاہتے تھے، اس وقت آپ کی نظر حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ جیسے بزرگ کو تلاش کرنے لگی۔ خود لکھا ہے:۔

"کامل دس برس تک چپکے ہی چپکے ہندوستان سے عرب تک نظر دوڑاتا رہا، لیکن کوئی ہستی ایسی نظر نہیں آتی تھی، جو میرے درد کی درمانی کر سکے بعض بزرگ ملے بھی تو طبیعت کو ان سے مناسبت نہیں ہوئی، بار بار یہی خیال ہوتا تھا کہ کاش حضرت حاجی امداد اللہ صاحب حیات ہوتے"

یہ حقیقت ہے کہ بیعت دیکھا دیکھی نہ ہو جائے۔ بلکہ کامل پیر کی جستجو میں رہے۔ اور یہ بھی دیکھے کہ اس سے طبعی مناسبت ہے یا نہیں، اب تو مجمع کو دیکھتے ہیں اور جس پیر کے پاس مجمع کثیر نظر آتا ہے اور جہاں عمدہ کھانے پینے کا انتظام ہوتا ہے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیتے ہیں اور مافی الضمیر یہ بھی ہوتا ہے کہ بس بیعت ہوتے ہی خلافت مل جائے، انا للہ وانا الیہ راجعون

مرشد کامل

جوئندہ یابندہ۔ سید صاحب اپنے مقصد میں بالآخر کامیاب ہوئے، اور

حضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفہ ارشد پر نظر جا کر رکی. خود مرشد کا بیان ملاحظہ ہو کہ اس کی شکل کیا ہوئی، مرشد تھانویؒ مولانا دریا آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"مولانا سید سلیمان ندوی صاحب دفعۃً تشریف لے آئے، میں مکان پر تھا، سنتے ہی حاضر ہوا، میرے ذہن میں ان کا جثہ طویل وعریض تھا، ملا تو معتدل الخلقت پاکر قلب کو بہت انس ہوا، پھر ملاقات و مکالمت سے ان کی تواضع وسادگی و رعایت جلیس کو دیکھ کر تو مسخر ہی ہو گیا، گیارہ بجے تشریف لائے تھے، تین بجے واپس تشریف لے گئے، مجلس میں بہت دیر تک ثناخوانی کرتا رہا"

یہ حقیقت ہے کہ جوہر کو جوہری پہچانتا ہے اور وہی اس کی قدر و منزلت جانتا ہے، یوں خود حضرت سید صاحب عرصہ سے حکیم الامت کے عقیدت مندوں میں تھے، شبلی نعمانی کے خلاف جب کسی نے فتویٰ شائع کیا تھا، اس زمانہ میں سید صاحب نے لکھا تھا۔

"دیوبند خیر مگر مولانا تھانوی کے خلاف بولنے پر مجبور ہونا بڑی بدبختی ہے، خدا اس سے بچائے" (تذکرہ سلیمان ص۹۹)

سید صاحب کا خواب

ہوا یہ کہ ایک رات خواب میں حضرت حاجی امداد اللہؒ کی زیارت ہوئی، حضرت کے سینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درخواست کی کہ میرے سینہ کو ایسا کر دیجئے، یعنی اپنے سینہ کے جیسا بنا دیجئے، لکھا ہے :-

"شیخ الشیوخ مسکرائے اور ارشاد فرمایا، اب تو میں ایسا نہیں کر سکتا"

(ایضاً ص۱۳۱)

بس اس کی تعبیر یہ ذہن میں آئی کہ :-

"حضرت حاجی صاحب چونکہ عالم ناسوت سے تعلق منقطع فرما چکے ہیں اس لئے ان کو عذر ہے، اب ان کے کسی جانشیں سے تعلق جوڑنا چاہیئے"
(تذکرہ سلیمان ص۱۳۱)

بیعت کے لئے اقدام

یہ ذہن میں آنا تھا کہ نگاہ تھانہ بھون کے شیخ پر پڑی، اور وہاں جانا شروع کیا، ادھر جیسا کہ گذرا، خود حضرت تھانوی پر سید صاحب کی تواضع کا اثر ہوا، اس طرح دونوں بزرگوں کی دونوں سے طبعی مناسبت میل کھا گئی۔

اسی زمانہ میں یہ بھی خواب میں دیکھا:۔

"ایک پلنگ پر حضرت تھانوی تشریف فرما ہیں اور اسی کے پاس دوسر پلنگ پر حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ خود حضرت سید صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، یکایک مولانا مدنی اپنی جگہ سے اٹھے اور حضرت سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر مرشد تھانوی کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فرمایا ان کو میری طرف سے قبول فرمالیں" (ایضاً ص۱۴۱)

مرشد کامل کے ہاتھ پر بیعت

بس اس رویائے صادقہ کے بعد طے فرمالیا کہ حضرت تھانوی کے ہاتھوں میں ہاتھ دینا ہے، تھانہ بھون پہنچے، معلوم ہوا کہ حضرت لکھنؤ تشریف لے گئے ہیں، وہاں حاضر ہوئے، اور آپ کی درخواست پر حکیم الامت نے تربیت قبول فرمائی، یہ وسط اگست ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے۔

اس کے بعد حضرت سید صاحب کا رنگ کیسا بدلا خود ان کے جملوں سے اندازہ لگائیں:۔

"واہ واہ کا مزہ بہت اٹھا چکا، اب یہ رنگ دل سے اتر چکا، اب تو

آہ آ. کا ذکر رہے اور اپنی پچھلی تباہی کا ماتم اور آئندہ کی فکر در پیش
ہے " (تذکرہ سلیمان ص۱۱۹)

بیعت کے بعد تبدیلی

صباح الدین عبدالرحمٰن کا بیان ہے :-

"اس تعلق کے ساتھ سید صاحب کے لیل و نہار ہی بدل گئے، اگرچہ ان کی پوری زندگی دینداری اور پرہیزگاری میں گذری تھی، لیکن بادۂ طریقت سے سرشار ہونے کے بعد ان کی دینداری میں تقویٰ و تورع کا اور بھی زیادہ گہرا رنگ پیدا ہو گیا، عبادت و ریاضت بڑھ گئی، ذکر خفی کے ساتھ ذکر جلی بھی کرنے لگے علمی مذاکروں کے بجائے رشد و ہدایت میں صرف ہونے لگے " (ایضاً ص۱۱۹)

زندگی کا انقلاب اسے کہتے ہیں، سیرت پر عرصہ تک کام کرنے سے دل پہلے ہی روشن و تابناک ہو چکا تھا، مرشد نے توجہ ڈال کر اسے آئینہ کر دیا، اور اب خود سید صاحب کی نگاہ کرم دوسروں کے دلوں کو مجلّی بنانے لگی، لوگ آج بھی مرید ہوتے ہیں مگر یہ کیفیت کہاں دیکھنے میں آتی، ظاہری لباس تو کچھ بدلا نظر آتا ہے مگر دل کی دنیا میں کوئی انقلاب برپا ہوتے نہیں دکھائی پڑتا۔

حکیم الامت کا ارشاد

حضرت تھانوی کے ایک خلیفہ لکھتے ہیں :-

"ایک دفعہ سید صاحب ہی کی حالات کا ذکر آ گیا، تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو لکڑی سوکھی ہوتی ہے، دیا سلائی دکھاتے ہی بھڑک اٹھتی ہے اور جو گیلی ہوتی ہے اس کو عمر بھر پھونکتے رہیے، تو سوائے

دھواں کے کچھ نہیں اٹھتا۔ ان اسید صاحب میں کس بات کی کمی تھی۔"
(تذکرہ سلیمان ص۱۳۲)

مرشد کو اپنے مرید سے بہت محبت تھی، ایک دفعہ سید صاحب دفعۃً حضرت حکیم الامۃ کی مجلس میں پہنچ گئے تو مرید پر نظر پڑتے ہی کھڑے ہو گئے اور پھر فرمایا:۔

"واللہ میں تعظیماً کسی کے لئے نہیں اٹھتا، میں تو فرطِ محبت میں کھڑا ہو گیا۔"
(ایضاً ص۱۳۲)

عطائے خلافت

جلد ہی وہ وقت آیا کہ حکیم الامۃ نے خلافت سے نوازا، اس کی صورت یہ لکھی ہے کہ حضرت تھانویؒ نے استخارہ کے بعد بطورِ استشارہ لکھا:۔

"میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو خلافت دیدوں میں نے اس سلسلہ میں استخارہ بھی کر لیا ہے، آپ کا کیا مشورہ ہے۔" (ایضاً ص۱۴۰)

سید صاحب کو تھانہ بھون جانا تھا، اس لئے جواب نہیں لکھا خود تشریف لے گئے، ایک دن حضرت اقدس کی طرف سے پرچہ ملا، آپ نے میرے استشارہ کا جواب نہیں دیا عرض کیا گیا:۔

"حضرت والا، مکتوبِ گرامی پڑھ کر قدموں تلے سے زمین نکل گئی، کہاں میں اور کہاں یہ ذمہ داری۔" (ایضاً ص۱۴۱)

اس جواب سے مسرور ہوئے اور خلافت عطا فرما دی، یہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ حکیم الامت نے اس پر اپنی خوشی کا اظہار فرمایا کہ ایک لائق، فائق، متواضع اور اہلِ علم کے حصہ میں خلافت آئی، اور زمانہ مستقبل نے بھی ثابت کیا کہ حضرت سید صاحب واقعی اس میدان کے شہسوار تھے، اور اپنے مرشد کے نام کو اونچا کرنے والے تھے۔

رجوع و اعتراف

اس سند کے بعد حضرت سید صاحب نے "رجوع و اعتراف" کے عنوان سے اپنی گذشتہ تمام زندگی کا جائزہ لیا۔ اپنی تمام تحریروں پر نظرثانی فرمائی اور جہاں جو کمی نظر آئی، سب کی تکمیل کی، لکھا ہے :-

"تحریری زندگی کے چالیس سال پورے ہو گئے"

اس کے بعد تحریر فرمایا :-

"یہ خاکسار دہیچمداں علی الاعلان اپنی ان تمام غلطیوں سے جو دانستہ یا نادانستہ حق کے خلاف ہوئی ہوں دل سے توبہ کرتا ہے اور اپنے قصور کا اعتراف اور اپنی ہر اس رائے سے جس کی سند کتاب و سنت میں نہ ہو اعلان برارت کرتا ہے" (تذکرہ سلیمان ص۱۴۶)

یہ ایک لمبی تحریر ہے، اپنی ایک ایک چیز پر نظر ڈالی ہے، اور رب العلمین سے اپنی کوتاہیوں کی معافی چاہی ہے، اپنی تحریری لغزشوں سے رجوع کیا ہے، یہ پورا مضمون ہر عالم دین کے پڑھنے کے لائق ہے، جب آپ کے شیخ کی نظر سے یہ مضمون گذرا بہت دعائیں دیں۔

مگر اسی کے ساتھ ایک طبقہ کی طرف سے اس پر بڑا احتجاج ہوا، آپ نے سب کو برداشت کیا، اور سبھوں کو معقول جواب دیا۔

عہدہ سے انکار

۱۹۴۴ء میں ریاست حیدرآباد نے صدر الصدور کا عہدہ پیش کیا، اور قبول کرنے پر اصرار کیا گیا، مگر برابر انکار ہی فرماتے رہے، اور پھر اظہار کیا۔

"جو لوگ عہدہ و منصب کے پیچھے پھرتے ہیں وہ ان کو ملتا نہیں اور جن کو اس کی خواہش نہیں ان پر اصرار کیا جاتا ہے کہ یہ اعزاز ہوگا، اتنی تنخواہ

ہو گی "۔ (تذکرہ سلیمان ص۱۵۱)

یہ حقیقت ہے کہ اگر عالم دین میں عالمانہ شان ہو تو دنیا اس کے پیچھے ہوتی ہے، علماء اپنے اندر وہ کمالات پیدا کریں جو علم کا تقاضا ہے پھر دیکھیں کہ ان کی بے نیازی پر دنیا کیسے جبہ سائی کرتی ہے ۔

کراچی جاکر افسوس

کراچی تشریف لے گئے، تو فرماتے تھے :۔

"کراچی نے مجھے جاہل بنا دیا، یہاں نہ کوئی اچھی لائبریری ہے، نہ لکھنے پڑھنے کی کوئی جگہ، میرے لئے تو کوئی عمدہ کتب خانہ ہو، اور اس میں بیٹھ کر کام کر سکوں "۔ (ایضاً ص۲۲۹)

ایک اہل علم کی اس اذیت کو ایک ایسا ہی اہل علم محسوس کر سکتا ہے اب تو نوجوان علماء سے مطالعہ اور کتب بینی کا شغف ختم ہوتا جا رہا ہے، دنیا کے دوسرے کاموں سے دل چسپی ہے مگر علم و کتاب سے نہیں، بلکہ چند کے سوا سبھوں کو دوری ہوتی جا رہی ہے ۔

شادی میں سادگی

سید صاحب نے اپنی اخیر عمر میں شادی ایک بیوہ سے کی اور بڑی سادگی سے کی، ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"میں نے ایک رسمی تقریب سمجھا، انتہائی سادگی، خاموشی اور سکوت کے ساتھ یہ کار خیر انجام پایا، طرف ثانی سے بھی میں نے یہی شرط کی تھی اور انھوں نے پوری طرح وفا کیا، یہاں تک کہ میں ایک جوڑا کپڑا تک ساتھ نہیں لے گیا، ۷ جنوری کو نکاح ہوا، ۹ کو رخصتی ہوئی، اعظم گڈھ سیدھے لے آیا، دستور زمانہ کے مطابق وطن بھی نہیں لے گیا "۔ (حیات سلیمان ص۶۰۲)

مسلمانوں میں اس سادگی کی کمی ہوتی جارہی ہے، لوگ پڑھے لکھے بھی رسم ورواج میں پڑنے لگے ہیں، جو چیز بہت آسان تھی، اسے گرانبار بنارکھا ہے، اسلام سادگی کو پسند کرتا ہے، وہ رسوم ورواج کا پابند نہیں بناتا ہے علماء کے طرز عمل سے سبق لینا چاہیئے۔

سید صاحب کی نرم دلی

سید صاحب ندوہ کے معتمد تھے، ایک دفعہ ان کی معتمدی کے زمانہ میں طلبہ نے اسٹرائک کی، اسٹرائک ختم ہونے کے بعد طلبہ کی سزا کا مسئلہ آیا تو اختلاف رائے ہوگیا:۔

"سید صاحب کی اپنی فطری نرمی اور عفو ودرگذر کی بناء پر رائے تھی کہ اسٹرائک کرنے والوں کے ساتھ سختی نہ کی جائے، جن طلبہ کا نمایاں حصہ نہیں تھا، اور ان کو ندامت ہے ان کو معاف کردیا جائے، لیکن دوسرے بعض اراکین سخت سزا کے حق میں تھے" (حیات سلیمان ص۱۱۲)

معلوم ہوا کہ اہل علم اور اساتذہ قسم کے لوگوں میں طلبہ سے ہمدردی اور محبت زیادہ پائی جاتی ہے اور صحیح یہی ہے کہ طلبہ کچی عمر کے ہوتے ہیں، اور ناتجربہ کار بھی، ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ ہی مفید ہوتا ہے۔

سید صاحب کا نظریہ غیروں کے سلسلہ میں

عام طور پر مزاج ایسا ہی پایا تھا، فرماتے تھے:۔

"میں ہر شخص کو اچھا سمجھتا ہوں، جب تک وہ اپنے کو بُرا نہ ثابت کردے، محبت، اعتماد اور مسامحت میرا دستور العمل ہے، چنانچہ اس وقت تک اس میں کامیابی ہوئی ہے، جس وقت یہ بات نہ ہوگی میں نہ رہوں گا" (ایضاً ص۱۱۶)

اسے کہتے ہیں اعتماد وحسن ظن، اب تو بے اعتمادی کا دور ہے، کسی کو کسی پر اعتماد نہیں، کوئی کسی کا خیر خواہ نہیں، یہ دور عجیب دور ہے نفسی نفسی کا عالم ہے اور ہر شخص پریشان حال ہے کسی کو قلبی سکون حاصل نہیں ہے، یہ سب بے اعتمادی کا نتیجہ ہے ۔

قناعت اور خرچ میں کمی

سید صاحب یہ بھی فرماتے تھے :۔

"زندگی میں آسودگی روپے کی زیادتی میں نہیں، بلکہ مصارف کی کمی میں ہے، اور ہر نئی آمدنی اپنے ساتھ نیا خرچ بھی لاتی ہے" (حیات سلیمان ص۶۱۹)

یہ ایک حقیقت ہے کہ آمدنی میں اضافہ سے اطمنان نہیں ہوتا ہے ھل من مزید کا نعرہ لگتا ہی رہتا ہے، دراصل مصارف میں اعتدال ضروری ہے دیکھا گیا ہے بعض لوگ کم پیسوں میں اپنے گھر اور اپنی اولاد کو بہت صاف ستھرا رکھتے ہیں، جو مالداروں کو بھی میسر نہیں ہوتا ہے ۔

سید صاحب میں مطالعہ کا ذوق

مطالعہ کا ذوق طبعی تھا اور طالب علمی سے تھا، آپ کے ایک ساتھی لکھتے ہیں :۔

"سید صاحب کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے پڑھنے اور کتب بینی کرنے میں اپنے ساتھیوں کے مقابلہ میں آگے پایا، ہر طرح کی چیزیں پڑھتے، ہوش ربا کو اس توجہ سے پڑھا تھا کہ ایک سفر میں پیدل چلنا پڑا تو وہ قصے سناتے رہے اور وہ تفریحی سفر بن گیا" (ایضاً ص۶۲۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے جو پڑھتے تھے اسے محفوظ بھی رکھتے تھے، اور یہی چاہئے بھی، بے توجہی کے ساتھ مطالعہ زیادہ کارآمد نہیں ہوتا ہے، جب تک توجہ

نہ ہوگی چیزیں محفوظ نہیں رہیں گی، اس کا اثر یہ تھا کہ یہ ذوق راسخ ہوگیا، اور اپنے وقت کے علامہ بن گئے۔ دارالمصنفین میں ہزاروں کتابیں ہیں، یہ ساری سید صاحبؒ کے مطالعہ سے گذر چکی تھیں، شاہ معین الدین ندوی نے لکھا ہے:۔

"مشکل ہی سے کوئی کتاب ان کے نوٹوں سے خالی نکل سکتی ہے، بعض بعض کتابیں تو نوٹوں سے بھری ہوئی ہیں" (حیات سلیمان ص۶۲۲)

علم میں رسوخ اور وسعت مطالعہ اور کتب بینی سے آتی ہے، آدمی کسی کام میں ہو مگر ایک وقت مطالعہ کے لئے خاص کر لینا چاہئے، اور اس وقت میں مطالعہ کی پابندی رکھے، پھر انشاء اللہ وہ معلومات کے خزانہ کا مالک ہوگا۔

سید صاحب کے معمولات

سید صاحب کے معمولات کے سلسلہ میں لکھا ہے:۔

"نماز فجر کے بعد کلام مجید کی تلاوت کرتے، ناشتہ کے بعد کام کیلئے کتب خانہ آجاتے، اور بارہ ساڑھے بارہ تک اس انہماک سے کام کرتے کہ وقت کا خیال نہیں رہتا، کھانے کے لئے بار بار یاددہانی کرنا پڑتی اور دسترخوان پر دیر تک انتظار کرنا پڑتا۔ کام کے وقت کوئی ملنے والا آجاتا، تو ان کو سخت ناگوار ہوتا، لیکن مروت کی وجہ سے کچھ نہ کہتے" (ایضاً ۶۲۹)

اسی طرح دوپہر کے بعد سے بھی سونے سے پہلے تک علمی کاموں میں منہمک رہتے، اگر اوقات کی پابندی کاموں میں نہ کی جائے تو پھر برکت جو ہونی چاہئے نہیں ہوتی ہے، ہمارے اس زمانہ کے نوجوان علماء اس سے غافل ہیں،

سید صاحبؒ بڑے لوگوں میں تھے، وفد خلافت میں جو غیر ممالک گیا تھا مذہبی رہنما کی حیثیت سے شریک رہے، کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے رکن بھی رہ چکے تھے، بڑی بڑی کانفرنسوں کی صدارت کر چکے تھے، قدیم و جدید دونوں کے سنگم شمار ہوتے تھے۔

مختصر حالات زندگی

آپ کی ولادت ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء مطابق صفر ۱۳۰۲ھ میں دیسنہ ضلع پٹنہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی، پھر کچھ دنوں پھلواری شریف میں رہے، اس کے بعد مدرسہ امدادیہ دربھنگہ آئے، چند مہینے رہ کر شوال ۱۳۱۱ھ مطابق فروری ۱۹۰۱ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا، اور ۱۹۰۶ء میں وہاں سے فارغ ہوئے، فراغت کے بعد، رسالہ "الندوہ" سے لکھنے پڑھنے کا کام شروع کیا۔ اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی کے ایما اور مولانا آزاد کی فرمائش پر "الہلال" کلکتہ کی ادارتی ذمہ داری قبول کی، ۱۹۱۳ء کے اواخر میں دکن کالج پونہ کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔

پھر استاذ محترم علامہ شبلیؒ کی فرمائش پر اعظم گڈھ تشریف لے آئے اور دار المصنفین قائم کیا، ۱۹۲۳ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم منتخب ہوئے، اور تا قیام ہندوستان معتمد رہے، اخیر عمر ۱۹۴۶ء میں بھوپال تشریف لے گئے اور قاضی القضاۃ کے فرائض انجام دینے لگے، ۱۹۵۰ء تک بھوپال میں قیام رہا، پھر پاکستان چلے گئے اور زندگی کا بقیہ حصہ وہیں گذارا۔

۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو کراچی میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور احاطہ مقبرہ اسلامیہ کالج میں مدفون ہوئے۔

آپ حضرت تھانویؒ کے اجل خلفاء میں ہیں، آپ کی تصانیف میں سیرت النبی، سیرت عائشہؓ، ارض القرآن، نقوش سلیمانی، خطبات مدراس حیات خیام اور دیگر کتابیں ہیں۔

تاریخی حقائق

حضرت مولانا گیلانیؒ کی زندگی کے بعض گوشے

معاصرین واحباب کی قدر و منزلت

مولانا گیلانی اپنے اخلاق و شمائل میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، دل صاف ستھرا تھا، اپنے احباب اور بڑوں بلکہ چھوٹوں کی قدر و منزلت کے معترف تھے، مولانا کے ایک شاگرد نے لکھا ہے :-

"اپنے معاصرین کی قدر کرنا، اور ان کے کمال کا اعتراف کرنا وہ وصف عالی ہے، جو ہر زمانہ میں نادر رہا ہے، مگر مولانا میں یہ نادر وصف بدرجہ اتم موجود تھا، اس سے بڑھ کر وہ اپنے چھوٹوں کے کمالات کا بھی بڑی فراخ دلی سے تسلیم کرتے اور اعلانیہ اس کا اظہار کرتے" (حیات گیلانی ص۲۷۵)

اب یہ وصف نوجوان علماء سے ختم ہوتا جارہا ہے، بس وہ اپنے مقابلہ میں اپنے تمام معاصرین اور احباب کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں، بلکہ موقع پاکر ان پر تنقید سے بھی نہیں چوکتے، باقی چھوٹوں کو بڑھانے کا جذبہ مفقود سا ہوتا

جارہا ہے، حالانکہ چھوٹے بڑوں کے ابھارنے سے ہی جلد ابھرتے ہیں، یوں ذی استعداد چھوٹے بھی دیر سویر بڑے بن کر رہتے ہیں ۔

تعلقات کا وسیع دائرہ

مولانا عبدالباری ندویؒ نے مولانا گیلانی کے تعلقات کے سلسلہ میں لکھا ہے :-

"مولانا کا دائرہ تعلقات نہ صرف یونیورسٹی تک محدود نہ تھا، پورے حیدر آباد کے عوام و خواص، علماء و مشائخ، امراء، وزراء، افسروں، ماتحتوں، بڑے چھوٹے تاجروں، دکانداروں، ہر طبقہ تک پھیلا ہوا تھا، اس کے باوجود شاید ایک مثال بھی کوئی بتا سکے کہ کسی طبقہ کا ایک فرد بھی مولانا سے ناراض رہا، ناراض کیا، سب ہی بڑی عزت و محبت کرتے تھے۔" (حیات گیلانی ۱۵۳)

یہ بھی اخلاق و اعمال کی بلندی، ہر طبقہ میں مقبول تھے، اور سارے لوگ دل سے ان کی علمی خدمت اور ان کی بزرگی کے قائل تھے، انھوں نے سبھوں کی دینی علمی خدمت انجام دی تھی، اور سبھوں کو سہارا دیا تھا، سچ پوچھئے تو علماء کے ایسے اخلاق سے اس ملک میں دین کی اشاعت ہوئی، اور اسلام کی آغوش میں لوگ دوڑ، دوڑ کر آئے اور پناہ لی، اور آخرت کی راہ ہموار کی، اس دور کے علماء کو بھی چاہیئے کہ اس سے سبق لیں اور اپنے کو اسلاف و اکابر کے سانچے میں ڈھالنے کی جدوجہد کریں ۔

جدید تعلیم یافتوں کی اصلاح

حضرت مولانا گیلانی کی خدمت میں جہاں علماء مشائخ حاضر ہوتے، نئے تعلیم یافتہ نوجوان بھی آتے جن کے چہروں پر داڑھی نہیں ہوتی تھی، کچھ لوگ اس کو پسند نہیں کرتے تھے، مگر مولانا فرماتے :-

"میں سوچتا تھا کہ جب تک غریب ہم دینداروں کے قریب نہ ہوگا، ہمارے اعمال و اخلاق نہ دیکھے گا، اس تک دین کا پیغام آخر پہنچانے کی کیا صورت ہوگی، اور وہ ہمارا اثر کیسے قبول کرے گا، پھر صرف ظاہری شکل وصورت دیکھ کر کسی کے متعلق حتمی فیصلہ کرلینا کہ یہ دین سے باغی ہے کچھ زیادہ دانشمندی بھی نہیں" (حیات گیلانی ص۲۷۵)

مولانا مرحوم کا نظریہ کس قدر صحیح تھا، اصلاح کا طریقہ اس کے سوا دوسرا زیادہ موثر نہیں ہوسکتا، تنہا صرف تنقید اور کسی کو برا بھلا کہنے سے اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی ہے، علماء کو ہر طبقہ سے قریب ہوکر اس کے اصلاح حال کی سعی کرنی چاہیئے، اور اپنے اچھے اعمال و اخلاق سے اس کو متاثر ہونے کا موقع دینا چاہیئے، آج اس کی ہمارے اندر بڑی کمی ہے، ہم سب کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

شدت وغلظت

مولانا گیلانی اپنے خط میں لکھتے ہیں :-

"ہمارے علماء اگر فظاظت و غلظت ہی سے اس سلسلہ میں کام لینا ضروری قرار دیں گے تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ قرآنی نص محکم لانفضوا من حولک کی شکل میں ان کے سامنے نہیں آئے گا" (ایضاً ص۲۷۵)

یہ اشارہ ہے کہ قرآن پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و محبت اور نرم خوئی و دلجوئی کی جو تعریف کی گئی ہے وہ بے وجہ نہیں ہے، اس سے دوسرے انسان رام ہوتے ہیں اور پھر جو بات ان سے کہی جاتی ہے، اس کو قبول کرتے ہیں، اگر آپ ایسا سلوک نہ کرتے تو انسانوں کا مجمع آپ سے الگ تھلگ ہی رہنا پسند کرتا، اور اسلام کی دولت سے محروم رہ جاتے پس علماء کا فرض ہے کہ وہ تمام غیر مسلموں میں دین اپنے اعمال و اخلاق سے

پہنچائیں اور اپنوں میں بھی ۔

غیرمسلموں کی محرومی پر افسوس

مولانا اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کی اتنی بڑی آبادی اور اس پر بھی بیس بائیس کروڑ نفوس ایسے رہ گئے جنھوں نے اپنے پیغمبر کو نہیں پہچانا، نہ انہوں نے پہچانا اور نہ پہچان کے لئے جو بھیجے گئے تھے انھوں نے دھیان دیا، وہ حکومت و سیاست کے حقوق میں کچھ دن الجھے رہے ان سے نجات ملی تو اب پیٹ اور روٹی کا جھگڑا ہے" (حیات گیلانی ص۲۰۸)

یعنی جو کام علماء کے کرنے کا تھا، اس سے وہ غافل رہے اور اپنا فرض منصبی ادا نہیں کیا، اگر وہ اپنا منصبی فریضہ ادا کرتے تو اس ملک میں اتنے لوگ اسلام سے محروم نہ رہتے، اور وہ مسلمانوں کے دشمن نہیں بنتے، یہ سب اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں کا نتیجہ ہے، کاش اب بھی یہ جاگ جاتے، تو بہت کام ہو سکتا ہے، اور دین کا پیغام غیرمسلموں میں پہنچ کر ان کو راہ راست پر لا سکتا ہے ۔

ضرورتمندوں کی حاجت روائی

ضرورت مندوں کی مدد کرنے سے دریغ نہیں کرتے اور قرض جو مانگتا، اس کو بھی محروم نہیں کرتے تھے، ان کی حیات میں لکھا ہے:-

"مولانا گیلانی کی ایک عمدہ عادت یہ تھی کہ ضرورت مند جب کچھ مانگتا تو حتی الوسع اسے مایوس نہیں کرتے، جو کچھ ہوتا ضرور دیتے... حد یہ ہے جب خود اپنے پاس رقم نہیں ہوتی اور ضرورت مند کہتا کہ فلاں سے لے کر دید یجئے تو مولانا ایسا بھی کرتے کہ خود قرض لے کر دوسروں کو قرض کے نام پر دیتے اور لینے والے

سے طلب کرتے ہوئے شرم محسوس کرتے، اگر خود دے گیا تو بہتر ورنہ خود برداشت کرتے " (حیات گیلانی ص۲۸۸)

یہ آپ کے خلق و مروت کا حال تھا اور ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کا جذبہ تھا، دراصل یہ انسانیت کا تقاضا ہے کہ آدمی دوسرے مسلمان بھائیوں کی ہمدردی اور محبت سے سرشار ہو، اور اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت جانے، مگر یہ لینے والے کا فریضہ ہے کہ جو قرض لے وہ وقت پر واپس کر دے، ہمارے حلقہ میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو لینا جانتے ہیں دینے کا نام نہیں لیتے، بلکہ ان سے مانگا جائے کہ قرض واپس کرو تو وہ برا مانتے ہیں اور ادائیگی کا ارادہ ہی نہیں کرتے، وہ یہ نہیں سوچتے کہ وہ اپنی اس حرکت سے کتنے ضرورت مندوں کی ضرورت پورا نہ کرنے پر ایک آہنی دیوار بنا رہے ہیں، جب ایک دفعہ ایسا ہوتا ہے تو اس تجربہ کے بعد دوسرے ضرورت مند کو بھی دینے کی کوئی ہمت نہیں کرتا ہے۔

چنانچہ مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ نے لکھا ہے :۔

"میرے علم میں ہے کہ مولانا نے کسی کو ہزار پانچ سو کی رقم اپنی ضمانت پر کسی سے دلا دی، مگر لینے والے نے ادا نہیں کیا، بالآخر مولانا کو جیب خاص سے ادا کرنا پڑا" (ایضاً)

تواضع اور سادگی

مولانا گیلانی صدر شعبہ دینیات تھے، مال و منال میں کسی سے نیچے نہیں تھے، مگر زندگی بھر متواضع رہے، لکھا ہے :۔

"طالب علمی سے جامعہ عثمانیہ کی صدارت شعبہ دینیات تک پہنچے مگر سکنت میں ذرہ برابر فرق کسی دیکھنے والے نے نہیں دیکھا، بنگلہ میں رہ کر اور موٹر میں چل کر بھی وہ دیوبند کے حجرہ میں رہنے والے اور اس کی گلیوں میں چلنے

والے مسکین طالب العلم ہی معلوم ہوتے تھے۔" (حیات گیلانی ص۲۸۵)

یعنی کبر وغرور چھو نہیں گیا تھا، اور نہ اپنی عالمانہ شان میں کبھی فرق آنے دیا، ایک عالم دین کو جیسا رہنا چاہیئے ویسے ہی رہے، لباس اور وضع قطع میں تبدیلی نہیں ہونے دی۔ یوں رہن سہن کے اعتبار سے ایک بارعب، وجیہ وشکیل ایک عالم ربانی نظر آتے تھے، لباس عمدہ اور صاف ستھرے ہوتے تھے، بہت سارے انگریزی لباس والے شاگردوں کو آپ کی سادگی نے مسلمان بنادیا۔

بے نفسی کا عالم

مولانا کے ایک شاگرد کا بیان ہے :۔

"مولانا گیلانی کے فضائل اخلاق میں بے نفسی کو سب سے نمایاں مقام حاصل تھا۔ دوسروں کی غلطی پر خود معافی خواہ ہو جانا، کوئی کچھ کہنا چاہے تو خود بڑھ کر اس سے قریب ہو جانا۔ اپنے تسامح کے علم ہو جانے پر علی الاعلان سراپا معذرت بن جانا۔ اپنے دامن کو ہمیشہ طبقاتی، ادارتی تعصب سے پاک وصاف رکھنا، اور راہ حق میں تحسین وملامت کی قطعاً پرواہ نہ کرنا مولانا کا شعار تھا۔" (ایضاً ص۲۸۹)

سچ پوچھیئے تو ایک عالم کی شان یہی ہونی چاہیے، جو مولانا میں پائی جاتی تھی، دوسرے علماء کو اس سے سبق لینا چاہیئے اور عملاً اس کی امت کو تعلیم دینی چاہیئے، تاکہ دنیا کو معلوم ہو کہ اسلام کیسے انسان تیار کرتا ہے اور انسانیت کس چیز کا نام ہے۔ اخلاق ومروت کسے کہتے ہیں، مسلمان دراصل نمونہ ہے، اس کی کھلی مثال مسلمانوں کو ہونا چاہیئے۔ اعمال میں بھی اور اخلاق میں بھی۔

☆ ☆ ☆

اوصاف عالیہ

بعض کے ساتھ یہ اوصاف بھی تھے کہ :-

"جب تک دوسرے کو آگے نہیں کرتے اس وقت تک خود آگے نہیں ہوتے تھے، اپنے معاصرین کی مدح و ستائش جی بھر کر کرتے تھے، ہر اہلِ علم کے قدر داں تھے، غلو اور اظہار برتری مزاج میں قطعاً نہیں تھا، اپنے پرایوں کا دھیان بہت تھا، سبھوں کو اچھے حال میں دیکھنا چاہتے تھے"۔
(حیات گیلانی ص۲۸۹)

افسوس ہے کہ مسلمان اس زمانہ میں ان اوصاف عالیہ سے خالی ہوتے جا رہے ہیں، اور غیر قوموں کے مزاج میں ڈھلتے جا رہے ہیں، دوسروں کو بدلنے کے بجائے خود بدلنا شروع کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے عالموں کی وقعت گھٹتی جا رہی ہے، ابھی تو کچھ پرانے علماء زندہ ہیں، اور ان کے دم قدم سے پرانی روایات قائم ہیں مگر یہ سب چراغ سحری ہیں ضرورت ہے کہ نوجوان علماء اپنے کو مکارم اخلاق اور اوصاف حمیدہ سے مزین کریں اور امت کے لئے نمونۂ عمل بن کر سامنے آئیں ۔

مولانا کی طرزِ رہائش

مولانا گیلانی صدر شعبہ دینیات تھے اور جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں تھے اچھی تنخواہ پاتے تھے، گھر پر بھی اچھی خاصی جائیداد تھی، موٹر بھی رکھتے تھے، مگر آپ کی سادگی اپنی جگہ تھی اس میں کبھی فرق نہیں آیا، صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے ان کی سادگی کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ جب وہ اعظم گڑھ آتے دارالمصنفین کے ایک رکن کی حیثیت سے، لکھتے ہیں :-

"جب ہم لوگ ان حضرات کی پیشوائی کے لئے اسٹیشن گئے، تو مولانا کی سادگی دیکھ کر دنگ رہ گئے، ان کے ساتھ صرف ایک دری، ایک چادر،

ایک تکیہ، المونیم کا ایک لوٹا، اور ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے ایک، دو جوڑے تھے۔" (حیات گیلانی ص۲۹۰)

یہ سادگی اب کہاں دیکھنے میں آئے گی، پُرانے علماء کی یہ شان بے نیازی ان کے ساتھ گئی، اب یہ فیشن کا زمانہ ہے جب تک سفر میں بستر بند، اٹیچی اور دوسرے سامان نہ ہوں تو سفر کرنا ممکن نہیں، بلا مبالغہ آج سفر میں علماء بھی کافی سامان لے کر چلنے لگے ہیں، اور یہ شاید زمانہ کی مجبوری ہے، سادہ مولوی کو کوئی گھاس ڈالنے کے لئے تیار نہیں مگر بہر حال عالمانہ سادگی بھی ضروری ہے، بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ کا بھی سادگی میں یہی حال تھا جو اوپر نقل کیا گیا، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

امت کیلئے شفقت و محبت

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی ملت سے بے انتہا محبت تھی، مولانا کے شاگرد غلام محمد نے لکھا ہے:-

"مولانا کے قلب اطہر میں امت محمدیہ اور اس پر شفقت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، وہ مسلمانوں کی فلاح سے ایسے مسرور ہوتے تھے، جیسے خود ان کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچ گیا ہو، ان کے جذبہ شفقت کا اثر تھا کہ وہ زبانی بھی اور تحریراً بھی اس بات پر زور دیتے تھے کہ موجودہ حالات میں علماء کرام کو عام مسلمانوں کے لئے سہولت کا پہلو اختیار کرنا چاہیئے۔" (ایضاً)

یہ جذبہ دینی امت مسلمہ کے ساتھ ان کی دینداری کا تقاضا تھا تاکہ دین پر عمل ہر شخص بآسانی کر سکے اور دین سے اس کا رشتہ کبھی بھی کمزور نہ ہونے پائے اور مسلمان محسوس کریں کہ دین آسان ہے، اور خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام سے فرمایا کرتے تھے کہ آسانی کا حکم دینا، کٹھنائیوں میں

مسلمانوں کو نہ ڈالنا تاکہ اسلام لانے والے پوری رغبت سے اسلام قبول کریں اور پاک وصاف زندگی گذاریں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل

ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد جو مظالم و مصائب کے پہاڑ ٹوٹے، ان سے دل گیر تو ضرور تھے مگر فرماتے تھے :-

"میں ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل روشن پاتا ہوں، پاکستان کے مسلمان کیا ہو جائیں گے اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں پر نئے ماحول کا جو ردعمل ہوگا وہ نظر میں امید افزا ہے، ان میں مذہبی احساسات اور ملی جذبات کی بنا پر غیر شعوری طور سے پوری قوت مدافعت موجود ہے، جو ہر زمانہ میں برقرار رہے گی" (حیات گیلانی ص۲۹۳)

الحمدللہ آزاد ہندوستان میں دیکھا گیا، دین کا جذبہ سب کچھ کے باوجود بھرپور رہا، اور کبھی انھوں نے دین کا دامن چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا، اور نہ کبھی مایوس ہوئے، سب کچھ کی بربادی برداشت کر لی مگر دین کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا، اور جہاں گئے اور جہاں رہے پوری مسلمانیت کے ساتھ رہے۔

عالمانہ خودداری

خودداری اور عالمانہ شان کی ہر موقع پر حفاظت کی، اسے کبھی رسوائی کا موقع نہیں دیا، خود لکھا ہے :-

"حضور نظام سے ملازمت کی تیس سالہ مدت میں کبھی خصوصی ملاقات کا موقع پیدا نہیں کیا گیا، البتہ سالگرہ وغیرہ پر بعض خاص جشن کے دنوں میں دوسرے نوکروں کے ساتھ پیش کشی نذر کے لئے حاضری ہو جاتی تھی" (ایضاً ص۲۹۵)

ہمارے اس دور میں نوجوان علماء میں یہ کمی آتی جارہی ہے کہ وہ معمولی نفع کے لئے اپنی عالمانہ خودداری سے دست بردار ہونے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، اور درباداری کا نشہ ان میں معمولی نفع کے لئے پیدا ہونے لگتا ہے، اس سے پرہیز رکھنا ہم مولویوں کا دینی وعلمی فریضہ ہے۔

مختصر حالات زندگی

اپنی ننھیال استھانواں ضلع پٹنہ میں ۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے وطن گیلانی ضلع پٹنہ میں اپنے چچا سید ابوالنصرؒ سے حاصل کی، ۱۳۲۴ھ میں آپ کو مزید تعلیم کے لئے ٹونک حضرت مولانا برکات احمد مرحوم کی خدمت میں بھیجدیا گیا، جہاں سات سال تک آپ نے معقولات کی کتابیں پڑھیں۔ اور نمایاں مقام حاصل کیا، ۱۳۳۱ھ میں آکر دارالعلوم کے دورۂ حدیث میں داخل ہوئے۔ اور ۱۳۳۲ھ میں فراغت حاصل کی۔

شیخ الہندؒ کی خصوصی توجہ اور تصرف سے معقولات سے ہٹ کر آپ کی توجہ حدیث وتفسیر پر ہوئی۔ فراغت کے بعد چند سال معاون مدیر کی حیثیت سے رسالہ "القاسم" اور "الرشید"، میں کام کرتے رہے، پھر آپ ۱۹۲۰ء میں حیدرآباد جامعہ عثمانیہ میں استاذ ہو گئے، اور پوری زندگی وہیں گذار دی، جب ۱۹۴۹ء میں وہاں ریٹائر ہوئے تو وطن گیلانی آکر مقیم ہو گئے، اور یہیں ۲۵ شوال ۱۳۷۵ھ کو انتقال فرمایا۔

متعدد کتابیں آپ کے قلم کی رہین منت ہیں، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت دو حصہ، تدوین حدیث، تدوین قرآن، ہزار سال پہلے، النبی الخاتم، الدین القیم، مقالات احسانی، سوانح قاسمی تین جلدیں، اور دوسری متعدد کتابیں آپ نے تصنیف فرمائیں، اسفار اربعہ کا ترجمہ کیا، مفصل حالات کے لئے دیکھئے "حیات مولانا گیلانی"۔ (مشاہیر علماء دارالعلوم دیوبند ص ۸۲، ۸۳)

تاریخی حقائق

امیر شریعت

حضرت مولانا رحمانیؒ کی زندگی کے بعض گوشے

" نقیب " کا امیر شریعت رابع نمبر پڑھتے وقت کہیں کہیں نشان لگاتا گیا، یہ حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی پر مختلف علمار کرام کے مضامین کا گراں قدر مجموعہ ہے، ہر اہل علم کے پڑھنے کے لائق ہے، ابھی انہی نشان زدہ حصوں میں سے کچھ معمولی حصہ نذرِ ناظرین ہے ———— (ظفیر صدیقی)

بے نفسی و تواضع

امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی ایک متواضع اور بے نفس آدمی تھے، مولانا علی میاں مدظلہ نے لکھا ہے :-

" ایک مرتبہ دہلی کے قیام میں اپنی قیام گاہ سے ہم دونوں راجیو جی وزیر اعظم سے ملنے کو نکلے، راقم کے ہاتھ میں کچھ فائلوں اور کاغذات کا ایک بنڈل تھا، مولانا نے بے تکلف اس کو میرے ہاتھ سے اس طرح لے لیا گویا وہ ایک رفیق ہیں اور میں اصل نمائندہ اور وفد کا رہنما ہوں، مولانا مجھ سے عمر اور علم و فضل میں بڑے ہی تھے، پھر ان کی نسبت پدری میرے لئے ہر طرح قابلِ احترام تھی " (امیر شریعت نمبر ص۱۳)

اسے کہتے ہیں علمار کی بے نفسی اور تواضع، چونکہ مولانا علی میاں کو بورڈ کا صدر بنا رکھا تھا، اس لئے یہ مناسب معلوم نہ ہوا کہ فائل صدر کے ہاتھ میں ہو اور جنرل سکریٹری خالی ہاتھ، اب یہ تواضع اور بے نفسی دیکھنے میں کہاں آتی ہے۔

احساسِ ذمہ داری

مولانا علی میاں دامت برکاتہم نے ہی لکھا ہے :-

"مولانا منت اللہ صاحب رحمانی کا احساس ذمہ داری ملت کے ساتھ ربط و تعلق اور اس کے مصائب و ابتلاءات پر دلگیر و فکرمند ہونا صرف مسلم پرسنل لا کی تحریک ہی میں محدود نہ تھا بلکہ وہ فرقہ وارانہ فسادات مسلمانوں کی نسل کشی اور مساجد کے انہدام وغیرہ کے واقعات پر بھی ایسے ہی فکرمند ہو جاتے تھے اور ان کے سلسلہ میں کوئی سعی و کوشش نہیں اٹھا رکھتے تھے" (امیر شریعت نمبر ص۱۴۲)

مولانا مدظلہ نے بالکل صحیح لکھا ہے، مولانا رحمانی آزادی کے بعد مسلمانوں کے حالات پر دن رات نظر رکھتے تھے، اور ہر مصیبت میں ان کی مدد کے لئے نکل پڑتے تھے، نہ حکومت کا خوف ان کو روکتا تھا اور نہ اپنی کمزوری و ناتوانی حکمرانوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتے تھے چونکہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایک سپہ سالار رہ چکے تھے، اس لئے وہ یہ اپنا حق سمجھتے تھے۔

بھاگل پور کا فساد اور مولانا

خود مولانا ندوی نے لکھا ہے :-

"نومبر ۱۹۸۹ء میں بھاگلپور میں ایک سفاکانہ اور انسانیت سوز فساد ہوا، مولانا

نے اس سلسلہ میں جو کچھ ممکن تھا کیا، انھوں نے بڑا دردانگیز موثر خط تحریر فرمایا، جس میں انھوں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا"

(امیر شریعت نمبر ص۱۲۵)

اس زمانہ میں مولانا رحمانی مونگیر سے آکر امارت شرعیہ کے دفتر پٹنہ میں بیٹھ گئے اور تمام حکمراں طبقہ سے رابطہ قائم کیا، صوبائی حکمرانوں سے بھی اور مرکزی حکمرانوں سے بھی کہ بھاگل پور میں یہ کیا ہو رہا ہے، آپ کو سن کر حیرت ہوگی مسلسل چالیس دنوں تک پٹنہ میں بیٹھے رہے، اور ٹیلیفون سے ذمہ داروں کو جھنجھوڑتے رہے، دوسری طرف امارت شرعیہ سے مظلوموں کے لئے ریلیف بھیجتے رہے، اور پھر خود اس دور میں بھاگلپور کا دورہ کیا، اور مسلمانوں کو ڈھارس بندھائی، اتنا جری، بہادر اور نڈر مسلم رہنما اس زمانہ میں نظر نہیں آتا ہے۔

مولانا ندوی نے بجا لکھا ہے کہ نہ صرف بورڈ جیسا فعال اور ضروری ادارہ اپنے بانی ومحرک و روح رواں شخصیت سے محروم ہوگیا، بلکہ ہندوستان کی دینی، ملی و فکری قیادت میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا جس کا پُر ہونا مشکل ہے۔

طلبہ میں تحریر و تقریر کیلئے انجمن کا قیام

حضرت امیر شریعت نے اپنی طالب علمی کے اخیر چار سال دارالعلوم دیوبند میں گذارے، جس نے لکھا ہے درست لکھا ہے کہ:۔

"معلوم ہوا کہ بہاری طلبہ کی انجمن اصلاح البیان اپنے زمانہ طالب علمی میں انھوں (مولانا رحمانی) نے ہی قائم کی تھی، جو درمیان میں انتظامیہ کی طرف سے ممنوع قرار پائی اور یہی انجمن بعد میں ہندوستان کے بطل جلیل مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نوراللہ مرقدہ کے نام پر سجاد لائبریری کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، جو بہاری طلبہ کے لئے تحریر و تقریر اور مطالعہ و مذاکرہ کا مرکز قرار پائی"۔ (ایضاً ص۱۲۱)

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی ایک مردم ساز شخصیت کے مالک تھے، اللہ تعالیٰ نے ذہن رسا عطا کیا تھا، وہ دوسروں کو اجاگر کرنے اور بنانے میں اپنی آپ مثال تھے، بہت سارے افراد کو انھوں نے بنایا اور سنوارا، بیسیوں علماء نے جامعہ رحمانی میں رہ کر مولانا کی تربیت سے ملک کے مشہور ترین علماء میں نام پیدا کیا، یہ الگ بات ہے کہ بعض نمک خوار ہوئے اور کچھ نے احسان فراموشی کی مگر ان کو بھی اس کا اقرار ہے کہ وہ بنے حضرت امیر شریعت ہی کی توجہ سے ۔

ملت اسلامیہ کے پشتیبان

یہ صحیح ہے کہ حضرت مولانا رحمانی ملت اسلامیہ کے پشتیبان تھے :۔

" ملت کی خدمت اور کتاب وسنت کی اشاعت آپ کا خاص وظیفہ تھا، دن رات ملت کے لئے بے چین رہا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے دوراندیشی، دور بینی کا ملکہ راسخہ عطا کر رکھا تھا، جو قدم اٹھاتے بڑا مضبوط ہوتا، اور جو کچھ فرماتے اس میں قوت ہوتی، بڑی سے بڑی دھمکی سنتے اور سخت سے سخت مخالفت دیکھتے، مگر آپ پر قطعاً اس کا اثر نہیں ہوتا، آپ کا بھروسہ رب ذوالجلال پر تھا" (امیر شریعت نمبر ص۴۴)

اور یہ طے ہے کہ جب کوئی بھی مسلمان اللہ تعالیٰ پر کلی اعتماد کر لیتا ہے وہ کبھی نصرت خداوندی سے محروم نہیں رہتا ہے، غیب سے اس کی مدد ہوتی ہے، اور زندگی کے ہر مرحلے میں وہ کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوتا ہے — افسوس یہ ہے آج مسلمانوں میں اعتماد علی اللہ کی بڑی کمی ہوگئی ہے، اللہ تعالیٰ سے زیادہ آدمیوں پر اعتماد کیا جانے لگا ہے ۔

جنگ آزادی میں حصہ

مولانا مرحوم جنگ آزادی میں اپنی نوجوانی میں بہت چست رہا کرتے تھے،

اور ساتھیوں کی قیادت فرماتے تھے، لکھا ہے :-

"۱۹۳۲ء میں حضرت مدنی ایک موقع سے ڈکٹیٹر بنائے گئے، آپ ایک جماعت لے کر دہلی روانہ ہوئے، حکومت نے راستہ میں آپ کو گرفتار کر لیا، جو طلبہ ساتھ جارہے تھے وہ دہلی پہنچے، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی اس جماعت کی قیادت فرمارہے تھے، چاندنی چوک میں جب یہ جلوس پہنچا پولیس نے اس پر لاٹھی چارج کیا، جس میں بہت سارے طلبہ زخمی ہوئے خود مولانا رحمانی بھی زخمی ہوئے، دفتر پہنچنے سے پہلے یہ پورا قافلہ گرفتار کر لیا گیا" (امیر شریعت نمبر ص۲۶)

مگر اس کے بعد بھی یہ خوف زدہ نہیں ہوئے بلکہ جرأت و ہمت میں اور اضافہ ہو گیا، حکومت برطانیہ کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، ملک کی آزادی کے لئے ساری قربانی دینے پر آمادہ رہے، چنانچہ اس کے بعد سہارنپور میں طلبہ کی قیادت کرتے ہوئے گرفتار ہوئے اور چھ ماہ جیل کی زندگی گذاری، کافی اذیت و تکلیف اٹھانی پڑی، مگر کبھی قدم پیچھے نہیں رکھا، بلکہ آگے ہی بڑھتے رہے اور بالآخر اگست ۱۹۴۷ء میں ملک کو آزاد کرا کے رہے -

سہارنپور جیل میں بلند فکری

جس زمانہ میں سہارنپور جیل میں تھے، جب معلوم ہوا کہ حضرت مولانا مونگیریؒ کے صاحبزادے ہیں تو :-

"جیلر صاحب نے عرض کیا اتنی رعایت ہو سکتی ہے کہ میں اپنے گھر سے ان کے لئے روزانہ کھانے بھجوا دیا کروں" (ایضاً ص۲۷)

مگر مولانا رحمانی نے جواب میں فرمایا :-

"مجھے جناب کی یہ رعایت نہیں چاہئے، کیونکہ میں تنہا نہیں ہوں، میرے ساتھ دوسرے بہت سے رضاکار ہیں اور سبھوں کے لئے یہ رعایت

ناممکن ہے، اس لئے صرف اپنے لئے یہ رعایت کیسے قبول کرسکتا ہوں "

(امیر شریعت نمبر ص۔)

اسے کہتے ہیں اپنے ساتھیوں کی رعایت اور ہمدردی، جس حال میں سب ہوں گے وہ بھی اسی حالت میں رہنا پسند کریں گے، چنانچہ جیل کے جیسے تیسے کھانے پر گذارہ کیا، اب یہ ایثار و قربانی کون کرے گا، اب تو یہ خود غرضی کا دور ہے، دوسروں کی فکر کرنا لوگ بے وقوفی جانتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں جو ہمدردی چاہیئے ناپید ہوتی جارہی ہے۔

امارت شرعیہ کی ترقی

مارچ ۱۹۵۷ء میں مولانا مرحوم چوتھے امیر شریعت منتخب ہوئے تو آپ نے امارت شرعیہ اور اس کے کاموں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا لکھا ہے کہ:۔

"مولانا نے امارت شرعیہ کو فعال، متحرک اور مستحکم بنانے میں پوری جدوجہد کی، اس کے نظام کو بہار و اڑیسہ کے گاؤں گاؤں میں پھیلایا، اس کی تنظیم قائم کی، اس کے تمام شعبہ جات کو آگے بڑھایا، جگہ جگہ دارالقضاء قائم ہوئے، مبلغین کا تقرر ہوا، اور ان سے کام لیا" (ایضاً ص۵۵)

پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے امارت شرعیہ کا نظام ایسا پھیلا جس کی کوئی مثال نہیں، پورے ملک میں اس کا کام اور نام پہنچا، سارے مسلمانوں کی اس طرف توجہ ہوئی۔ بیچ قصبہ سے نکال کر دفتر کو لب سڑک لائے، اس کے لئے لمبی چوڑی زمین خریدی، عمارت بنوائی، اور تمام شعبہ جات کو منظم کیا، آج وہ اسلامی حکومت کا اچھا خاصہ نمونہ ہے، وہاں آکر بڑا سے بڑا آدمی مرعوب ہوتا ہے، اور یہی نہیں حضرت مولانا کی ہی تحریک اور مدد سے آسام، کرناٹک اور آندھرا میں امارت شرعیہ قائم ہوئی، مختلف اضلاع میں قاضیوں کا تقرر ہوا، جن سے عورتوں کو سہولتیں حاصل ہوئیں، خود پھلواری شریف میں سجاد ہسپتال

قائم کیا، ٹیکنکل کھولا، اور اس کے لئے لوگوں کا ذہن بنایا۔

ایمرجنسی میں نس بندی کے خلاف جدوجہد

امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کی خدمات نے پورے ملک بلکہ غیر ممالک میں اسے شہرت بخشی اور یہ حقیقت ہے کہ حضرت مولانا نے اس سلسلہ میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے، اور لوگوں نے اس کی پیروی کی :-

"ایمرجنسی کے زمانہ میں جب منصوبہ بندی پر حکومت مصر تھی اور نسبندی کا پورے ملک میں زور تھا، مسلمان سہمے ہوئے تھے، بالخصوص مسلمانوں کی نسبندی لازم قرار دیدی گئی تھی، لوگوں کو بسوں اور گاڑیوں سے پکڑ پکڑ کر نسبندی کی جارہی تھی پورا ملک اس سلسلہ میں مظالم سے پریشان تھا مولانا رحمۃ اللہ علیہ پہاڑ کی سی مضبوطی سے اس کی مخالفت پر جم گئے، اور اس وقت تنہا آپ کی شخصیت تھی جو منصوبہ بندی کے خلاف انگریزی، ہندی، اردو، اور مختلف زبانوں میں کتابچے شائع کر رہی تھی، اور یہ سب کچھ قانونی دائرے میں کر رہے تھے" (امیر شریعت نمبر ۔۔)

بہت سارے مشہور اہل قلم خوف سے حکومت کا ساتھ دے رہے تھے یا خاموش تھے، مولانا اس زمانہ میں سرگرم عمل تھے، تن تنہا اس کا مقابلہ کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے بڑی جرأت و ہمت عطا کر رکھی تھی، دینی اور ایمانی حرارت سے سرشار تھے، ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ دوسروں کو آپ کے نقش قدم پر چلائے۔

معلمانہ شان

مولانا مرحوم کے سلسلہ میں لکھا ہے :-

"مولانا منت اللہ رحمانی روایتی معلّم نہیں تھے لیکن ان میں معلمانہ شان تھی، اور ایسی تھی کہ ہمیشہ لوگ ان کی مجلس سے کچھ سیکھ کر ہی اٹھتے، وہ کوئی سیاسی عہدہ دار یا وزیر نہیں تھے لیکن چہرہ پر رعب وجلال ایسا تھا کہ ہر کسی کو بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، وہ کوئی جج یا وکیل نہیں تھے لیکن خدا نے انھیں بحث وجرح کی ایسی صلاحیت بخشی تھی اور حجت واستدلال کا ایسا ملکہ عطا کیا تھا، کہ ان کی کاٹ کے آگے اچھے اچھوں کے اوسان خطا ہوتے تھے" (امیر شریعت نمبر ص۸۹)

یہ واقعہ ہے کہ مولانا پہلے ہر مسئلہ پر بحث کیا کرتے تھے، اس کے ہر پہلو کو اجاگر کرتے تھے، پھر ان کو تسلیم کرتے تھے، جب کوئی نیا مسئلہ ہوتا تو اپنی مجلس میں تمیز کر سبھوں کی رائے سنتے تھے، سبھوں کو بولنے کا موقع دیا کرتے تھے، مخالف، موافق بیان سننے کے بعد کوئی رائے قائم کرتے تھے، یہ حضرت میں خصوصی اوصاف تھے۔

خدمات کا دائرہ

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ میں صحیح لکھا گیا ہے کہ:-

"مولانا منت اللہ کی خدمات کا دائرہ بے حد پھیلا ہوا تھا، امارت شرعیہ کو انھوں نے اپنے خون جگر سے سینچا، جامعہ رحمانی مونگیر کو انھوں نے پروان چڑھایا دار العلوم دیوبند کی انھوں نے رکن شوریٰ کی حیثیت سے برسوں بے لوث خدمت کی، ندوۃ العلماء لکھنؤ جوان کے والد کا قائم کردہ ادارہ ہے، رکن عاملہ وشوریٰ کی حیثیت سے اس کی رہنمائی کرتے رہے، اور اخیر میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت کا فریضہ ادا کیا، وہ ہندوستان کا سب سے زیادہ موقر ادارہ بن گیا، اور ہندوستان کے مسلمانوں کی آرزوؤں کا سب سے بڑا مرکز، علماء، جدید تعلیم یافتہ طبقہ، مختلف جماعتوں کے سربراہان بھی

اس کی طرف نسبت میں عزت وافتخار محسوس کرنے لگے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی اجتماعیت کا سب سے بڑا اسٹیج بن گیا" (امیر شریعت نمبر ص۹۳)

یہ حقیقت ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں بے پناہ اخلاص تھا اور حد درجہ کاموں کی لگن تھی، صبح سے شام تک کاموں میں منہمک رہا کرتے تھے، اور اپنے ساتھ بہت سارے کارکنوں کو لگائے رکھتے تھے، سیاسی، علمی اور تعلیمی اداروں سے بے پناہ محبت تھی، اور سب کے خیر خواہ تھے، آج کل اسی کی کمی ہوتی جارہی ہے، اب لوگوں میں یکطرفہ ہونے کا رجحان پیدا ہونے لگا ہے، آفاقیت ختم ہوتی جارہی ہے۔

ثابت قدمی

مولانا رحمانی میں پامردی اور ثابت قدمی دیکھنے کی چیز تھی، ایک صاحب نے صحیح لکھا ہے:۔

"میں نے مولانا منت اللہ رحمانی جیسا باحوصلہ اور باعزت انسان نہیں دیکھا، ایمرجنسی کا خوفناک ماحول ہو یا فسادات کی ہلاکت آفرینی ہو یا دارالعلوم کے شوریٰ کے اجلاس کے دوران لاٹھیوں کی بارش، مولانا کے چہرے پر خوف و ہراس ہم نے نہیں دیکھا، اور کبھی حالات سے گھبراہٹ کے آثار نہ دیکھے، البتہ مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ضرور رہتے تھے" (ایضاً ص۹۲)

اصل میں جس دور میں مولانا کی تعلیم و تربیت ہوئی وہ انگریزی حکومت کا زمانہ تھا، بظاہر حکومت نے ہر طرف سے پابندی لگا رکھی تھی، مگر مسلمانوں کا ذہن اور دماغ کھل کر کام کررہا تھا، خوف و ہراس مٹ چکا تھا اور مسلمانوں میں زندگی کے آثار تھے، مولانا ایک بڑی بافیض خانقاہ کے مالک اور مربی تھے، جہاں روزانہ سیکڑوں فریادی آتے تھے اور مولانا سبھوں کی فریاد رسی کیا

کرتے تھے، بڑی کشمکش کا دور دیکھا تھا، اور بہت ساری تحریکیں چلائی تھیں، اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے تھے، آزادی ملک کے بعد جو بھی میدان میں رہا، وہ بڑی آزمائشوں سے گذرا، مولانا کو سب سے زیادہ واسطہ پڑا، اور تمام حالات کا مقابلہ کیا، اور پوری اولوالعزمی سے مقابلہ کیا، ضرورت ہے کہ نوجوان علماء اپنے اندر انہی اوصاف جمیلہ کو پیدا کرنے کی سعی کریں، اور باطل کے مقابلہ میں کبھی سرنگوں ہونے کو نہ سوچیں ۔

مسلمانوں سے خطاب

اگست ۱۹۶۷ء میں بہار میں رانچی کے اندر فساد برپا کیا گیا اور فرقہ پرستوں نے بیدریغ فوج اور پولیس کے تعاون سے مسلمانوں کو شہید کیا، اور ان کو لوٹا گیا، امیر شریعت کافی متاثر ہوئے، خود دورہ کیا اور حکومت کے خلاف سخت بیان جاری کیا، مگر اسی کے ساتھ مسلمانوں کو مخاطب کرکے فرمایا :-

"مجھے دوسری بات مسلمانوں سے کہنی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان واقعات نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی حفاظت آپ کرنی ہے اور اللہ پر اعتماد ان کی سب سے بڑی طاقت ہے، اپنے جان و مال کی حفاظت ہمارا اخلاقی اور قانونی حق ہے، اس لئے ہمیں ہر لمحہ ہر خطرہ کا دفاع مضبوط کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے، فسادات رکنے کی اب صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ کہ حملہ کرنے والے خود اپنے لئے خطرہ محسوس کرنے لگیں ... ہمیں اسی سرزمین پر رہنا اور یہیں جینا اور یہیں مرنا ہے، بس ہمیں ممکن وسائل کے ساتھ کھڑا ہونا ہے، اپنے دین پر قائم رہنا ہے"

(ایضاً ص ۱۹۳)

مولانا کے اس طرح کے بیان سے مسلمانوں میں جان پیدا ہوئی اور فسادیوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت آئی، اور پھر بتدریج خوف و ہراس دور ہوا، اور یہ

اپنے دفاع میں پورے طور پر تیار ہو گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فسادیوں کی ہمت نے جواب دیا اور وہ آگے آنے میں گھبرانے لگے، بہار میں ہر جگہ مسلمانوں نے اپنا دفاع کیا، اور فسادیوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔

حکومت سے شکوہ

مولانا نے اپنے بیان میں برملا کہا :۔

"مجھے حکومت سے یہ کہنا ہے کہ پورے ملک میں ہونے والے فسادات نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ وہ فسادات اور یکطرفہ قاتلانہ حملوں کی روک تھام میں ناکام ہو چکی ہے، اس کی مشنری امن قائم نہیں کرتی بلکہ فسادات کی آگ کو ہوا دیتی ہے، پولیس نے ان واقعات میں ظلم کو ڈھونے والی گاڑی کے انجن کا کردار ادا کیا ہے اور ان کے ذریعہ مظلوموں کا نہیں بلوائیوں اور حملہ آوروں کا تحفظ کیا ہے" (امیر شریعت نمبر ص۱۹۲)

اپنے چھوٹوں کو بڑھانے کا حوصلہ

مولانا علاء الدین مرحوم جو پندرہ سال تک جامعہ کے مدرس عربی رہے ان کا بیان ہے :۔

"حضرت کے قدموں میں رہنے کے دوران تقریباً ہر روز اس کا مشاہدہ ہوتا کہ آپ اپنے چھوٹوں کو آگے بڑھانے، انھیں باصلاحیت بنانے، اور ان کی رہنمائی کے لئے کس طرح کوشاں رہتے، اور کس کس طریقہ سے انھیں سمجھاتے۔ سمجھانے کا انداز ایسا ہوتا کہ نہ مخاطب کو بار گذرتا اور نہ وہ اس میں اپنی سبکی محسوس کرتا" (ایضاً ص۲۵)

اب یہ خوبیاں بڑوں سے رخصت ہوتی جا رہی ہیں، ان میں چھوٹوں کو بڑھانے کا حوصلہ ختم ہوتا جا رہا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ذی علم علماء کا قحط ہوتا جا رہا ہے۔ یہ

آپس کی لڑائیوں میں اپنی توانائیاں برباد کرتے رہتے ہیں، حضرت مولانا اس کے خلاف تھے، ایک دفعہ اخبار کے ذریعہ مضمون میں آپ پر حملہ کیا گیا تو جواب کی لوگوں نے پوری تیاری کرلی، مگر آپ نے روک دیا اور آخر میں فرمایا ۔

کام میں لگنا چاہیئے

"دیکھئے ان لوگوں کے پاس کوئی کام نہیں ہے، نہ خود یہ کچھ کرنا چاہتے ہیں، اور نہ یہ پسند کرتے ہیں کہ دوسرا اچھے کاموں میں مشغول رہے، صبر کیجئے تھوڑے دنوں بعد وہ خود خاموش ہو جائیں گے" (امیر شریعت نمبر ص۲۵۷)

یہ واقعہ ہے کہ جس کو کام کرنا ہے وہ ان لغویات کو ہرگز پسند نہیں کرتا ہے، اپنے کاموں سے ان کو چھٹی نہیں ہوتی کہ اخباری بیان بازی میں لگے، یہی ہم سب کا طریقہ ہونا چاہیئے۔ تبھی علمی عملی ترقی ہو سکتی ہے، جذبہ انتقام سے اپنے دلوں کو پاک رکھنا چاہیئے، اور عفو و درگذر کا جذبہ زیادہ سے زیادہ رکھنا چاہیئے ۔

دوسروں کی خبرگیری

حضرت مولانا میں جہاں دوسرے محاسن تھے وہاں بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنے ماتحتوں اور کارکنان کی ضرورت پر نظر رکھتے تھے۔ مولانا علاء الدین مرحوم ہی نے لکھا ہے :۔

"چیزیں خواہ وہ کسی قیمت کی ہوں تقسیم کرنا ایک عادت بن گئی تھی، معمولی اور دو چار روپے قیمت کی چیزیں نہیں، بلکہ سیکڑوں روپے کی قیمتی چیزیں بھی کسی کو عطا کرنے میں تامل کرتے نہیں دیکھا، اگر کسی نے اس طرح کی کسی چیز کی درخواست کی جو موجود نہ ہوتی بلا تامل بازار سے منگوا کر نہایت خاموشی اور رازداری کے ساتھ ان کے پاس بھجوا دیتے یا تنہائی میں بلوا کر پیش فرما دیتے" (ایضاً ص۲۵۹)

داد و دہش بھی مزاج میں داخل تھی ،ضرورت مندوں کی ضرورت کا پورا اور برابر خیال رکھا کرتے تھے ، لکھا ہے کہ "ایک مرتبہ کوئی استاذ بوسیدہ پھٹا ہوا کرتا پہن کر آئے ، مولانا نے اپنے پاس بلایا اور پھٹی جگہ ہاتھ رکھ کر فرمایا یہ کیا ، اور اس کو خود زیادہ پھاڑ دیا ، لوگ سارے ہنس پڑے ، دوسرے ہی دن چار نئے کرتے بنوا کر ان کی خدمت میں بھیج دیا "

سردیوں میں لوگوں کی دیکھ بھال

مولانا علاء الدین ہی نے لکھا ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ :۔

"سردیوں میں اپنے طور پر معلومات کرتے اور ضرورت مندوں کو چادریں، کمبل لحاف، سوئٹر اور شروانیوں وغیرہ سے نوازتے .... ایک چیز اپنے استعمال میں ہوتی خواہ وہ ہزار کی ہو، اگر اس کی جگہ دوسری چیز آجاتی تو ہم لوگوں کی طرح اس پہلی چیز کو احتیاط کے ساتھ محفوظ نہ فرماتے، بلکہ کسی ضرورت مند کو عطا کر دیتے " (امیر شریعت نمبر ص ــــــ)

عام طور پر مولویوں میں یہ خوبیاں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں ، مگر مولانا میں اللہ تعالیٰ نے بڑی فیاضی کا جذبہ دے رکھا تھا ، اور یہی وجہ ہے کہ کبھی آپ کو کسی چیز کی کمی نہیں ہوئی ، زندگی بھر آسودہ حال رہے اور دوسروں کی مدد کرتے رہے ۔

سوئی صلاحیت کو بیدار کرنا

مولانا محمد زبیر صاحب بھی جامعہ رحمانی میں عرصہ تک مدرس رہ چکے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ایک دن آپ نے فرمایا کہ بین الملی شادیوں کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے ، اس پر ایک تحریر مرتب کر کے لے آئیں ، ان کی زبان سے نکلا کہ تقریر و تحریر کے فن سے مناسبت نہیں ، یہ سن کر فرمانے لگے :۔

"بس آپ لوگوں کا یہی مزاج سہل پسندانہ سوچنے کا یہی طرز بلکہ ہمت وارادہ کی یہی کمزوری و پستی، ترقی کی راہوں میں رکاوٹ ہے، آپ جب پڑھے لکھے ہیں اور بحمد اللہ اندرونی صلاحیت موجود ہے، تو اسے جلا بخشئے طبیعت و مزاج پر بل ڈالئے اور احساس کمتری کا شکار نہ بنئے، چاہئے آپ کے اسباق کے گھنٹے خالی کر دیئے گئے، اسباق نہ پڑھائیں جو کہا گیا اس کی تعمیل کیجئے اور بعد عصر شام کی چائے پر ملئے" (امیر شریعت نمبر ص۲۷)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے اساتذہ کو بنانے کا یہ طریقہ تھا، خود ان کو اعتراف ہے کہ وہ شام کے وقت مضمون لکھ کر لائے، اور پھر ان کے اندر تقریر و تحریر کا سویا ہوا جذبہ جاگا، اور وہ تقریر بھی کرنے لگے اور لکھنے بھی لگے، اور عمدہ لکھنے لگے، کاش یہی انداز تربیت عام علماء میں پیدا ہو جائے، اور وہ نوجوان میں کام کرنے کی اسپرٹ پیدا کرنے کی جدوجہد کریں، انشاء اللہ پھر حالات بدل جائیں گے اور افراد کی کمی محسوس نہ ہوگی۔

چائے کی مجلس

جامعہ رحمانی کے ایک قدیم استاذ مولانا مرتضیٰ کا بیان ہے:-

"بعد عصر چائے کی مجلس ہوتی، اساتذہ جامعہ تشریف لاتے جو آتا سلام کرتا، اور دوزانو بیٹھ جاتا، ایک وقار و تمکنت، رعب و جلال مجلس پر چھایا رہتا معلوم ہوتا فرشتوں کی مجلس ہے، رعب و جلال کا ایسا مظہر تھا کہ نگاہیں سب کی نیچی ہوتیں، جب مولانا گفتگو فرماتے جو جمال کا منظر سامنے ہوتا، یہ تھوڑی دیر کی مجلس ہوتی لیکن پرمغز اور معلومات افزا، کبھی کسی مسئلہ پر مباحثہ ہوتا، کبھی بزرگوں کے واقعات بیان ہوتے، کبھی تصوف کا عقدہ کھولا جاتا، اور کبھی اسرار ربانی کا بیان ہوتا" (ایضاً ص)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی وقت علم و عمل سے خالی نہ ہوتا، اساتذہ کی

تربیت کا بڑا ہی خوشگوار انداز ہوا کرتا تھا۔

اساتذہ کو نصیحت

حضرت رحمۃ اللہ علیہ بہت سارے مدارس دینیہ کے سربراہ تھے ان کی دیکھ بھال رکھتے تھے، اخیر زندگی میں مدرسہ رحمانیہ سوپول ضلع دربھنگہ جب تشریف لے گئے، تو وہاں کے سینئر استاذ قاضی مولانا محمد قاسم صاحب نے درخواست کی کہ کچھ نصیحت فرمایا جائے، اس پر آپ نے یہ زرین نصائح فرمائے :۔

"آپ حضرات اساتذہ اپنی ذمہ داری محسوس کریں، تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی دھیان دیں، آج تربیت کا فقدان ہے، طلبہ آپ کے پاس امانت ہیں، ان پر محنت کی جائے، ساتھ ہی عامۃ المسلمین کی نگاہیں علماء پر رہتی ہیں، آپ علماء مستحب و سنت کا اہتمام کریں گے تو عام لوگ فرض کی طرف بڑھیں گے۔" (امیر شریعت نمبر ص۳۴۳)

یہ ایسی نصیحتیں ہیں کہ اساتذہ ان کو بار بار پڑھیں اور ان پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس پر دھیان دیں، جب تک ان میں زندگی نہ ہوگی، طلبہ اور عوام میں زندگی کہاں سے آئے گی۔

عوام کو نصیحت

اسی مجلس میں عوام کو خطاب کر کے فرمایا :۔

"دوسرا اہم مسئلہ اس ملک میں مسلمانوں کی باوقار و باعزت زندگی کا ہے اور یہاں کے شعار اسلام کے تحفظ کا ہے، اس وقت پورے ملک میں بابری مسجد اور دوسرے شعائر اسلام کے خلاف جو شر پسندوں کی سورش ہے، اس کے نتیجہ میں زبردست خطرہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے، اور پھر ایک دو

صوبوں کا ہندوستان رہ جائے گا مسلم دشمن عناصر اس وقت مسلمانوں کو خوفزدہ کرنا چاہتے ہیں، اور اسے تبدیل مذہب کی دھمکیاں دے رہے ہیں، جانی مالی اور تعلیمی نقصان پہنچا رہے ہیں، ابھی ملک کے بڑے چھوٹے شہروں میں جو خونی ہنگامہ ہوا ہے وہ سامنے ہے، لہذا آپ لوگ دشمنوں کے حملے سے نہ گھبرائیں، ہمت وحوصلہ سے ان کا مقابلہ کریں، کوئی حملہ آور ہو تو دندان شکن جواب دیں، اپنی جان ومال کی حفاظت ہمارا شرعی و قانونی فریضہ ہے" (امیر شریعت نمبر ص۳۴۴)

یہ انداز تھا امیر شریعت کا، اخیر اخیر وقت تک مسلمانوں کو ہمت دلاتے رہے اور علماء کو ان کے فرائض کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرتے رہے، جہاں گئے خاموش نہیں رہے بلکہ جو ذمہ داری تھی اسے پوری قوت سے ادا کرتے رہے، اور نوجوان علماء کو سبق دیتے رہے کہ اس ملک میں زندگی گذارنے کا ڈھنگ کیا ہونا چاہیئے، کاش ہمارے علماء کرام کا نوجوان طبقہ ان باتوں کو سمجھتا اور ان پر عمل پیرا ہونے کی سعی میں دن رات مصروف رہتا، سچ پوچھئے تو اب نوجوانوں کی صلاحیت پر ہی سب کچھ موقوف ہے، پرانے علماء ایک ایک کرکے اٹھتے جارہے ہیں۔

تدوین قانون اسلامی

راجیوجی سے گفتگو میں کہیں مسلم پرسنل لا کے مجموعہ کا نام آیا، تو حضرت امیر شریعتؒ نے دفعۃً دارتدوین قانون اسلامی کا عزم کرلیا، دارالعلوم دیوبند کے مہتمم صاحب مدظلہٗ کو خط لکھا پھر گفتگو کی کہ آپ محمد ظفیرالدین کو چند مہینے کے لئے دیدیں، تاکہ ان سے تدوین قانون اسلامی کا کام لے سکوں، خود خاکسار کو بھی لکھا کہ یہ صورت آپ قبول کرلیں اور آمادہ ہوکر مونگیر آجائیں، مہتمم صاحب مولانا مرغوب الرحمٰن زید مجدہ کی منظوری لے کر میں مونگیر پہنچا۔

مولانا نے میرے سامنے نقشہ رکھا کہ ھدایہ، عالمگیری اور دوسری فقہی کتابیں سامنے رکھ کر کتاب النکاح، کتاب الطلاق، کتاب الہبہ، کتاب الوقف، کتاب الوصایا اور کتاب الفرائض کو دفعہ وار لکھ کر میرے سامنے پیش کریں میں نے اپنی وسعت بھر محنت سے ان تمام ابواب کو دفعہ وار لکھ کر پیش کیا اس کے حوالے بھی لکھے، اب اساتذہ کی مجلس بنائی جس میں یہ تدوین فقہ دفعہ وار پہلے پڑھی جاتی، بحث ہوتی پھر حضرت امیر شریعت اپنے الفاظ میں اس کو لکھواتے، اس طرح یہ مجموعہ جب تیار ہوگیا، تو اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس سے بڑی مجلس بنائی، دیوبند سے مفتی احمد علی سعید، ندوہ سے مولانا برہان الدین، امارت شرعیہ سے مولانا مجاہد الاسلام، جامعہ رحمانی سے مفتی نعمت اللہ اور مولانا صغیر احمد کو اس مجلس کا رکن خصوصی بنایا، مولانا محمد زبیر صاحب اور مولانا محمد ولی رحمانی کو بھی شریک ہونے کی دعوت دی گئی، اس بڑی مجلس میں اب حضرت مولانا کے الفاظ پڑھے جاتے اور بحث کی جاتی اور کاٹ پیٹ ہوتی مولانا کی طرف سے حصہ لینے کی پوری آزادی تھی دوسرے مفتیان کرام اکثر و بیشتر شریک ہوتے، میرا اندازہ ہے یہ مسودہ کم از کم تین دفعہ پڑھا گیا اور اس میں ترمیم ہوئی، پھر جا کر وہ مرتب ہوا، اخیر میں اس کو پورے ملک میں علماء کرام اور مفتیان کی خدمت میں بھیجا گیا، ان کے پاس وہ سب کاپیاں واپس آئیں ان کو سامنے رکھ کر مفتی نعمت اللہ سے کافی کام لیا گیا، اور مولانا محمد ولی رحمانی نے اپنی نگرانی میں اس کو مکمل کرایا، اب انشاء اللہ یہ کام چھپ کر سامنے آنے والا ہے۔

حضرت مولانا نے اس کے لئے بڑا اہتمام کیا، اس مجموعہ کو ملک کے تمام قابل ذکر علماء کرام اور مفتیان ملت کی خدمت میں رجسٹری سے بھیجا گیا، ڈیڑھ دو سو علماء نے اس پر نظر ثانی کی، مناسب اضافہ کیا، پھر اس کو سامنے رکھ کر مجموعہ میں مناسب ترمیم کی گئی، اس کے ہی متعلق مولانا برہان الدین نے

اپنے مقالہ میں لکھا ہے :-

"حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کے بعض امتیازات سے ان سب سے بڑھ کر مفید اور دور رس نتائج کا حامل ہے مسلم پرسنل لا سے متعلق قوانین شریعت کی دفعہ وار ترتیب ہے، یہ لہٰذا شاید غلط نہ ہوگا کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ کچھ عرصہ پہلے حضرت امیر علیہ الرحمہ کی توجہ اس طرف ہوئی کہ وہ ان کی فکر پر اور ذہنوں کے مقابلہ میں زیادہ حاوی ہو گیا، چنانچہ اس کام کے لئے موصوف نے ہندوستان بھر سے چند ایسے علماء کی ٹیم بنائی جو فقہ کے موضوع پر اپنا کام اور ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔" (امیر شریعت نمبر ص۹)

اللہ تعالیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اس خدمت کو قبول فرمائے، اور وہ مجموعہ قوانین اسلامی چھپ کر سامنے آجائے اور اس کو قبولیت عامہ حاصل ہو۔

جامع کمالات

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر حضرت مولانا علی میاں ندوی نے بہت درست لکھا تھا :-

"مولانا کی شخصیت اپنی ریاست اور ملک ہندوستان ہی میں نہیں اس عہد کے عالم اسلام کی ممتاز ترین شخصیتوں میں تھی اللہ تعالیٰ علم و اخلاص عزم و قوت ارادی، اصابت رائے، توازن و اجتماعیت کی ان کی ذات میں ایسی متعدد خصوصیتیں پیدا فرما دی تھیں، جن کا ایک شخصیت میں بہت مشکل سے اجتماع ہوتا ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایسے متعدد دینی و ملی اور تاریخی کام لئے جن کی نظیر ملنی مشکل ہے۔" (ایضاً ص۹)

حضرت مولانا ندوی نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل بجا ہے، اس میں کوئی مبالغہ نہیں، اپنی جگہ حرف بحرف صحیح ہے۔ امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی اپنے دور میں ملت اسلامیہ کی کشتی کے ناخدا تھے، اور وہ جانتے تھے کہ طوفان

سے کشتی کس طرح نکالی جاتی ہے، بلا کے ذہین تھے، اور سب سے بڑی خوبی اخلاص تھی، اس لیئے ان کے کاموں میں بڑی برکت تھی۔

بابری مسجد پر بورڈ کا فیصلہ

علمار کانپور کی درخواست پر آپ نے ۳/دسمبر ۱۹۹۰ء کو بابری مسجد کے سوال پر مسلم پرسنل لار بورڈ کا ایک خصوصی اجلاس بلایا، پورے ملک کے دانشوروں کو دعوت دی اور ایک زبردست قرارداد منظور کرائی، جس کا خلاصہ یہ تھا:۔

"قرارداد منظور کر کے حکومت سے کہا گیا کہ بابری مسجد کو منتقل کرنے یا کسی کے حوالہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ مسلمانوں کو واپس ملنی چاہیے۔ بورڈ نے مسلمانان ہند کو بھی ایک پیغام دیا جس میں مسلمانوں کو موجودہ نامساعد حالات کا مقابلہ صبر واستقلال کے ساتھ کرنے کا مشورہ دیا" (امیر شریعت نمبر ۴۲)

اپنا اندازہ ہے مولانا مسلمانوں کو آزاد ہندوستان میں جو پیغام دیتے رہے ہیں وہ مسلمانوں کے دل کی آواز تھی، مسلمان کا بچہ بچہ انشاءاللہ اس سے سبق لے گا، اور اپنے مستقبل کو روشن رکھنے کی بھرپور جدوجہد کرے گا۔

مختصر حالات زندگی

۹/جمادی الثانیہ ۱۳۳۲ھ کو مونگیر میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ قطب عالم مولانا محمد علی مونگیری کے چھوٹے صاحبزادے ہیں، ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی، ایک سال حیدر آباد جا کر مفتی عبداللطیف صاحب سے عربی صرف ونحو اور منطق کی کتابیں پڑھیں، پھر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ تشریف لائے۔ اور وہاں چار سال رہے، اس کے بعد ۱۳۴۹ھ میں تکمیل علوم کی غرض سے

دارالعلوم دیوبند آئے، اور ۱۳۵۲ھ میں یہاں سے فراغت حاصل کی، آپ کا شمار شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے ارشد تلامذہ میں ہے۔

۱۳۵۵ھ میں اینڈین پنڈنٹ پارٹی کی طرف سے بہار اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، اور اسمبلی میں وقف کی حمایت میں تقریر کی۔ اور ۱۳۶۱ھ میں آپ کو سجادہ نشیں بنا دیا گیا، آپ نے جامعہ رحمانی کی نشأۃ ثانیہ میں بھرپور حصہ لیا، جہاں اب تک دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے، جامعہ کی عمارت بنوائی۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اہم ممبر رہے، اور یہاں نصاب پر نظر ثانی کا کام کرایا اور درجہ بندی ہوئی، پہلے درجہ بندی نہیں تھی، اسی طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس شوریٰ کے بھی ممبر رہے۔ سلوک کے منازل مولانا محمد عارف صاحبؒ کے زیر سایہ طے کئے، جو آپ کے والد محترم کے خلیفہ تھے۔ آپ کو انہیں سے خلافت واجازت حاصل تھی۔

۱۳۷۶ھ میں امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے امیر شریعت منتخب ہوئے۔ آپ کے زمانہ میں امارت نے ترقی کے منازل طے کئے۔ آپ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تا عمر جنرل سکریٹری رہے اور زبردست خدمات انجام دیں آپ کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

۲ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹ مارچ ۱۹۹۱ء کو تراویح پڑھتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد فرمائی، مونگیر میں والد کے بغل میں مدفون ہوئے۔

مصنف کتاب

نام: ——— محمد ظفیر الدین ولد محمد شمس الدین موضع پورہ نوڈیہا ضلع دربھنگہ (بہار)

پیدائش: ——— ۷ مارچ ۱۹۲۶ء

تعلیم ابتدائی: ——— وطن، پھر مدرسہ محمودیہ راجپور (نیپال)

تعلیم ثانوی: ——— فارسی، متوسطات عربی تا شرح وقایہ، مدرسہ وارث العلوم چھپرہ (از ۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۰ء)

تکمیل درسیات: ——— از ھدایہ تا دورہ حدیث، جامعہ مفتاح العلوم جامع شاہی مئوناتھ بھنجن (از ۹ شوال المکرم ۱۳۵۹ھ تا شعبان المعظم ۱۳۶۳ھ)

اساتذہ کرام: ——— امیر الہند، محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ، مجاہد جلیل استاذ العلماء مولانا عبد اللطیف نعمانیؒ، حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب اعظمیؒ، حضرت مولانا شمس الدین صاحب مئویؒ، حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب مدظلہ، امیر شریعت بہار داڑیسہ وغیرہم۔

تدریس: ——— جامعہ مفتاح العلوم مئو، مدرسہ معدن العلوم نگرام ضلع لکھنؤ، دار العلوم معینیہ مونگیر، دار العلوم دیوبند (از ۳ صفر ۱۳۷۶ھ تا ایندم)

تصانیف: ——— نظام مساجد، نظام عفت وعصمت، نظام امن، نظام تربیت، نظام تعمیر سیرت، اسوۂ حسنہ (مناقب سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم)، تذکرہ مولانا عبد اللطیف نعمانیؒ، تذکرہ مولانا عبد الرشید رانی ساگریؒ، دینی جدوجہد کا روشن باب (امارت شرعیہ)، حکیم الاسلام اور ان کی مجالس، مشاہیر علماء دیوبند، دار العلوم کا قیام اور اس کا پس منظر، تعارف مخطوطات حصہ اول ودوم، فتاویٰ دار العلوم دیوبند مدلل ومکمل از جلد اول تا دوازدہم، حیات گیلانیؒ، تاریخ مساجد جلد اول، تاریخی حقائق ودیگر کتب۔